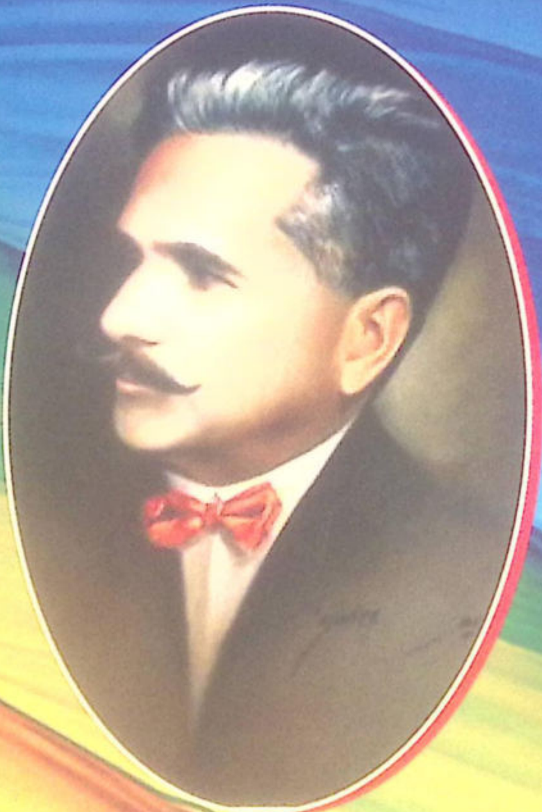
کلامِ اقبال
میں ممتاز شخصیات



پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرّشید تبسّم

کلامِ اقبال میں
ممتاز شخصیات

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم
(ایم فل اقبالیات، پی ایچ ڈی اُردو)

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا ، کوئی دم چہچہایا، اُڑ گیا
(علامہ اقبال)

کلامِ اقبال میں ممتاز شخصیات

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

کتاب : کلامِ اقبال میں ممتاز شخصیات

مؤلف : ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

حروف نگاری : ذوالفقار احسن، طارق طیب

حروف خوانی : اشرف ذکی اعوان (چکوال)

خطاطی و سرورق : پرویز اختر حذیفہ

قانونی مشیر : شیخ اظہر امین ایڈووکیٹ

صفحات : ۴۸۰

قیمت : ۱۲۰۰ روپے

تاریخ اشاعت : ۲۵ دسمبر ۲۰۱۸ء

برائے رابطہ

نظریۂ پاکستان اکادمی سرگودھا

بزمِ فکرِ اقبال سرگودھا

پاکستان ادب اکادمی سرگودھا

Y-319، علامہ اقبال کالونی سرگودھا

فون: 048-3711717، ای میل: drharoonsgd@gmail.com

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد۔

+92-41-2615359- 2643841, Cell:0300-6668284

email: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر صابریہ سینٹر، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب

☆ مومن کی شان یہی ہے کہ راضی برضائے الٰہی رہے۔
☆ اچھا ادب قوموں کی تشکیل کرتا ہے۔
☆ قومی زبان دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔
☆ مسلمانوں میں مغربی فکر رکھنے والا طبقہ پست ذہنیت کا حامل ہے۔
☆ تبدیلی باہر سے نہیں بل کہ من سے شروع ہوتی ہے۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا ، کوئی دم چہچہایا، اُڑ گیا

☆

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل ہوتا ہے کہ چمن میں دیدہ ور پیدا

گوہرنایاب

▫ خلفائے راشدین و صحابہ اکرامؓ

▫ اولیاء اکرام و بزرگان دین

□ **مسلم فاتحین، حکمران، سائنس دان اور مفکرین**

□ مغربی مفکرین، مؤرخین، سائنس دان، فلاسفر اور شاعر

▫ متفرق شخصیات

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء ۱۹۳۸ء) نبض شناس، انسان شناس، علم شناس، جمال و کمالِ حرف شناس کی حیثیت میں فکر و فلسفہ کی وہ ہمہ گیر شخصیت تھے جو آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ وہ لوگ جو قلم کی حرمت و عصمت اور لفظوں کی تقدیس کے خوگر ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے انسان شناسی میں کمال کر دکھایا۔ انھوں نے مریضانِ نیم جاں سے مردانِ حریت تک اور ایک عام انسان سے شہنشاہوں تک کا اپنی شاعری میں احاطہ کر کے اپنی عظمت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ اقبال نے ممکنات کی دنیا میں حقائق اور جہانِ نو کی تلاش جاری رکھی۔

انسان اللہ تعالیٰ کی حسین تخلیق ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کی خدمت پر مامور ہے۔ جہاں انساں کے لیے ہے، انساں جہاں کے لیے نہیں۔

اقبال کہتے ہیں:

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال صرف شاعر ہی نہیں بل کہ عظیم فلسفی تھے۔ انھوں نے خدا، انسان، خودی اور کائنات کے دریچوں سے مقصدِ زیست کو عمیق نظری سے جانچا۔ کائنات کا حرکی نظریہ اقبال کی بصیرت کا غماز ہے۔ انسان اللہ کریم کا نائب، خلیفہ اور نمائندہ ہے۔ اقبال مسلمان کو کائنات کا امام اور خلافت کے لیے درویش تصور کرتے ہیں۔ کلام اقبال میں انسان شناسی کے اشارات جا بجا نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنے کلام میں مشوروں کے بجائے فیصلے صادر کیے ہیں۔ ان کا فلسفۂ حیات بھی انسانوں کے گرد گھومتا ہے۔ یہ بات حیران کُن ہے کہ اقبال نے اپنے وسیع مطالعہ میں جس جس شخصیت کے کارناموں پر نظر دوڑائی اسے شعری سانچے میں ڈھال لیا۔ اردو اور فارسی کلام میں انسانوں کا ایک جہان آباد ہے۔ اقبال کے ہزار ہا خطوط سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خطوط نویسی میں اپنا منفرد زاویہ نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اقبال کے خطوط پر ہر سطح کا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اگر ہم کلیات اردو اور کلیات فارسی کا گہرا مطالعہ کریں تو ان کا کلام ہر نوعیت کے انسانوں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اردو کلام میں شخصی حوالوں پر کچھ احباب نے کام کیا ہے۔ کسی نے انبیاءِ کرام کا انتخاب کیا تو کسی نے اولیاء کرام کے تذکرے کو اپنا موضوع بنا کر ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ احباب نے مغربی مفکرین کو چُنا، کچھ محققین نے مشرقی تخلیق کاروں کو کلام اقبال سے تلاش کر کے اپنے مقالات مکمل کیے۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ کتاب میں زیادہ تر شخصیات کا انتخاب اقبال کے اردو اور فارسی کلیات (ناشر: غلام علی اینڈ سنز لاہور) سے کیا گیا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب ''کلامِ اقبال میں ممتاز شخصیات'' چوں کہ کسی ڈگری یا کسی سند کے لیے نہیں بل کہ اقبال سے گہری عقیدت اور محبت کے جذبے کے تحت لکھی گئی جس میں صرف اور صرف ادب دوستی اور انسان پروری شامل ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''کلامِ اقبال میں ممتاز شخصیات'' اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اقبال نے فارسی اور اردو میں جن شخصیات پر قلم اٹھایا ان کے حالات سند کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ اقبال نے کمالِ فن سے ہر اس شخص کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جس سے وہ متاثر ہوئے یا پھر ان کی تحریروں کو اپنے شعور کے آئینوں پر محفوظ کیا۔

عالمِ حیات میں انسان اپنے کارناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ کچھ شخصیات انسانوں کے لیے

قابلِ تقلید ہوتی ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسرے انسانوں کے لیے عبرت کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اقبال نے ہر نوعیت کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔ عظمتِ رفتہ کے آئینے میں آگے بڑھنے کا نام تبدیلی ہے۔ انقلاب دانش وروں کے اذہان میں جنم لیتے ہیں۔ اقوام کی تقدیر افراد بدلتے ہیں۔ افراد سے ہی قومیں تشکیل پاتی ہیں۔ اقبال نے زندگی کا جو فلسفہ پیش کیا ہے اس میں زندگی کو منزل نہیں بل کہ سفر قرار دیا ہے۔ اس سفر میں انسان کی حیثیت ایک مسافر کی ہے۔ مسافر اپنی تمام تر کامیابیاں اور ناکامیاں خود محسوس کر سکتا ہے۔ اقبال نے جن شخصیات کی خوبیاں یا خامیاں بیان کی ہیں وہ آنے والے کل کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ فکرِ فردا ہی انسانی کامیابی کا راز ہے۔

اقبال نے شخصیت شناسی میں بڑا منصفانہ انداز اپنایا۔ شخصیت نویسی میں انھوں نے تحسین، تنقید، تنقیص اور تعریض سے کام لیا ہے۔ کچھ رول ماڈل ممتاز شخصیات کو آئینے کی صورت پیش کر کے نسلِ نو کو اپنا نصب العین متعین کرنے کی دعوت دی ہے۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

عظیم لوگ دوسروں کے لیے قابل مثال ہوتے ہیں۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں کے مصداق درویش انسانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ اقبال نے شخصیات کا خزینہ تشکیل دے کر روشن مستقبل کی راہ دکھائی ہے۔ بعض شخصیات اپنی ذات میں بڑے بڑے مقالات کی متقاضی ہیں۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے اقبال کے زیرِ قلم شخصیات کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب و تدوین اور مواد کی فراہمی میں عزیزم ذوالفقار احسن کا تذکرہ از بس ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی طوفانی مصروفیات سے وقت نکال کر محنت شاقہ سے اس کتاب کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کیا۔ ممتاز شاعر و ادیب، خادم اردو جناب اشرف ذکی اعوان (چکوال) کی شفقت، محبت، مروت اور خلوص ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ انھوں نے کتاب کی حروف خوانی میں کمال عرق ریزی کا مظاہرہ کر کے وسعتِ نظری اور وسعت مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ اشرف ذکی اعوان کا سراپا سپاس گزار ہوں کہ جنھوں نے ادب پروری کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔

یہ کتاب اقبالیاتی طالب علموں کے لیے رہنمائی کا منبع ثابت ہوگی۔ اقبالیاتی محققین کو تعلیقات وحواشی بنانے اور دیگر ضروریاتِ تحقیق میں یہ کتاب سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرے گی۔

لفظوں کو حسن سوچ کو رعنائی دے گیا
اقبال میری قوم کو بینائی دے گیا (تبسم)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
۳۱۹۔وائی، علامہ اقبال کالونی سرگودھا
۰۴۸۔۳۷۱۱۷۱۷
drharoonsgd@gmail.com

۲۵ دسمبر ۲۰۱۸ء

امام الانبیاء

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) مفکّر اسلام، اقلیمِ فہم وفراست، محسنِ علم وادب، مصوّرِ پاکستان، ترجمان حقیقت، مبلغ اسلام، حکیم الامت اور نباضِ عظمت انسانی تھے۔ ان کی خوش بختی کہ انھیں بچپن سے ہی ایک پاکیزہ ماحول میسر آیا۔ اسلامی ذہن رکھنے والے والدِ گرامی شیخ نور محمد، پاک باز، پاک سیرت والدہ حافظہ امام بی بی اور سید میر حسن ایسے نابغہ روزگار اساتذہ کی تربیت میسر آئی۔ قرآن پاک کی مسلسل تلاوت نے ان کا سینہ نور سے بھر دیا۔ رب العالمین اور رحمت اللعالمین سے گہرے لگاؤ کی وجہ سے ان کا قلم معرفت میں ڈوبا رہا۔ عشقِ رسول ﷺ کی حرارت نے ان کی زندگی کو کندن بنا دیا۔ علامہ اقبال کے دیرینہ خادم حاجی علی بخش نے متعدد مصاحبوں میں بتایا ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اقبال بسا اوقات پرنم ہو جاتے۔ حُسنِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر سنتے ہی وہ اشک بار ہو جاتے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ آنسوؤں کی جھڑی سے قرآن پاک کے اوراق بھیگ جاتے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فلسفہ خودی کا مرکزی نکتہ درحقیقت عشق رسول ﷺ ہے کیوں کہ عشق رسول ﷺ ہی انسان کو عظمت انسانی کا راستہ دکھاتا ہے۔ زمان و مکاں عشقِ رسول ﷺ کے حضور سجدہ ریز رہتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی شاعری میں مردِ مومن، مردِ کامل، مردِ حُرحتیٰ کہ شاہین کا تصور بھی آنحضرت ﷺ سے وابستہ ہے۔ ایک مسلمان کے ایمان کی تکمیل حُبِ رسول ﷺ میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں عشقِ رسول ﷺ ہر جگہ نمایاں ہے۔

حاملِ قرآن، باطنِ قرآن، ناطقِ قرآن، مفسّرِ قرآن، حبیبِ الرحمٰن، سید الطیبین، خطیب النبیین، امام المتقین، امام العالمین، رحمت للعالمین، محبوب رب العالمین، اول المسلمین، سید المرسلین، خاتم النبین، نور المبین، مظہر اولین، صحت آفرین، اکرم الاکرامین، مرا المشتاقین، شمس العارفین، سید العارفین، سراج السالکین، مصباح المقربین، محبّ الفقراء والغربا والمساکین، وارث عالم اولین و آخرین، مورث کمالات آفرین، صداق وامین، مفکرِ قرآن مبین، روشن جبین، سلطان دین، سید الثقلین، نبی الحرمین، صاحب قاب قوسین، سید الکرنین، سرور کونین، نور رب العالمین، حبیب رب المشرقین والمغربین، خاتم المرسلین، گنج نور مبیں، آبروئے زمیں، اولادآدم فتح مبیں، مورث کمالات اولین و آخریں، محمد عربی ﷺ کی ذات سے محبّت کے بغیر ہماری نجات ناممکن ہے۔ڈاکٹر علامہ اقبال کی شاعری میں آنحضرت ﷺ کا وجود الکتاب ہے جو ہمارے ایمان وایقان کا حصہ ہے۔لوح وقلم آپ ﷺ کی دسترس میں ہیں۔اسرار جہاں، فخر جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعریف و توصیف انسان کے بس میں نہیں ہے۔آپ ﷺ سے اپنی عقیدت کے اظہار میں ڈاکٹر علامہ اقبال فارسی اوراردو کلام میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت (کلیات فارسی،ص۱۳)

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے یا زنام مصطفیٰ است (کلیات فارسی،ص۱۹)

تانباشی پیش پیغمبرؐ خجل
روز فرد اے کہ باشد جاں گسل (کلیات فارسی،ص۲۴)

شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو (کلیات فارسی،ص۴۱)

ازرُخ اوفال پیغمبرؐ گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت (کلیات فارسی،ص۴۷)

برطریقِ مصطفیٰ محکم پے
نغمۂ عشق و محبّت رانے (کلیات فارسی،ص۶۳)

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبو الدھر فرمان نبی است (کلیات فارسی،ص۷۲)

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش (کلیات فارسی،ص۸۱)

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر (کلیات فارسی،ص۸۶)

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر (کلیات فارسی،ص۹۵)

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است (کلیات فارسی،ص۹۶)

پایۂ اسلامیاں بر ترازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو (کلیات فارسی،ص۹۸)

قوتِ قلب و جگر گر د و نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ (کلیاتِ فارسی،ص۱۰۱)

لا نبی بعدی زا حسان خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است (کلیاتِ فارسی،ص۱۰۲)

درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدؐ یہ تشکیل و
تاسیس حریت ومساوات واخوت بنی نوع آدم است

(کلیات فارسی،ص۱۰۳)

امتے از گرمیٔ حق سینہ تاب
ذرہ اش شمعِ حریمِ آفتاب (کلیات فارسی، ص۱۰۴)

خونِ او اے معشرِ خیر الانامؐ
بردمِ تیغِ مسلماناں حرام (کلیات فارسی، ص۱۰۶)

گفت اے پیغامِ حق گفتار تو
حفظِ آئین محمدؐ کار تو (کلیات فارسی، ص۱۰۷)

گفت از بہرِ خدا بخشید مش
از برائے مصطفیٰ بخشید مش (کلیات فارسی، ص۱۰۸)

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبرؐ نگر (کلیات فارسی، ص۱۰۸)

خاست آں سرجلوۂ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم (کلیات فارسی، ص۱۱۰)

بہرآں شہزادہ خیر الملل
دوش ختم المرسلیں نعم الجمل (کلیات فارسی، ص۱۱۰)

در معنی ایں کہ چوں ملت محمد یہ موس برتوحیدو
رسالت است پس نہایت مکانی ندارد

(کلیات فارسی، ص۱۱۲)

پیشِ پیغمبرؐ چو کعبِ پاک زاد
ہدیۂ آورد از بانت سعاد (کلیات فارسی، ص۱۱۲)

در معنی ایں کہ ملت محمد یہ نہایت زمانی ہم ندارد
کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است

(کلیات فارسی، ص۱۱۷)

در معنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت
نہ بندد و آئین ملت محمدیہؐ قران است

(کلیات فارسی، ص۱۲۱)

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس
باطنِ دینِ نبی این است و بس (کلیات فارسی، ص۱۲۱)

نوعِ انساں را پیام آخریں
حاملِ او رحمتہ للعالمین (کلیات فارسی، ص۱۲۲)

فکر شاں زیسد ہے باریک تر
ورع شاں با مصطفیؐ نزدیک تر (کلیات فارسی، ص۱۲۵)

ہست دینِ مصطفیؐ دینِ حیات
شرع او تفسیرِ آئینِ حیات (کلیات فارسی، ص۱۲۸)

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت (کلیات فارسی، ص۱۲۹)

اند کے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماع امت خیر البشرؐ (کلیات فارسی، ص۱۳۱)

غنچۂ از شاخسار مصطفیؐ
گل شواز باد بہار مصطفیؐ (کلیات فارسی، ص۱۳۱)

مگسل از ختم الرسلؐ ایامِ خویش
تکیہ کم کن برفن و برگامِ خویش (کلیات فارسی، ص۱۳۲)

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است
آب و تابش از یم پیغمبرؐ است (کلیات فارسی، ص۱۳۲)

در معنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین
ملیہ است ونصب العین امت محمدیہ حفظ ونشر توحید است

(کلیات فارسی،ص۱۳۷)

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است
سیرتِ اقوام را صورتگر است (کلیات فارسی،ص۱۴۹)

نور چشمِ رحمۃ للعالمین
آں امامِ اولین و آخریں (کلیات فارسی،ص۱۵۲)

آں یکے شمع شبستانِ حرم
حافظ جمعیتِ خیرالاممؐ (کلیات فارسی،ص۱۵۲)

رشتہ آئین حق زنجیر پا ست
پاس فرمانِ جنابِ مصطفیٰ است (کلیات فارسی،ص۱۵۳)

گفت مالک مصطفیٰ را چا کرم
نیست جز سودائے او اندر سرم (کلیات فارسی،ص۱۵۹)

از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو (کلیات فارسی،ص۱۶۱)

حیف او محروم دربارِ نبیؐ
چشم من روشن ز دیدار نبیؐ (کلیات فارسی،ص۱۶۳)

لعشش از پیش طبیباں بردہ ام
در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام (کلیات فارسی،ص۱۶۷)

سوزِ صدیق و علی از حق طلب
ذرہٗ عشق نبیؐ از حق طلب (کلیات فارسی،ص۱۹۰)

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست (کلیات فارسی، ص۱۹۰)

تب و تاب بتکدہ عجم نرسد بسوز و گداز من
کہ بیک نگاہِ محمدؐ عربی گرفت حجازِ من (کلیات فارسی، ص۳۴۴)

با خدا در پردہ گریم باتو گویم آشکار
یارسول اللہ! او پنہان وتو پیدا اے من (کلیات فارسی، ص۳۵۳)

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیغمبر ہم رہ جدا و رفتے (کلیات فارسی، ص۳۹۲)

در کلیسا ابنِ مریم را بدار آویختند
مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کردہ باام الکتاب (کلیات فارسی، ص۴۸۷)

گفتمش موجود و ناموجود چسیت
معنی محمود و نا محمود چسیت؟ (کلیات فارسی، ص۶۰۷)

مردِ مومن در نشاز د باصفات
مصطفیٰؐ راضی نشد الابذات (کلیات فارسی، ص۶۰۷)

سینہ ما از محمدؐ داغ داغ
از دم او کعبہ را گل شد چراغ (کلیات فارسی، ص۶۴۲)

باز گو اے سنگِ اسود باز گوے
آنچہ دیدیم از محمدؐ باز گوے (کلیات فارسی، ص۶۴۳)

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود
گفت نقشِ کہنہ را باید زدود (کلیات فارسی، ص۶۵۴)

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس راندید (کلیات فارسی،ص ۶۵۷)

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن (کلیات فارسی،ص ۶۵۸)

بے نصیب از حکمت دین نبیؐ
آسمانش تیرہ از بے کو کبی (کلیات فارسی،ص ۶۶۴)

از حدیثِ مصطفیٰ داری نصیب
دینِ حق اندر جہاں آمد غریب (کلیات فارسی،ص ۶۶۵)

در دلِ او آتش سو زندہ نیست
مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست (کلیات فارسی،ص ۶۶۶)

از چراغِ مصطفیٰ اندیشہ چیست
زانکہ او راپف زند صد بولہب (کلیات فارسی،ص ۶۷۹)

از بلا ترسی ؟ حدیثِ مصطفیٰ است
مردرا روزِ بلا روزِ صفا ست (کلیات فارسی،ص ۶۸۶)

گفت بود امدر زمانِ مصطفیٰ
مردے از مریخیانِ باصفا (کلیات فارسی،ص ۶۹۱)

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمتہ اللعالمینے ہم بود (کلیات فارسی،ص ۷۱۴)

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمتہ للعالمینی انتہاست (کلیات فارسی،ص ۷۱۵)

یاز نورِ مصطفیٰ اور ابہاست
یاہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است (کلیات فارسی، ص ۷۱۶)

معنیٔ دیدارِ آں آخر زماںؐ
حکمِ او بر خویشتن کردن رواں (کلیات فارسی، ص ۷۱۸)

تاب و تب در سینہ افزاید مرا
یاد عہدِ مصطفیٰ آید مرا (کلیات فارسی، ص ۷۹۳)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ
او محمدؐ ، او کتاب و او جبرئیل (کلیات فارسی، ص ۷۹۵)

سرِ دین مصطفیٰ گریم ترا
ہم بقبر اندر دعا گریم ترا (کلیات فارسی، ص ۷۹۶)

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است (کلیات فارسی، ص ۸۱۶)

مومناں را گفت آں سلطانِ دیںؐ
مجد من ایں ہمہ روئے زمیں (کلیات فارسی، ص ۸۱۷)

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند (کلیات فارسی، ص ۸۱۹)

عصرِ ما مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد (کلیات فارسی، ص ۸۲۰)

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
او زدستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش (کلیات فارسی، ص ۸۲۲)

مال را گر بہردیں باشی جمول
نعیم مال صالح گوید رسولؐ (کلیات فارسی، ص۸۲۵)

حکمش از عدل است وتسلیم ورضاست
بیخ او اندر ضمیر مصطفیٰؐ است (کلیات فارسی، ص۸۲۷)

تابد اری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نام او (کلیات فارسی، ص۸۳۳)

حمد بیحد مر رسول پاکؐ را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را (کلیات فارسی، ص۸۳۶)

آنچہ تو با خویش کر دی کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفیٰ آمد بدرد (کلیات فارسی، ص۸۳۷)

در عجم گردیدم وہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب (کلیات فارسی، ص۸۴۵)

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ ست
ایں تجلّی ہائے ذاتِ مصطفیٰؐ ست (کلیات فارسی، ص۸۵۱)

رمز دینِ مصطفیٰ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی است (کلیات فارسی، ص۸۵۴)

می ندانی عشق و مستی از کجا ست
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ ست (کلیات فارسی، ص۸۶۴)

مصطفیٰؐ بحر است و موج او بلند
خیز و ایں دریا بجوئے خویش بند (کلیات فارسی، ص۸۶۵)

مکن رسوا حضورِ خواجۂ مارا
حسابِ من ز چشمِ اونہاں گیر (کلیات فارسی،ص۹۰۰)

دو حرفے بر مراد دل بگوئیم
بپائے خواجۂ چشماں را بمالیم (کلیات فارسی،ص۹۱۱)

دلش نالد چرانالد نداند
نگاہے یا رسولؐ اللہ نگاہے (کلیات فارسی،ص۹۱۲)

من اے میرامم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند (کلیات فارسی،ص۹۲۵)

خرابِ جرأتِ آں رند پاکم
خدا را گفت مارا مصطفیٰ بس (کلیات فارسی،ص۹۴۱)

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بندو راہ مصطفیٰ رو (کلیات فارسی،ص۹۴۷)

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو زمیدو راہ مصطفیٰ گیر (کلیات فارسی،ص۹۴۹)

ولے تاویل شاں درحیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را (کلیات فارسی،ص۹۵۶)

عرب خودرا بہ نور مصطفیٰ سوخت
چراغ مردہ مشرق برا فروخت (کلیات فارسی،ص۹۷۱)

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے (کلیات اردو،ص۸۷)

سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار
نظم عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار (کلیات اردو، ص ۱۴۵)

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا (کلیات اردو، ص ۱۴۶)

تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی (کلیات اردو، ص ۱۴۶)

سالارِ کاروان ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا (کلیات اردو، ص ۱۵۹)

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ﷺ ہے (کلیات اردو، ص ۱۶۰)

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟ (کلیات اردو، ص ۱۶۳)

عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
امتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی (کلیات اردو، ص ۱۶۸)

نظم...... حضور رسالت مآب ﷺ میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز
ہمیشہ سر خوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجود و نیاز
اڑا جو پستیٔ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(کلیات اردو، ص ۸۷)

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو (کلیات اردو۔ص ۲۰۱)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟ (کلیات اردو۔ص ۲۰۱)

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک (کلیات اردو۔ص ۲۰۲)

کون ہے تارک آئین رسولؐ مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۲)

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۲)

اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۵)

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت ہے تیری (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۶)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۷)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (کلیاتِ اردو۔ص۲۰۸)

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحب یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں (کلیاتِ اردو۔ص۲۲۱)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (کلیاتِ اردو۔ص۲۲۳)

اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار (کلیاتِ اردو۔ص۲۲۴)

لائے غرض کہ مالِ رسول امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار (کلیاتِ اردو۔ص۲۲۴)

پوچھا حضور سرور عالم نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوش حق سے ترے دل کو ہے قرار (کلیات اردو۔ ص ۲۲۴)

بولے حضورؐ چاہیے فکر عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبّت کا راز دار (کلیات اردو۔ ص ۲۲۴)

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس! (کلیات اردو۔ ص ۲۲۵)

یہ ذکر حضورِ شہ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز (کلیاتِ اردو۔ ص ۲۴۵)

پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام! (کلیات اردو۔ ص ۲۴۷)

جاتا ہوں میں حضورِ رسالتؐ پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام (کلیات اردو۔ ص ۲۴۷)

بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبّت میں ہے حرام (کلیات اردو۔ ص ۲۴۷)

پہنچے جو بارگاہ رسول امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام (کلیات اردو۔ ص ۲۴۷)

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے (کلیات اردو۔ ص ۲۴۷)

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمیؐ (کلیاتِ اردو۔ص۲۴۸)

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ
خاک وخوں میں مِل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش (کلیاتِ اردو۔ص۲۵۷)

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدروحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد (کلیاتِ اردو۔ص۲۷۵)

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی (کلیاتِ اردو۔ص۲۷۷)

محمد بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا؟ (کلیاتِ اردو۔ص۲۹۸)

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ (کلیاتِ اردو۔ص۳۱۷)

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں! (کلیاتِ اردو۔ص۳۱۹)

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری! (کلیاتِ اردو۔ص۳۳۰)

ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہ لولاکؐ ہے تُو (کلیاتِ اردو۔ص۳۷۶)

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام (کلیات اردو۔ص ۳۸۶)

کاروبارِ خسروی یا راہبی
کیا ہے آخر غایتِ دین نبی؟ (کلیات اردو۔ص ۴۳۱)

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمدؐ و براہیم! (کلیات اردو۔ص ۴۸۰)

دل درِ سخن محمدیﷺ بند
اے پورِ علیؓ زبو علی چند (کلیات اردو۔ص ۴۸۱)

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے! (کلیات اردو۔ص ۵۱۰)

اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام (کلیات اردو۔ص ۵۲۴)

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفویٰ افتراقِ بولہبی (کلیات اردو۔ص ۵۲۵)

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی (کلیات اردو۔ص ۵۲۶)

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ! (کلیات اردو۔ص ۶۰۷)

وہ فاقہ کش کی موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو! (کلیات اردو۔ص ۶۰۸)

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں (کلیات اردو۔ص ۶۵۴)

الحذر آئینِ پیغمبر سے سوبار الحذر
حافظِ ناموسِ زن مرد آزما، مرد آفریں (کلیات اردو۔ص ۶۵۵)

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است (کلیات اردو۔ص ۶۹۱)

○○○

انبیاء علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام

پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں قرآن مجید میں تمام انبیاء کرام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ انہی کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ قرآن پاک میں سورہ بقرہ، سورہ اعراف، سورہ اسراء، سورہ کہف اور طٰہٰ میں نام اور اوصاف دونوں کے ساتھ اور سورہ حجر وص میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور سورہ آل عمران و مائدہ، سورہ مریم اور سورہ یٰسین میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے اس کے علاوہ آپ کے نام کا ذکر قرآن پاک کی ۳۵ سورتوں میں موجود ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا۔ آدم کا خمیر تیار ہونے سے قبل فرشتوں کو اطلاع دی کہ بہت جلد مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو بشر کہلائے گی وہ زمین پر ہماری خلافت کا اعزاز حاصل کرے گی۔ تمام ملائکہ نے کہا کہ ہم زیادہ عبادت گزار ہیں پھر آدم کی تخلیق کس لیے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ حضرت آدمؑ کا خمیر نت نئی تبدیلی قبول کر لینے کی صلاحیت رکھنے والی مٹی سے گوندھا گیا جب یہ مٹی ٹھیکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کے جسم میں اپنی روح پھونکی اور وہ ایک دم گوشت پوست، ہڈی پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور وہ شعور حسن و عقل او روجدانی جذبات و کیفیات کا حامل دکھائی دینے لگا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے غرور و تکبّر کی وجہ سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کا حال بھی جانتا ہے تاہم انھوں نے ابلیس سے پوچھا کہ کس بات نے تجھے جھکنے سے منع کیا؟ تو

ابلیس نے جواب دیا کہ میں حضرت آدمؑ سے بہتر ہوں اس لیے کہ مجھے آگ سے تخلیق کیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو طین یعنی سیاہ مٹی سے۔قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کر کے اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت ''علم'' سے نوازا۔آدمؑ کو علم اسماء عطا فرمایا۔پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے دریافت کیا۔تم ان اشیاء کے متعلق علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم رہے۔آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام سکھائے گئے وہ اسرا کے بھید کا راز دان ہے یعنی دنیوی اور روحانی علوم سے آشنا ہے۔کتب تفاسیر کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ایک مدت تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے تاہم وہ اپنی زندگی اور آرام وسکون میں ایک وحشت اور خلاف کو محسوس کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر اونگھ ڈال کر حضرت حوا کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔وہ اپنے ساتھی قریب پا کر فرحت محسوس کرنے لگے۔جنت میں ہر چیز کے استعمال کی اجازت تھی صرف ایک درخت کے پاس جانے سے روک دیا گیا کہ اس کا پھل نہ کھائیں بلکہ اس کے قریب بھی نہ جائیں ابلیس نے موقع پا کر حضرت آدم وحوا کے دل میں بات ڈال دی کہ اس درخت کا پھل ہی تو کھانے والا ہے لہٰذا شیطان کی باتوں میں آ کر دونوں نے پھل یا دانہ کھایا تو بشری لوازمات ظاہر ہونا شروع ہو گئے ان کے جنتی لباس اتر گئے اپنے آپ کو بے لباس دیکھ کر درختوں کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے۔اللہ تعالیٰ نے حکم عدولی کی وجہ دریافت کی تو دونوں نے معافی کی درخواست کر دی جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرمایا لیکن انہیں جنت سے نکلنے اور دنیا میں رہنے کا حکم برقرار رکھا۔حضرت آدمؑ کو ہندوستان میں سراندیپ کے پہاڑ پر اتارا گیا جب کہ حضرت حوا کو جدہ میں زمین پر اتار دیا گیا۔انھیں بتایا گیا کہ تمہارا ازلی دشمن شیطان بھی زمین پر ہے جو نیک بندوں کو ہرگز نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

ابلیس کا چیلنج قبول کر لینے سے حیات انسانی میں ایک نئے توازن نے جنم لیا اور اس کی تخلیقی قوتیں بیدار ہونا شروع ہوئیں۔وہ اشیاء کے حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق فطرت میں متصور بھی کر سکتا ہے اس کی وجہ سے اس نے آگ، پانی اور ہوا کو تسخیر کر اپنے قابو میں کر لیا پہاڑوں کے سینے شق کیے۔ویرانوں کو آباد کیا اور اپنے وجود کا سکہ کائنات کے ہر گوشے اور ہر قریہ میں بٹھایا۔انبیاء کرام وہ ہستیاں ہیں جو اللہ کے ساتھ روحانی تعلق میں سب سے افضل ہیں۔حضرت علامہ اقبال نے انسانِ اول، نبی اول حضرت آدمؑ کے سوز وگداز کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ انسان شروع ہی سے اللہ سے مضبوط تعلق کا خواہش مند رہا ہے۔اس لیے مسلمانوں کو بھی اللہ

سے اپنے تعلق کو مضبوط بنانا چاہیے۔اقبال کی یہ بھی خواہش ہے کہ اولادِ آدم بھی اپنے جدِامجد کی طرح مستحکم خودی کی حامل بن جائے۔

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم
عالم کیف و کم عالم شدم (کلیات فارسی،ص۱۰)

تر جبیں از خجلت سائل نشد
شکل آدم ماند و مشتِ گل نشد (کلیات فارسی،ص۲۴)

گوسفندے در لباسِ آدم است
حکم او بر جان صوفی محکم است (کلیات فارسی،ص۳۳)

ماہی داز سینہ تا سر آدم است
چوں بناتِ آشیاں اندریم است (کلیات فارسی،ص۳۶)

از گل خود آدمے تعمیر کن
آدمے را عالمے تعمیر کن (کلیات فارسی،ص۴۹)

علامہ اقبال کے فارسی کلیات میں چوں کہ لاتعداد مرتبہ حضرت آدم کا ذکر آیا ہے تمام اشعار نہیں دیئے جا رہے بل کہ بقیہ اشعار کے صفحات کے نمبر درج ہیں تا کہ اشعار ڈھونڈنے میں رہنمائی مل سکے۔

۵۴،۱۰۳،۱۰۴،۱۱۵،۱۱۶،۱۳۱،۱۴۰،۱۴۱،۱۴۴،۱۶۶،۱۸۲،۱۸۹،۱۹۸،۲۰۰،۲۱۰،۲۱۹،۲۲۵،۲۲۶،
۲۳۲،۲۳۴،۲۴۸،۲۵۵،۲۵۶،۲۵۷،۲۵۸،۲۸۵،۳۰۴،۳۰۹،۳۱۷،۳۳۲،۳۵۹،۳۶۰،۳۶۶
،۳۶۹،۳۷۴،۳۷۷،۳۷۹،۳۸۵،۴۱۶،۴۳۴،۴۴۸،۴۵۱،۴۵۵،۴۶۶،۴۸۰،۴۹۷،۵۰۰،
۵۰۴،۵۰۵،۵۰۸،۵۱۸،۵۲۷،۵۲۹،۵۳۹،۵۴۰،۵۴۱،۵۵۴،۵۷۱،۵۷۲،۵۷۶،۵۷۹،
۵۸۰،۵۸۷،۵۹۵،۵۹۶،۶۰۱،۶۰۳،۶۰۴،۶۱۱،۶۲۲،۶۳۲،۶۲۳،۶۵۱،۶۵۳،۶۵۶،۶۵۷،
۶۶۰،۶۶۸،۶۷۸،۶۷۹،۶۹۱،۶۹۲،۶۹۷،۷۱۶،۷۲۰،۷۲۱،۷۲۴،۷۲۵،۷۲۶،۷۳۰،۷۳۲،
۷۴۱،۷۴۸،۷۵۶،۷۶۹،۷۷۵،۷۷۷،۷۸۰،۷۹۲،۷۹۳،۸۰۹،۸۲۳،۸۲۶،۸۳۵،۸۳۹،

۸۴۱،۸۴۲،۸۵۶،۸۶۵،۸۶۹،۸۹۱،۹۳۵،۹۷۲،۹۷۷،۹۸۷،۱۰۰۰،۱۰۱۴۔

فارسی کلام کے علاوہ حضرت علامہ محمد اقبال نے اردو کلام میں بھی حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

طلسمِ بُود و عدم، جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے ، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کُہن!
اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انسان نہ رُوح ہے نہ بدن!

کلیاتِ اقبال،غلام علی اینڈ سنز،ضربِ کلیم:۵۱۹

مکّہ اور جنیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم!
تفریقِ مِلل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

کلیاتِ اقبال،غلام علی اینڈ سنز،ضربِ کلیم:۵۲۰

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری
فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری

کلیاتِ اقبال،غلام علی اینڈ سنز،ضربِ کلیم:۶۳۲

اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، بال جبریل: ۴۳۷

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ضرب کلیم: ۴۸۰

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اِس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، بال جبریل: ۳۶۳

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے!

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ضربِ کلیم: ۵۵۵

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اِسی مقام سے آدم ہے ظِلّ سُبحانی!

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ضربِ کلیم: ۴۹۴

اُسی طلسمِ کُہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بُتانِ عہدِ عتیق

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، بالِ جبریل: ۳۲۷

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ضربِ کلیم: ۴۹۹

اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بَیر
آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دُور و دیر و زُود

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ضربِ کلیم: ۵۰۷

ذرا نظارہ ہی اے بو الہوس! مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، بانگِ درا: ۷۳

تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، ارمغانِ حجاز: ۶۵۲

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک، یہ وہی آدم ہے؟

کلیاتِ اقبال، غلام علی اینڈ سنز، بانگِ درا: ۱۹۹

ہم نے خود شناسی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر (ارمغانِ حجاز: ۷۰۴)

تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں (بانگِ درا: ۲۸۸)

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود (ضربِ کلیم: ۶۳۶)

عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات
خوار ہُوا کس قدر آدمِ یزداں صفات (ارمغانِ حجاز: ۷۲۰)

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک (بانگِ درا: ۲۹۳)

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟ (بالِ جبریل: ۳۴۶)

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ، ضمیرِ کُنِ فکاں ہے زندگی (بانگِ درا:۲۸۷)

سرِّ آدم سے مجھے آگاہ کر
خاک کے ذرّے کو مہر و ماہ کر! (بالِ جبریل:۴۶۵)

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبُود (بالِ جبریل:۴۲۲)

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹُوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے (بالِ جبریل:۳۵۰)

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے ، یہ نیلگوں افلاک (بالِ جبریل:۳۹۴)

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایتِ آدم خبر ہے یا نظر؟ (بالِ جبریل:۴۶۵)

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قِصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو! (بالِ جبریل:۴۷۴)

دل بیدار فاروقی ، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری (بالِ جبریل:۳۷۱)

میری ہستی پیرہن عُریانیِ عالم کی ہے
میرے مِٹ جانے سے رُسوائی بنی آدم کی ہے (بانگِ درا:۲۲۴)

وہ کون سا آدم ہے کہ تُو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟ (بالِ جبریل:۴۳۴)

پردۂ تہذیب میں غارت گری ، آدم کشی
کل رَوا رکھی تھی تم نے ، میں روا رکھتا ہوں آج! (ضربِ کلیم:۶۶۲)

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے
پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک! (بالِ جبریل:۴۹۲)

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں رُوح کو خوابیدہ ، بدن کو بیدار (ضربِ کلیم:۶۴۰)

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اِکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ رُوحِ آدم سے (بانگِ درا:۱۳۷)

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟ (بالِ جبریل:۳۵۶)

موت ہے عیشِ جاوداں ، ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے (بانگِ درا:۱۴۰)

اپنے حُسنِ عالم آرا سے جو تُو محرم نہیں
ہمسر یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں (بانگِ درا:۸۱)

اَزل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر (بالِ جبریل:۴۵۶)

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی ، تارے بھی تماشائی (بالِ جبریل:۴۴۹)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے ، وہ آئینہ سازی (بالِ جبریل:۴۷۶)

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ! (بالِ جبریل:۴۴۳)

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عُریانی (ارمغان حجاز:۷۵۵)

یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اُٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی (بانگِ درا:۱۰۲)

یہی آدم ہے سُلطاں بحر و بَر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا (بالِ جبریل:۴۱۳)

یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی (ارمغانِ حجاز:۷۵۵)

ooo

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے ان کو کئی حوالوں سے فضیلت حاصل ہے کیونکہ وہ پیغمبر کے بیٹے، پیغمبر کے پوتے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پر پوتے ہیں۔ قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا چھبیس مقامات پر ذکر ملتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ یوسف علیہ السلام، سورۃ الانعام اور سورۃ المومنون میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نہایت خوبصورت تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں سے حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کے دیگر بھائیوں نے حسد کی آگ میں جل کر یوسف علیہ السلام کو مارنے کی سازشیں سوجھنے لگیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج، چاند ان کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سنا تو انھیں مزید کسی کو بتانے سے روک دیا۔ تاہم ان کے بھائیوں کو پتہ چل گیا۔ وہ انھیں ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ جب یہ تجویز منظور ہوئی تو تمام بھائی مل کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے اور کہا کہ ہم شکار پر جانا چاہتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ڈر تھا کہ کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ جب بھائیوں نے ہر طرح کی یقین دہانی دلائی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے جانے کی اجازت دی دے۔ برادران یوسف علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور غیر آباد کنوئیں میں پھینک دیا۔ کنوئیں میں پھینکتے وقت قمیض اتار لی۔ قمیض پر کسی جانور کا خون لگا کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے اور کہا کہ انہیں بھیڑیا اٹھا کر لے گیا ہے۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں

میں محفوظ رکھا ایک روایت میں ہے کہ ان کا بھائی یہودا تمام بھائیوں سے چھپ کر ڈول کے ذریعے کھانا حضرت یوسف علیہ السلام کو پہنچاتا رہا۔ ایک قافلہ ادھر سے گزرا جنھوں نے پانی کی غرض سے ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام ڈول کے ذریعے باہر آ گئے۔ سردار تاجر نے خوشی اور حیرت سے یوسف علیہ السلام کی طرف دیکھا اور سوچا کہ وہ انہیں مصر کے بازار میں فروخت کریں گے تو کافی دولت ہاتھ آئے گی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے بازار میں غلاموں کی طرح فروخت کرنے لگے تو عزیز مصر فوطیفار نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دس مثقال سونے اور بہت سے دیباو حریر اور دوسرے قیمتی کپڑوں کے عوض ایک تاجر سے خرید لیا۔ عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا جب جوان ہوئے تو عزیز مصر کی بیوی زلیخا جمال اور رعنائی کے پیکر مجسّم حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر دیوانہ وار فدا ہونے لگی اور انھیں فحش و ناپاکی میں مبتلا ہونے پر ابھارتی رہی۔ ہر کوشش میں ناکامی کے بعد اس عورت نے ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے غلط فعل کے لیے اصرار کرنے لگی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی کرنا اور عزیز مصر کی امانت میں خیانت کرنا ناممکن ہے مگر عزیز مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ زبردستی کرنے لگی تو حضرت یوسف علیہ السلام باہر کی طرف بھاگے۔ دروازہ کسی طرح کھل گیا اور عزیز مصر سامنے کھڑے تھے انھوں نے سارا ماجرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کی بیوی نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر سنائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والے تھے۔ عزیز مصر نے جب قاضی سے اس کا فیصلہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو زلیخا جھوٹی ہے اور اگر کُرتا آگے سے پھٹا ہے تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام جھوٹے ہوں گے۔ جب دیکھا گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ زلیخا جھوٹی نکلی۔ عزیز مصر نے رسوائی سے بچنے کے لیے اس قصہ کو یہیں دفن کر دیا لیکن یہ بات کسی نہ کسی طرح لوگوں میں پھیل گئی۔

قرآن مجید کی سورہ یوسف میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب زنانِ مصر نے زلیخا کو طعنہ دیا کہ وہ ایک غلام کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں تھا تو اس نے زنان مصر کو بلا کر ان کے ہاتھ میں پھل اور چھریاں دے دیں۔ عین اس وقت جب وہ پھل کاٹ رہی تھیں۔ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر آ گئیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن کو دیکھ کر عورتیں مبہوت رہ گئیں اور انھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ زلیخا ایک بار پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف مائل ہوئی انھیں بدکاری کے

لیے اکسایا اور کہا اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ عزیزِ مصر نے تمام نشانیوں کے باوجود اپنی بیوی کو بچانے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی پتلی گائیں دبلی گائیں موٹی کو نگل گئی ہیں اور سات سرسبز بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سبز کو کھالیا۔ کسی نے خواب کی تعبیر نہ بتائی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتائی کہ سات برس لگاتار کھیتی کرو کچھ اناج جمع کرلو پھر سات سال سخت مصیبت کے آئیں گے ایسے میں جمع شدہ اناج استعمال کرلینا۔ جب بادشاہ کو خواب کی تعبیر ملی تو پوچھا گیا کہ یہ کس نے تعبیر بتائی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انھوں نے باہر آنے سے انکار کر دیا کہ جب تک ان پر لگے جرم کو جھوٹا تسلیم نہ کرلیا جائے وہ باہر نہیں آئیں گے۔ تمام عورتوں نے آپ کی پاک دامنی کی قسمیں کھائیں ان میں زلیخا بھی موجود تھی شاہ مصر ریاں حضرت یوسف علیہ السلام کے دیوانے ہوگئے انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو وزارت دے دی تمام خزانوں کی چابیاں بھی ان کو دے دی گئیں۔ قحط کے دنوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی غلہ لینے آئے تو انھیں کہا گیا کہ اگلی مرتبہ اپنے بھائی بن یمین کو بھی ہمراہ لانا اگر نہ لائے تو غلہ نہیں ملے گا۔ جب اگلی مرتبہ غلہ لیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ چپکے سے چاندی کا پیالہ بن یمین کے کجاوہ میں چھپا دینا۔ ایسا ہی ہوا جب یہ غلے لے کر نکلے تو شاہی کارندوں کو پیچھے بھیجا گیا وہ پیالہ بن یمین کے کجاوہ میں مل گیا سزا کے طور پر بن یمین کو روک لیا گیا۔ باقی بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے اور سارا واقعہ بتایا تو انھوں نے کہا اگلی مرتبہ جاؤ تو بھائی کو تلاش کرنا۔ ایسا ہی کیا گیا حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو بتایا کہ میں ہی یوسف ہوں اور تم نے مجھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ میں نے تمھیں معاف کیا۔ بھائیوں نے بتایا کہ والدِ محترم کی آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا قمیص انہیں دیا اور کہا کہ یہ والد صاحب کی آنکھوں پر لگانا اور بینائی لوٹ آئے گی۔ اور پورا خاندان مصر لے آنا اور ادھر ہی آباد ہو جانا ایسا ہی ہوا۔ جب ان کا خاندان شہر کے قریب پہنچ گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام خود استقبال کے لیے حاضر ہوئے۔ بڑی شان و شوکت سے انھیں شاہی محل میں لایا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک طویل حصہ مصر میں گزارا اور ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارہ گل خار میں
آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں (کلیاتِ اردو، ص ۶۴)

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تراز خونِ زلیخا کر دیں (کلیات اردو، ص۱۳۲)

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا (کلیات اردو، ص۲۰۵)

عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرایں بازار نیست (کلیات فارسی، ص۶)

در خودی کن صورتِ یوسف مقام
از اسیری تاشہنشاہی خرام (کلیات فارسی، ص۶۳)

رزق خود را از کفِ دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر (کلیات فارسی، ص۱۵۸)

ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او
زلیخا یش دل نالاں ندارد (کلیات فارسی، ص۳۰۱)

دگر از یوسف گم گشتہ سخن نتواں گفت
تپش خون زلیخا نہ تو داری و نہ من (کلیات فارسی، ص۳۳۹)

یوسفی راز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسون زلیخائی رفت (کلیات فارسی، ص۳۶۱)

رہ و رسم فرمانروایاں شناسم
خراں بر سرِ بام و یوسف بچا ہے (کلیات فارسی، ص۴۶۶)

یوسف گم گشتہ را باز کشودم نقاب
تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم (کلیات فارسی، ص۵۱۵)

ہم از خدا گلہ و ارم کہ بر زباں نرسد
متاع دل بردد یوسفے بہ برندہد (کلیات فارسی،ص۵۱۹)

اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے بروں آید
بغاوت می تواں دادن متاع کاروانے را (کلیات فارسی،ص۵۲۰)

لعلہا از سنگِ رہ آید بروں
یوسفانِ او زچہ آید بروں (کلیات فارسی،ص۶۲۵)

یوسف مارا اگر گرگے برد
بہ کہ مردے ناکسے اور اخرد (کلیات فارسی،ص۸۰۴)

ooo

حضرت موسیٰ کلیم اللہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے بہت بڑے برگزیدہ نبی گزرے ہیں۔ یہودی انھیں اپنے مذہب کا پیشوا اور بانی مانتے ہیں۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تقریباً ۱۴۰۰ ق۔م میں مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین لیوانی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شجرہ نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے۔ موسیٰ بن عمران بن قاہث ، بن عارز بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے زمانے میں ہوئی جب فرعون منفتاح بن ریمسیس کا دور تھا۔ فرعون کو اس کے کاہنوں اور نجومیوں نے بتا رکھا تھا کہ اس کی حکومت کے زوال کا سبب ایک اسرائیلی لڑکا ہوگا۔ جب فرعون نے حکم صادر فرمایا کہ عبرانیوں کے گھروں میں جتنے لڑکے پیدا ہوں ہلاک کر دیے جائیں تو موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے ہی ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل کے حوالے کر دیے گئے۔ فرعون کی بیوی کو یہ بچہ مل گیا۔ ان کو دودھ پلانے کے لیے مادرِ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی مقرر ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شاہانہ دربار میں پرورش پائی۔ آپ بہت طاقت ور، بہادر اور عظیم الجثہ تھے۔ انھیں علم ہوا کہ وہ اسرائیلی ہیں۔ مصریوں کی طرف سے اسرائیلیوں پر بلاوجہ مظالم دیکھ کر آپ کا دل کڑھتا تھا۔ ایک روز انھوں نے ایک مصری کو اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو آپ کو غصہ آ گیا اور آپ نے اس مصری کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ چونکہ قتل کا نہ تھا سمجھ گئے کہ یہ شیطانی کام ہے لہٰذا فوراً معافی کے خواستگار ہوئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاف فرمایا۔

جب مصریوں کو پتہ چلا کہ یہ قتل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا ہے تو وہ آپ کی جان کے دشمن

بن گئے۔ آپ جان بچاتے ہوئے مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ وادی مدین کی سرزمین پر پہنچے تو ایک کنویں کے سامنے پانی کے حوض پر بہت رش دیکھا لوگ جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اس کے تھوڑے فاصلے پر دو لڑکیاں کھڑی انتظار کر رہی تھیں کہ وہ رش کم ہو تو اپنے جانوروں کو پانی پلا سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلایا۔ وہ لڑکیاں جلد گھر گئیں تو اپنے والد سے اس نوجوان کا ذکر کیا۔ ان کے والد نے حضرت موسیٰ کو بلایا اور بکریاں چرانے پر رکھ لیا شرط طے پائی کہ وہ اگر آٹھ برس بکریاں چرائیں گے تو ایک بیٹی کی شادی اُن سے کر دیں گے اور مزید دو سال بکریاں چرائیں تو یہ اس بیٹی کا حق مہر ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شادی ہوگئی۔ پھر کوہ طور کا واقعہ پیش آیا۔ اپنے سسر حضرت شعیب علیہ السلام سے اجازت لے کر وطن روانہ ہوئے۔ دوران سفر رات ہوگئی، رات بہت سردی ہوئی تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں آگ کا بندوبست کرتا ہوں وہ آگ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کہ انہیں وادی ''ایمن'' میں ایک شعلہ دکھائی دیا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو وہیں رکنے کا کہا اور خود آگ لینے چلے گئے۔ وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی اے موسیٰ علیہ السلام میں تیرا رب ہوں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو لاٹھی سے اژدھا بننے اور ہاتھ کے روشن ہونے کے معجزے عطا کیے گئے۔ پھر حکم ہوا کہ فرعون کو راہ ہدایت دکھائی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے درخواست کی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا جائے تاکہ وہ بھی میرے ساتھ فرعون کے دربار میں جا سکے۔ اللہ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خدا کا پیغام سنایا لیکن فرعون نہ مانا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اپنی قوم کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دے دی جائے۔ فرعون نہ مانا لیکن جب پے در پے سات آفات آئیں تو فرعون نے نہ چاہتے ہوئے اجازت دے دی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر جا رہے تھے تو فرعون نے بدعہدی کرتے ہوئے ان کا پیچھا کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے دریائے نیل پر لاٹھی ماری۔ لاٹھی مارتے ہی سمندر کے درمیان سے راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم صحیح سلامت پانی میں سے گزر گئے۔ جب فرعون ان کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر میں بنے ہوئے راستے پر آیا تو پانی کے دونوں حصے مل گئے۔ جس کی وجہ سے فرعون اور اس کے حواری غرقاب ہوئے۔ اب یہودیوں کو پختہ یقین ہوگیا کہ ان کا رہنما خدا کا نبی ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ جزیرہ نمائے سینا میں چلے گئے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کے بعد انھیں

شریعت سے نوازا جائے گا۔اب وعدہ الٰہی پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنے رب کے حکم سے طور پر اللہ کی عبادت کے لیے چلے گئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اس مشاہدۂ حق کی تاب نہ لا سکیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم اپنی ذات کی تجلّی کا ظہور اس پہاڑ پر فرمائیں گے اگر اس پہاڑ نے تجلّی برداشت کر لی تو پھر ہم سے سوال کرنا پھر جیسے ہی تجلّی حق پہاڑ پر پڑی تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر ہوش آتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور کہا کہ وہ سب سے زیادہ یقین کرنے والوں میں سے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔ترجمہ

''اور جب موسیٰ ہمارے وعدہ پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام فرمایا عرض کی اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا پھر جب اس نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ گر کر بے ہوش ہوا۔ پھر جب ہوش آیا بولا پاکی ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔''

حضرت علامہ محمد اقبال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہادری، شجاعت اور ان کے معجزات کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال ان کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے کہ انھوں نے ایک جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کیا اور اسے ایک خدا کے سامنے جھکنے کا کہا۔ فرعون اپنے زمانے کا ایک طاقت ور بادشاہ اور حاکم تھا اس نے ربوبیت کا دعویٰ کر رکھا تھا جس کا کوئی انکاری ہوتا اسے قتل کر دیا جاتا۔اقبال نے ان کی جرأت و شجاعت کو ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔

ناأمید استم زیارانِ قدیم
طور من سوزد کہ مے آید کلیم (کلیاتِ فارسی۔ص۷)

طاقتِ پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیٰ ادراک را (کلیاتِ فارسی۔ص۱۶)

جلوہ ہا خیزد زنقش پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او (کلیات فارسی۔ص۴۵)

موسیٰ ، بیگانہ سینائے عشق
بے خبر از عشق و از سودائے عشق (کلیات فارسی۔ص٦٦)

صاحبش بالا تر از امید و بیم
دستِ او بیضا تراز دستِ کلیم (کلیات فارسی۔ص۷۱)

در دل حق سِرّ مکنو نیم ما
وارثِ موسیٰؑ و ہارونیمؑ (کلیات فارسی۔ص۷۵)

درجہان یا رب ندیم من کجاست
نخلِ سینا یم کلیم من کجاست (کلیات فارسی۔ص۷۷)

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از لاتخف محکم شود (کلیات فارسی۔ص۹۵)

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید (کلیات فارسی۔ص۱۱۰)

پنجۂ گردوں چو انگورش فشرد
یادگار موسیٰ و ہاروں نمرد (کلیات فارسی۔ص۱۲۵)

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآل امت موسیٰ بگیر (کلیات فارسی۔ص۱۳٦)

آں اَمنَّ النّاس برمولائے ما
آں کلیم اولص سینائے ما (کلیات فارسی۔ص۱۵٦)

نمیگر ود کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است (کلیات فارسی۔ص۲۰۸)

خلیل او حریف آتشے نیست
کلیمش یک شرر در جان ندارد (کلیات فارسی۔ص۳۰۲)

در رہِ عشق فلاں ابن فلاں چیزے نیست
ید بیضائے کلیمے بسیا ہے بخشند (کلیات فارسی۔ص۳۴۲)

تو برنخلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمے صورتِ پروانہ می آئی (کلیات فارسی۔ص۳۴۳)

گرچہ از طور وکلیم است بیانِ واعظ
تابِ آں جلوہ بآئینہ گفتارش نیست (کلیات فارسی۔ص۳۴۶)

نظر تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی
نزی جزبہ تقاضائے کلیم اللّٰہی (کلیات فارسی۔ص۳۵۰)

کوہ می خواست مانندِ کلیم ناصبور
تاضمیرِ مستنیر او کشود اسرارِ نور (کلیات فارسی۔ص۳۶۹)

من چہ گویم از مقامِ آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زردشتے زنسل موسیٰ و ہاروں ظہور (کلیات فارسی۔ص۳۷۰)

جلوہ او بے کلیمؑ و شعلۂ او بے خلیلؑ
عقل ناپروا متاعِ عشق را غارت گراست (کلیات فارسی۔ص۳۷۸)

بایں بے رنگی جوہر از ونیرنگ می ریزد
کلیمے ہیں کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کردہ (کلیات فارسی۔ص۴۲۴)

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگرِ بحر شگافید و بہ سینا نرسید (کلیات فارسی۔ص۴۸۲)

در کلیسا ابن مریم را بدار آویختند
مصطفیٰؐ از کعبہ ہجرت کردہ با اُمّ الکتاب (کلیات فارسی۔ص۴۸۷)

نورِ قدیمی شب را بر افروز
دست کلیمی در آستینی! (کلیات فارسی۔ص۵۰۸)

چراغِ خویش برا فروختم کہ دست کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کر دند (کلیات فارسی۔ص۵۱۸)

مرا با فقر سامانِ کلیم است
فرشاہنشہی زیرِ گلیم است (کلیات فارسی۔ص۵۳۸)

ہمیں دریا ہمیں چوبِ کلیم است
کہ از وے سینۂ دریا دو نیم است (کلیات فارسی۔ص۵۴۱)

حکیماں مردہ را صورت نگارند
یدِ موسیٰؑ دمِ عیسیٰؑ ندارند! (کلیات فارسی۔ص۵۴۸)

ستردن نقش ہرامید و بیمے
زدن چا کے بدریا چوں کلیمے (کلیات فارسی۔ص۵۵۳)

چوں کلیمے شد بروں از خویشتن
دستِ او تاریک و چوبِ او رسن (کلیات فارسی۔ص۵۸۰)

جانم ملول گشت ز فرعون و ظلم او
آں نور جیبِ موسیٰ عمرانم آرزو ست (کلیات فارسی۔ص۶۰۶)

ضربِ قلندری بیا رسدِ سکندری شکن
رسمِ کلیمؑ تازہ کن، رونقِ ساحری شکن (کلیاتِ فارسی۔ص۶۱۶)

در کہستاں چوں کلیم آوارہ شو
نیم سوز آتشِ نظارہ شو (کلیاتِ فارسی۔ص۶۳۷)

عشق در خلوت کلیم اللّٰہی است
چوں بجلوت می خرامد شاہی است (کلیاتِ فارسی۔ص۶۳۸)

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیم
ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم! (کلیاتِ فارسی۔ص۶۵۸)

تو کلیمی چند باشی سرنگوں
دستِ خویش آز آستیں اور بروں (کلیاتِ فارسی۔ص۶۶۵)

در گذر مثلِ کلیم از رود نیل
سوئے آتش گام زن مثلِ خلیل (کلیاتِ فارسی۔ص۶۷۱)

آں کہستاں ، آں جبال بے کلیم
آنکہ از برف است چوں انبارِ سیم (کلیاتِ فارسی۔ص۶۸۱)

سینۂ دریا چو موسیٰ بر درم
من ترا اندر ضمیر او برم (کلیاتِ فارسی۔ص۶۸۲)

سرگذشتِ مصر و فرعون و کلیم
می تواں دیدن ز آثار قدیم (کلیاتِ فارسی۔ص۶۸۴)

قوتِ فکر حکیماں از کجا ست
طاقت ذکر کلیماں از کجا ست (کلیاتِ فارسی۔ص۶۹۶)

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم (کلیات فارسی۔ص۷۰۶)

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود
مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار بود (کلیات فارسی۔ص۷۴۱)

زاں تجلّی ہا کہ در جانم شکست
چوں کلیم اللہ فتاد دم جلوہ مست (کلیات فارسی۔ص۷۸۳)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ
او محمدؐ ، او کتاب ، او جبرئیل (کلیات فارسی۔ص۷۹۵)

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم!
ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم (کلیات فارسی۔ص۷۹۶)

می رود روشن تراز دستِ کلیم
زورقِ زرین تو درجوئے سیم (کلیات فارسی۔ص۸۰۶)

از دمِ او وحدت قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم (کلیات فارسی۔ص۸۱۱)

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود
آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود (کلیات فارسی۔ص۸۲۸)

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم (کلیات فارسی۔ص۸۳۲)

تا کجا در بند ہا باشی اسیر
تو کلیمی راہِ سینائے بگیر (کلیات فارسی۔ص۸۸۲)

ایں کارِ حکیمے نیست ، دامانِ کلیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست، یک بندہ دریا مست (کلیات فارسی۔ص۸۷۲)

ضمیرِ امتاں رامی کند پاک
کلیمے یا حکیمے نَے نوازے (کلیات فارسی۔ص۸۹۵)

حکیماں با کلیماں دوش بردوش
کہ ایں جا کس نگوید و لن ترانی (کلیات فارسی۔ص۹۱۲)

درافتد با ملوکیت کلیمے
فقیرے ، بے کلاہے ، بے گلیمے (کلیات فارسی۔ص۹۷۲)

ایک جلوہ تھا کلیمِ طور سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے (کلیات اردو،ص۲۱)

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے (کلیات اردو،ص۴۱)

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چُور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے (کلیات اردو،ص۵۱)

پابندی احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ھمدانی (کلیات اردو،ص۵۹)

تو کہاں ہے اے کلیم ذروہ سینائے علم!
تھی تری موج نفس بادِ نشاطِ افزائے علم (کلیات اردو،ص۷۸)

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا (کلیات اردو،ص۸۱)

بندۂ کلیمؑ جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحؑ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا (کلیاتِ اردو،ص۸۷)

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰؑ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی! (کلیاتِ اردو،ص۹۹)

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی (کلیاتِ اردو،ص۱۰۲)

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں (کلیاتِ اردو،ص۱۰۴)

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے (کلیاتِ اردو،ص۱۰۸)

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم (کلیاتِ اردو،ص۱۱۶)

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں (کلیاتِ اردو،ص۱۳۹)

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی؟
کرمک بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی! (کلیاتِ اردو،ص۱۸۳)

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانند کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر (کلیاتِ اردو،ص۱۹۰)

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں (کلیاتِ اردو،ص۲۰۲)

نظم: تضمین بر شعر ابو طالب کلیم

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحب یثربﷺ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

جس سے تیرے حلقہ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح
ہو گئی ہے اس سی اب نا آشنا تیری جبیں

دیکھ تو اپنا عمل تجھ کو نظر آتی ہے کیا
وہ صداقت جس کی بیبا کی تھی حیرت آفریں

تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل ترے کاشانۂ دل میں مکیں

غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طورِ معنی پر کلیمِ نکتہ بیں

سر کشی باھر کہ کر دی رام او باید شدن
شعلہ ساں از ہر کجا بر خاستی آنجا نشیں

(کلیات اردو، ص ۲۲۱)

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیمِ طور سے
اے کہ تیرے نقشِ پا سے وادیٔ سینا چمن! (کلیات اردو، ص ۲۴۰)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری (کلیات اردو، ص ۲۵۲)

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم!
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش (کلیات اردو، ص ۲۵۶)

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں!
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری (کلیات اردو، ص ۲۶۱)

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر (کلیات اردو، ص ۲۷۹)

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف! (کلیات اردو، ص ۳۳۱)

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہٗ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف (کلیاتِ اردو، ص ۳۳۲)

اَرِنیٗ میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیث کلیم و طور نہیں! (کلیاتِ اردو، ص ۳۳۵)

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم! (کلیاتِ اردو، ص ۳۵۲)

تھا اَرِنیٗ کو کلیمؑ من اَرِنیٗ گو نہیں
اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام! (کلیاتِ اردو، ص ۳۵۴)

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد! (کلیاتِ اردو، ص ۳۶۲)

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہیدِ کلیم اللٰہی! (کلیاتِ اردو، ص ۳۶۷)

علم فقیہہ و حکیم فقر مسیح و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ (کلیاتِ اردو، ص ۳۶۹)

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (کلیاتِ اردو، ص ۳۸۰)

حکیمی نا مسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی (کلیاتِ اردو، ص ۳۸۱)

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیلؑ (کلیاتِ اردو، ص ۳۸۸)

دل طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم! (کلیاتِ اردو، ص ۴۱۵)

مصلحت در دین ماجنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کو (کلیاتِ اردو، ص ۴۳۱)

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے (کلیاتِ اردو، ص ۴۵۹)

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلّیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم (کلیاتِ اردو، ص ۴۸۸)

اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم! (کلیاتِ اردو، ص ۴۹۲)

معجزۂ اہل فکر فلسفہ پیچ پیچ
معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور (کلیاتِ اردو، ص ۵۱۳)

یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز! (کلیاتِ اردو، ص ۵۳۷)

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا! (کلیاتِ اردو، ص ۵۸۱)

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللہی (کلیاتِ اردو، ص ۵۹۶)

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیر محمد ہے کبھی چوبِ کلیم! (کلیاتِ اردو، ص ۶۰۷)

وہ کلیم بے تجلی ، وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب! (کلیات اردو، ص ۶۵۰)

نصیب خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ! (کلیات اردو، ص ۶۸۳)

OOO

حضرت داؤد علیہ السلام

حضرت داؤد علیہ السلام ۱۰۳۳ ق م بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ داؤد کا لغوی معانی انصاف پسند اور داد دینا والا کے ہیں۔ وہ اسم با مسمیٰ تھے۔ جوانی میں ان کا پیشہ شبانی تھا۔ جوانی ہی میں وہ ایمانداری، دیانتداری، انصاف پسندی اور بہادری کی وجہ سے معروف ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب بنی اسرائیل داخلی جھگڑوں سے دو چار تھے۔ وہ فلسطینیوں سمیت بہت سے قبائل سے لڑائی جھگڑا کرتے رہتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ایک جنگ میں ایک معروف قد وقامت پہلوان جالوت کو شکست دے گئے۔ شام کے بادشاہ شاؤل کے مرنے کے بعد یہودیوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا انہوں نے سات سال تک مخالفین سے جنگ کر کے یورشلم پر قبضہ کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عبد و بیت کا نظام بہتر بنایا اور عدل وانصاف کا بول بالا کیا۔ آپ کی کوششوں سے یہودیوں کی حکومت کو تقویت حاصل ہوئی۔ فنِ حرب کے بل بوتے پر انھوں نے بحرِ احمر اور مصر سے دریائے فرات تک کامیابیاں حاصل کر لیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام سخاوت، شجاعت، امانت، دیانت اور تقویٰ کے خوگر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب ''زبور'' نازل فرمائی۔ قرآن پاکستان کی سورۃ النساء کی ۱۷اویں آیت میں کہا گیا ہے کہ:

''اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی''

قرآن کریم میں ان کا نام سولہ بار آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بادشاہی، حکمت ودانائی اور قوت انصاف سے بہرہ ور فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ مجرموں کو سزائیں دی گئیں۔ انھوں نے اخراجات میں کمی اور رزقِ حلال کا درس دیا۔ وہ دفاعی تقاضوں سے آگاہ تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ بانی کا ذکر قرآن پاک میں کئی مقامات

پر آیا ہے۔

''کھلی زرہ بنا اور اندازے سے کڑیاں جوڑ'' (سورۃ سبا آیت ۱۱)

دشمنانِ دین کے خلاف خود کو تیار رکھنا تعلیماتِ قرآن میں بھی موجود ہیں۔

''اور ان دشمنوں سے مقابلے کے لیے جو ہو سکتا ہے قوت حاصل کرو'' (۶۰: انفال)

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فولاد پر حاکمیت عطا کی۔ وہ فولاد کو اپنی قوت سے نرم کر دیتے تھے۔ ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کے لیے ان کی خدمات مشعل راہ ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے معروف فرزند تھے۔ انھوں نے بیس سال کی عمر میں حکومت کا قلم دان سنبھالا اور اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے مشن کو آگے بڑھایا۔ مقبول داؤدی نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''داؤد علیہ السلام، حضرت: قرآن مجید نے ان کو خلیفۃ اللہ کہا ہے۔ طالوت کے ساتھ مل کر جالوت کے خلاف لڑے اور جالوت کو ہلاک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ اور آپ کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم و دانائی عطا فرمائی۔ دونوں نبی تھے۔ آپ پر کتاب زبور نازل ہوئی۔ آپ اس خوش الحان سے زبور پڑھتے تھے کہ جانور آپ کی آواز سننے کو جمع ہو جاتے تھے۔ انہی کے نام سے ''لحن داؤدی'' کی ترکیب آج تک مشہور ہے۔ آپ کا دوسرا معجزہ یہ تھا کہ لوہا آپ کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا۔ زرہ کی ایجاد آپ ہی نے کی۔''

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کلیات فارسی کے ۳۱۴۔ ۳۹۶۔ ۶۴۹ صفحات پر حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔

بخاک ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگر دد ز نغمہ داؤد (کلیات فارسی، ص ۳۱۴)

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز
ہر ذرہ مرا پر و بال شرر بدہ (کلیات فارسی، ص ۳۹۶)

اضطرابِ شعلہ بخشد دور را
سوز و مستی می دہد داؤد را (کلیات فارسی، ص ۶۴۹)

○○○

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی اور رسول ہیں۔ ان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ''انجیل'' بھی نازل ہوئی۔ ''انجیل'' دراصل ''تورات'' کی تکمیلی شکل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک کی کئی سورتوں میں ملتا ہے۔ جن میں سورہ البقرہ، سورہ آل عمران، سورہ النساء، سورہ المائدہ، سورہ الانعام، سورہ التوبہ، سورہ مریم، سورہ المؤمنون، سورہ الاحزاب، سورہ الشوریٰ، سورہ الزخرف، سورہ الحدید اور سورہ الصف شامل ہیں۔ ان تمام سورتوں میں آپ کا ذکر کسی جگہ عیسیٰ، کسی جگہ مسیح، اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی جگہ کنیت ابنِ مریم سے کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان میں کوئی پیغمبر یا نبی معبوث نہیں ہوا درمیان کا یہ دور تقریباً ۵۷۰ برس پر مشتمل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم بنت عمران کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے آنے کی خوشخبری انبیاء کرام کرتے رہے ہیں۔ ان کی پیدائش کے بارے میں بائبل مقدس میں ذکر ملتا ہے۔ ان کی پیدائش کے بارے میں قرآن پاک کہتا ہے:

ترجمہ: ''اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا، اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح مریم کا بیٹا رودار (باعزت) ہوگا دنیا اور آخرت میں اور قرب والا اور لوگوں سے بات کرے گا پالنے میں اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔ بولی اے میرے رب! میرا بچہ کہاں سے پیدا ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا فرمایا اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اسے یہی کہتا ہے ہو جا، وہ

فوراً ہو جاتا ہے اور اللہ سکھائے گا کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف۔" (سورہ آل عمران:۶)

حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں خوشخبری سنا کر حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونک مار دی۔ کچھ ماہ کے بعد حضرت مریم علیہا السلام نے محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہوگئی ہیں۔ وہ بدنامی اور بہتان سے بچنے کے لیے یروشلم سے تقریباً نو میل دور کوہ سراۃ پر چلی گئیں جس کے بعد اس کا نام تبدیل کر کے "بیت اللحم" رکھ دیا گیا۔ وہیں بیٹے کی پیدائش ہوئی جب اپنی قوم کی طرف پلٹنے لگیں تو سخت پریشان تھیں اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے ذریعے ان کی پریشانی کو دور کر دیا اور فرمایا کہ جب قوم میں چلی جائیں تو خاموش رہیے گا لوگوں کے سوالوں کے جوابات یہ بچہ دے گا۔ ایسا ہی ہوا جب قوم نے طرح طرح کے سوال کیے تو ان کا جواب بچے نے دیا۔

سورہ مریم میں ہے:

"بچہ نے فرمایا میں ہوں اللہ کا بندہ اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے غیب کی خبریں بتانے والا (نبی) کیا اور اس نے مجھے مبارک کیا۔ میں کہیں ہوں اور مجھے نماز و زکوٰۃ کی تاکید فرمائی جب تک جیوں اور اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا اور مجھے زبردست بدبخت نہ کیا اور وہی سلامتی مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اٹھایا جاؤں۔"

چالیس دنوں کے دودھ پیتے بچے کی زبان سے حکمت بھری باتیں سن کر لوگ سمجھ گئے کہ یہ اللہ پاک کی نشانی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام پہلے مصر اور پھر وہاں سے ناصرۃ چلی گئیں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تیرہ برس ہوئی تو حضرت مریم انھیں واپس بیت المقدس لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی حفاظت کے لیے مامور کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پانچ معجزات عطا کر رکھے تھے۔

۱۔ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔
۲۔ وہ اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تھے۔
۳۔ وہ مادر زاد نابینا کو بینا اور کوڑھی مرض سے شفا عطا کرتے تھے۔
۴۔ وہ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو اللہ کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔
۵۔ وہ لوگوں کا کھایا، پیا خرچ کیا ہوا اور گھر میں محفوظ کیا ہوا سب کے بارے میں بتا دیتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو دیکھ کر کئی لوگوں نے دعوت حق کو قبول کیا، ایمان لائے، خدا کی وحدانیت کو مانا، حق کی سربلندی کے لیے اپنا جان و مال وقف کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پاک باز، ذہین، ہوشیار اور عبادت گزار تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے یہود گھبرانے لگے انھوں نے طرح طرح کی سازشیں شروع کر دیں انھوں نے ہیرودیس بادشاہ کو بھڑکایا اور انہیں دار پر چڑھا دیا گیا۔ جب کہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ سلامت اوپر اٹھالیا گیا۔ قرآن میں آتا ہے:

ترجمہ: ''اور ان کے اس کہنے پر ہم نے مسیح عیسیٰؑ بن مریم اللہ کے رسول کو شہید کیا اور ہے یہ کہ انھوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی دی بلکہ ان کے لیے ان کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ضرور اس کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں انھیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں مگر یہی گمان کی پیروی اور بے شک انھوں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

سورہ النساء کی آیات میں قرآن پاک میں واضح اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا دعویٰ کرنا چاہے اس کی بنیاد عقیدے پر ہو ذلت کا باعث ہے۔ خدا کے پیغمبر کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب قرآن کے اعلان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرش سے کائنات ارضی پر لوٹیں گے اور یہود و نصاریٰ کا ہر فرد ان پر ایمان لائے گا۔

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا (کلیات اردو، ص ۹۶)

دار الشفا حوائی بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے (کلیات اردو، ص ۱۹۸)

علم فقیہہ و حکیم فقرِ مسیح و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ! (کلیات اردو، ص ۳۶۹)

وہ کلیم بے تجلّی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب! (کلیات اردو، ص ۶۵۰)

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کی صفات؟ (کلیات اردو، ص ۶۵۶)

قوم عیسیٰ برکلیسا پازده
نقد آئین چلیپا وازده (کلیات فارسی، ص ۱۱۶)

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؑ عزیز (کلیات فارسی، ص ۱۵۲)

می چکد آبِ خضر از تاک او
مرہمِ زخمِ مسیحا خاک او (کلیات فارسی، ص ۱۵۹)

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است (کلیات فارسی، ص ۳۵۸)

حکیماں مردہ را صورت نگارند
ید موسیٰؑ دمِ عیسیٰؑ ندا رند (کلیات فارسی، ص ۵۴۸)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ
او محمدؐ ، او کتاب ، او جبرئیل (کلیات فارسی، ص ۷۹۵)

ooo

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو منصب رسالت سے سرفراز کیا گیا۔ مختلف کتابوں میں ان کو سکن، عبدالغفار، یشکر یا شاکر، عبدالجبار عبدالرحمٰن عبدالملک عبدالاعلیٰ اور لقب نوح سے لکھا گیا ہے۔ نوح، نوحہ سے بنا ہے جس کا مطلب گریہ زاری کرنا، ماتم کرنا، پیٹنا وغیرہ ہے جب کہ عبرانی میں اس کا مطلب آرام و آسائش ہے۔ سریانی میں اس کا مفہوم "ساکن" ہے۔ ان کے لقب نوح کی مختلف وجوہات بھی بیان کی گئی ہیں۔ وہ اپنے نفس اور امت کے گناہ پر نوحہ کیا کرتے تھے اسی وجہ سے ان کو نوح کے نام سے پکارا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب ان کے والد لمک ۱۸۲ برس کے تھے۔ ان کی والدہ کا نام قنیوش بنت راکیل جب کہ دوسری روایت میں سجاد بنت انوش بیان کیا گیا ہے۔ آپ کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آدم اصغر، والد دوم، اور شیخ الانبیاء کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میاں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اجمالی و تفصیلی انداز میں ۴۳ مقامات پر ہے۔ تاہم اس واقعہ کی اہم تفصیلات سورہ الاعراف، ہود، المومنون، الشعرا، قمر اور نوح میں ملتی ہیں۔ حضرت نوحؑ کا ظہور دریائے دجلہ وفرات کے دوآبہ عراق میں ہوا یہ انسانی تہذیب وتمدن کا سب سے پرانا گہوارہ ہے آپ کی قوم بھی یہیں رہائش پذیر تھی۔ بابل کی کھدائی کے دوران ملنے والے کتبوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور غالباً سب سے پہلے بت پرستی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نوسو سال تک مسلسل تبلیغ حق کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن اثر نہ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے۔ جب حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ قوم کے قلوب سیاہ ہوگئے ہیں اور وہ جمال معبود حقیقی کو نہیں دیکھ

سکتی۔ان پر دعوت وتبلیغ کا اثر نہیں ہوا۔تب انھوں نے محسوس کیا کہ ایسی قوم کا زندہ رہنے سے کیا مفید نہیں کہ یہ خود بھی مشرک و بدکار ہیں اور ان کی اولاد بھی بدکار ہوگی۔لہٰذا یہ زمین پر بگاڑ پیدا کریں گے۔ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے رہے تب حضرت علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی:

ترجمہ ''اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ بے شک اگر تو انھیں رہنے دے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کردیں گے اور ان کی اولاد ہوگی تو وہ بھی نہ ہوگی بدکار بڑی ناشکر۔''

جب حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لانے والا جنھوں نے ایمان لانا تھا وہ لے آئے ہیں۔پھر حضرت نوح علیہ السلام کو ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب کشتی تیار ہوگئی تو ایک تند و تیز طوفان آیا۔چالیس روز تک دن رات پانی برسا۔ پانی پہاڑوں سے بھی پندرہ ہاتھ اوپر چلا گیا تھا۔حضرت نوح علیہ السلام اپنے پیروکاروں کے ساتھ چالیس روز سب و روز اس کشتی میں تیرتے رہے۔کعبہ کے مقام پر پہنچ کر کشتی نے سات مرتبہ طواف کیا بعض روایات کے مطابق حکم ربی سے کعبہ اور حجر اسود کو بھی کشتی میں رکھ لیا گیا۔طوفان کے ٹل جانے کے بعد کعبہ اور حجرِ اسود کو دوبارہ نصب کیا گیا۔تمام منکرین غرق آب ہوئے۔ان غرق ہونے والوں میں حضرت نوح علیہ السلام کا ایک بیٹا اور بیوی بھی شامل تھے۔حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے زندہ رہے اور باقی تمام لوگ وفات پا گئے انھیں تین بیٹوں سے آپ کی نسل آگے بڑھی۔بعض روایات کے مطابق طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔بعض دیگر روایات میں ہے کہ آپ طوفان کے بعد ۳۵۰ برس زندہ رہے۔مجموعی طور پر بارہ سو سال عمر پائی۔مجمع البحرین کے حوالے سے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۲۵۰۰ سال لکھی ہے جب کہ انوار نعمانیہ نے اسی کو منتخب کیا ہے۔کنیز الادیت میں نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال اور تورات نے ۹۵۰ سال عمر لکھی ہے۔صحیح تر ۱۲۵۰ برس ہے۔آپ کی قبر نجف اشرف میں ہے۔روایت ہے کہ جب موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لیے آیا تو اس نے پوچھا کہ آپ نے دنیا کو کیسا پایا تو آپ نے فرمایا کہ بس ایسے ہی جیسا کہ میں ایک دروازے سے کوٹھری میں داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔

علامہ محمد اقبال نے ان کے صبر، ثابت قدمی، اور صبر و استقلال کی تعریف کی ہے ان کے تبلیغ ایمان کو زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔علامہ اقبال کے ہاں ان کا ذکر ایک ایسی

ہستی کے طور پر بھی سامنے آتا ہے جو عشقِ حقیقی سے لبریز قلب وچشم کی مالک ہی نہیں بلکہ برگزیدہ بارگاہ الٰہی ہے۔ وہ کائنات کو کفر وشرک سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال کی خواہش ہے کہ موجودہ دور کے مردِ مومن یقین وایمان کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح پختہ کرلیں مستقل مزاجی اور صبر واستقلال سے کام لیں اور اللہ کی وحدانیت کا پرچار کریں۔

بندے کلیمؑ جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحؑ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

(کلیات اردو، ص ۸۷)

جز دعا ہا نوح تدبیرے نداشت
حرفِ آں بیچارہ تاثیرے نداشت

(کلیات فارسی، ص ۶۳۷)

ooo

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت ہارون علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر تھے۔خوش بختی دیکھیے کہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ نے نبوت عطا فرمائی۔ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین برس پہلے پیدا ہوئے۔تاہم ان کو نبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر مانگی جانے والی دعا کی بدولت نصیب ہوئی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے تبلیغ دین کے لیے اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھرپور معاونت کی۔ وہ ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ فرعون کو دین حق کی دعوت دینے کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ دربار فرعون میں گئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لیے کوہ طور پر گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ان کی ہدایت و رہنمائی کے باوجود قوم نے سامری کے اکسانے پر سونے کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر قوم نہ مانی۔تورات میں حضرت ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی میں شریک بتایا جب کہ قرآن پاک نے ان لغویات سے پاک رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے واپس آئے تو حضرت ہارون علیہ السلام سے گوسالہ پرستی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اپنی کمزوری اور مخالفین کی طاقت اور قوت کے بارے میں آگاہی دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو معاف فرمایا اور ان کے لیے دعا کی اور گوسالہ پرستوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپس میں قتل کرنے کا حکم دیا۔ تین روز میں ۷۰ ہزار اسرائیلی قتل ہو گئے۔ اسرائیلی عورتوں اور بچوں کی فریاد اور ان کی آہ وزاری کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رو رو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کی دعا کی جو قبول ہوئی۔

قرآن پاک میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بت پرستی سے جدا دکھایا گیا ہے بل کہ وہ شرک

کرنے والوں کو شرک سے روکتے رہے۔ قرآن پاک میں حضرت ہارون علیہ السلام کا قصور صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ وہ شرک کرنے والوں سے الگ کیوں نہ ہوئے۔

وادیٔ سینا میں جب قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر آگے بڑھ کر جہاد سے انکار کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور جس دوسرے شخص کا ذمہ لیا وہ حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ اس سرکشی کے نتیجے میں اسرائیلی قوم چالیس برس تک صحراؤں میں پھرتے رہے اس دوران کئی بڑے سردار اور بڑے لوگ مارے گئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام بھی تیہ کے اندر انتقال فرما گئے ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی مقام پر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تمام عمر دعوتِ توحید کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے بڑے بڑے سرداروں کو بھی دعوتِ حق دی۔ فرعون کو بھی دعوتِ حق دینے اس کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پیغام پھیلانے میں ہمہ وقت مصروف عمل رہے۔

علامہ محمد اقبال نے بھی حضرت ہارون علیہ السلام کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ان کے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ موجود ہے ان کا خیال ہے کہ قرآن پاک میں بھی دونوں بھائیوں کا اکٹھا ذکر آیا ہے لہٰذا ان کو جدا نہیں کرنا چاہیے اکٹھا ہی تذکرہ کرنا چاہیے۔

در دل حق سر مکنونیم ما
وارثِ موسیٰ و ہارونیم ما (کلیات فارسی، ص ۷۵)

پنجۂ گردوں چوانگورش فشرد
یادگار موسیٰ و ہاروں نمرد (کلیات فارسی، ص ۱۲۵)

من چہ گویم از مقام آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زردشتے زنسل موسیٰ و ہاروں ظہور (کلیات فارسی، ص ۳۷۰)

در دل حق سر مکنونیم ما
وارثِ موسیٰ و ہارونیم ما (کلیات فارسی، ص ۷۵)

کلامِ

ہارون کی آخری نصیحت

ہاروں نے کہا وقتِ رحیل اپنے پسر سے
جائے گا کبھی تو بھی اسی راہگذر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے!

(کلیات فارسی، ص ۴۵۸)

ooo

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ وہ بیمار ہوگئے۔ ایسے بیمار کہ سب ان کو چھوڑ گئے صرف آپ کی بیوی آپ کی خدمت کرتی رہی۔ انتہائی خراب حالت میں بھی آپ نے انتہائی صبر سے کام لیا اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہے۔ آخر اللہ نے صحت دے دی۔ ان کے صبر کی وجہ سے ''صبر ایوب علیہ السلام'' مشہور ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو موت کا کوئی خوف نہ تھا کیونکہ فنا فی اللہ کے درجہ کو پہنچ چکے تھے۔ وہ مصائب اور مصیبتوں اور آزمائشوں سے نبرد آزما ہوتے رہے ہیں۔ ان کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ۱۵۰۰ ق م یا ۱۳۰۰ ق۔م ہے۔

تورات کے مطابق ایک روز شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی نیک عملی اور عبادت صرف تیری رضا جوئی کے لیے نہیں بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اسے دنیا کی ہر شے اور نعمت سے سرفراز کر رکھا ہے اگر تمام مال و دولت اور دیگر نعمتیں واپس لے لی جائیں تو کیا وہ پھر بھی پرہیز گاری اور نیکو کاری باقی نہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایوب علیہ السلام ایسا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا شیطان کو اجازت دے دی گئی۔ شیطان نے حضرت ایوب کے بدن میں آتشی پھونک ماری اور مس کیا حتیٰ کہ بدن میں بیماریوں اور سخت درد نے جنم لے لیا۔ ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے جو رگڑ لگنے سے چھل گئے اور زخم کی شکل اختیار کر گیا پھر ان میں کیڑے پڑ گئے۔ یہ زخم پھیلتے پھیلتے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے گیا۔ صرف ان کا دل ایسا تھا جو بچا رہا۔ اس حالت میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ذرا بھر کمی نہ آنے دی۔ ان حالات میں تمام دوست احباب ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ صرف ان کی بیوی ان کی خدمت میں رہی۔ جب وہ اس آزمائش سے

کامیاب گزرے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تمام بیماریوں سے نجات دلائی۔ اولاد وفات پا گئی مال مویشی ختم ہو گئے۔ دوبارہ رب کریم نے پہلے سے زیادہ عطا فرمایا۔

قرآن پاک میں ان کا ذکر سورۃ النساء، الانعام، الانبیاء، ص اور انعام میں انبیائے کرام کی فہرست میں سورۃ الانبیاء اور سورۃ ص میں مجمل ذکر ملتا ہے۔ سورۃ انبیاء میں آیا ہے کہ

ترجمہ: ''اور ایوب (علیہ السلام) کو (یاد کرو) جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی اور تو سب مہر والوں نے بڑھ کر مہر والا ہے تو ہم نے اس کی دعا سن لی تو ہم نے دور کر دی جو تکلیف اسے تھی اور ہم نے اسے اس کے گھر والے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور عطا کیے اپنے پاس سے رحمت فرما کر اور بندگی والوں کے لیے نصیحت۔''

علامہ محمد اقبال نے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر و رضا اور اطاعت گزاری سے بہت متاثر تھے۔ انھوں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ صبر، تسلیم و رضا، استغنا، بے نیازی، مصائب کے سامنے ڈٹ جانا اور حوصلہ نہ ہارنا ایسی صفات ان سے ملتی ہیں۔ علامہ محمد اقبال صبر اور حوصلے کو ''صبر ایوب علیہ السلام'' کا نام دیتے ہیں۔ توحید پر ڈٹے رہنا ہی صبر و رضا ہے۔ سیرتِ ایوب علیہ السلام کی روشنی میں علامہ محمد اقبال اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے اور ہر منزل پر توحید پر قائم رہنا، شرک سے اجتناب کرنا اور دوسروں کو اس کا احساس دلانا ضروری ہے۔

عاشق، آموز و محبوبے طلب
چشم نوحے ، قلب ایوبے طلب
(کلیات فارسی، ص ۱۸)

نہ از گریۂ پیر کنعاں تلپید
نہ از دردِ ایوبؑ آہے کشید
(کلیات فارسی، ص ۳۰۱)

ooo

حضرت الیاس علیہ السلام

حضرت الیاس علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ قرآن مجید کی دو سورتوں میں آپ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ انعام کی آیت ۸۵ میں حضرت زکریا علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آپ کا نام آیا ہے اور قرآن نے چاروں کو صالح کہا ہے۔ سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت نمبر ۱۲۳ میں آپ کو رسولوں میں شمار کیا گیا ہے، پھر آیہ ۱۲۴ سے ۱۲۹ تک آپ کا مختصر قصہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی قوم بعل نامی بت کو پوجتی تھی۔ آپ علیہ السلام نے اس کو خدائے واحد کی پرستش کے لیے کہا۔ اسی سورۃ کی آیت ۱۳۰ میں آپ علیہ السلام کو ال یاسین بھی کہا گیا ہے مگر مترجمین و مفسرین نے ال یاسین کو الیاس ہی لکھا ہے۔

آپ ہی کی صفات سے متصف ایک پیغمبر کا نام بائبل میں ایلیاہ ہے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ بائبل کے ایلیاء دراصل قرآن کے الیاس علیہ السلام ہی ہیں۔ ثعلبی اور طبری وغیرہ نے آپ علیہ السلام کے تفصیلی حالات لکھے ہیں جو زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک الیاس علیہ السلام، ادریس علیہ السلام اور خضر علیہ السلام ایک ہی شخصیت کے تین نام ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد اسرائیلی ریاست دو گروہوں میں منقسم ہو گئی تھی لیکن دونوں حصوں میں قیام پذیر اسرائیلی قبائل محکم شریعت ہونے کے باوجود بگاڑ کی راہ پر چل رہے تھے حالانکہ ہر قبیلے کی ہدایت کے لیے اسی قبیلے سے پیغمبر بھی خدا نے مبعوث فرمائے تھے۔ انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ [illegible] اور ان کا بادشاہ [illegible] سب کے سب مظاہر پرست تھے۔ اور بعل بت ان کا مشہور دیوتا تھا جس کی پوجا کے لیے مختلف مقاموں میں بڑے جشن اور جلسے منعقد ہوتے تھے۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے ہیکل، عظیم الشان قربان گاہیں قائم کی گئی تھیں [illegible]

بھال کے لیے کاہن مقرر تھے جو مختلف اقسام کی دھونی دیتے اور خوشبوئیں چڑھاتے۔ کبھی کبھی انسانی جانوں کا چڑھاوا (قربانی) بھی چڑھایا جاتا تھا۔ ان بگڑتے ہوئے حالات میں حضرت الیاسؑ رُشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمائے گئے تاکہ لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی جا سکے مگر آپؑ کی ہدایات پر بت پرست قوم نے کوئی توجہ نہ دی۔

بادشاہ نے کئی حیلے بہانوں سے حضرت الیاسؑ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے مگر سب خاک میں مل گئے۔ جب بادشاہ کا لاڈلا بیٹا بیمار ہوا تو بادشاہ نے ''بعل'' معبود سے خود دعا کی اور اس کی خدمت پر مامور چار سو خدام سے بھی دعا کروائی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ حواریوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شام کے اطراف میں بسنے والے انبیاء سے دعا کے لیے بلایا جائے کیونکہ بعل آپ سے حضرت الیاسؑ کے قتل میں کوتاہی کی وجہ سے ناراض معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ بعل کے خدمتگاروں کو ملک شام کے بتوں کے پاس بیٹے کی تندرستی کی دعا کے لیے بھیجا۔ جب وہ پہاڑوں کے سامنے سے گزرنے لگے تو بحکم الٰہی حضرت الیاسؑ نے پہاڑوں سے نکل کر پیغام توحید دیا اور شرک سے منع کیا اور انھیں بتایا کہ بادشاہ کے بیٹے کی موت یقینی ہے اور وہ آ کر رہے گی خوفزدہ حواری حضرت الیاسؑ کا پیغام سن کر وہیں سے بادشاہ کے پاس لوٹ گئے۔

عام روایات کے مطابق آپ اسرائیلی نبی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے۔ مؤرخین نے آپ علیہ السلام کا نسب نامہ الیاس بن یاسین بن فخاص بن یغرار بن ہارون لکھا ہے اور عام خیال یہی ہے کہ آپ علیہ السلام ملک شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جس طرح حضرت خضر پانی میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام خشکی پر بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شام کے شہر بعلبک کا بادشاہ ان کا معتقد تھا لیکن اس کی ملکہ اور قوم، بعل بت کی پرستار تھی انھوں نے بادشاہ کو بھی بہکایا اس پر حضرت الیاس علیہ السلام نے بددعا کی جس سے ملک میں خشک سالی اور قحط پڑ گیا۔ جب کافی عرصہ تک بارش نہ ہوئی تو حضرت الیاس علیہ السلام نے بتایا کہ یہ آپ لوگوں کی مشرکانہ حرکتوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے اپنے بتوں سے دعا کراؤ تمام بڑے بتوں کو میدان میں رکھ کر دعا کی گئی مگر بارش نہ ہوئی پھر حضرت الیاسؑ نے اپنے مومن ساتھیوں اور بعض تفاسیر میں آتا ہے کہ حضرت الیسع علیہ السلام کے ساتھ مل کر بارش کی دعا کی تو فوراً سطح سمندر سے ایک بدلی اٹھ کر آسمان پر چھا کر برسنے لگی لیکن اس معجزے کو دیکھ کر بادشاہ اور اس

کے اہل خانہ اور قوم ایمان نہ لائی بلکہ آپس میں سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص جادوگر ہے اور ماہر نجوم ہے۔ بادشاہ اور اس کی بیوی نے یہ معجزہ دیکھ کر اپنی سلطنت کے بارے میں فکر مند ہو گئے اور ایک مرتبہ پھر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو "بئر سبع" کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا اور پھر وہاں سے "جبل حوریب" کی طرف جانے کا حکم سنایا۔

وہاں پر آپ کو کبریائی حق کے جلال و جمال کے آثار کا عظیم ترین مشاہدہ کروایا گیا اور اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل کو شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ بادشاہ اور اس کی بیوی پر پوشیدہ دشمن کو غلبہ عطا کیا گیا اس نے دونوں کو مومن مزدکی کے باغ میں قتل کر دیا اور لاشوں کو ہیں چھوڑ دیا حتیٰ کہ وہ گل سڑ گئیں اور گوشت پارہ پارہ اور ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں۔

علامہ محمد اقبال نے حضرت الیاس علیہ السلام کے "کرتے" یا "الیاس" کو علامت بنا کر بتایا ہے کہ معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر شے بھی "دینِ الٰہی" کے حامل کے پاس آ کر عزت و تکریم والی ہو جاتی ہے جبکہ "غیر" کے پاس بے وقعت، گھٹیا و رذیل ہی رہتی ہے بالکل ایسے ہی عام غیر مسلم شخص بھی، دین حق اسلام کی حدود میں داخل ہو کر وقعت و قدر بن سکتا ہے اور بے قیمت سے قیمتی۔ "اشیاء کی قدر حامل اشیاء سے ہے نہ کہ قیمت سے" جیسا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے پاس آ کر "کرپاس" پر دوزخ کی آگ حرام ہو گئی اور یہودی کے کفن کا حصہ بن کر دوزخ میں جلنا اس کا مقدر ٹھہرا۔ علامہ محمد اقبال نے علامتوں اور تشبیہات کے ذریعے حضرت الیاس علیہ السلام کے واقعہ کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ کہیں علامہ نے تلمیحات کا بھی استعمال کرتے ہوئے شعروں کو سجایا ہے۔

ہمچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید و زد گر نیمہ یہودی را کفن

(کلیات فارسی، ص۷۶۴)

علامہ محمد اقبال نے حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر فارسی کلیات کے علاوہ اپنے اردو کلیات میں بھی کیا ہے۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم ، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو!

(کلیاتِ اُردو، ص۴۳۶)

○○○

حضرت سلیمان علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو لاتعداد خوبیوں سے سرفراز فرمایا۔ ذکر تخت وتاج کا ہو یا اڑن تخت کا، جن وانساں کا ملاپ ہو یا تبلیغِ دین کا حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام ذہن میں گھومنے لگتا ہے۔ علامہ اقبال ان کی خوبیوں کو بطور استعارہ پیش کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ۹۹۱ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت داوٗدؑ کے بیٹے تھے۔

والدہ کا نام بطشا بنت حنا تھا۔ بطشا اوریا کی بیگم تھیں۔ شہید ہونے کے بعد حضرت داوٗد علیہ السلام نے بطشا کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بطشا کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپ کے عہد میں ملک نے ہر اعتبار سے ترقی کی۔ کہا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو جن وانس اور حوش و طیور کا بادشاہ بنایا تھا اور ساری مخلوق آپ کے تابع تھی۔ آپ کا تخت ہوا میں اڑتا تھا اور دنیا کے خزانے آپ کے قبضے میں تھے۔ جب سلیمان علیہ السلام کا تخت نکلتا تھا اور ہوا پر چلتا تھا تو تمام پرندے ہوا کے جھنڈ ان کے تخت پر آ کر پروں کا سایہ کرتے اور فوج انسانوں کی داہنی طرف اور بائیں طرف ہوتی تھی اور تمام وحوش وطیور چپ وراست پس وپیش گرداگرد حلقہ باندھ کر ان کے ہمراہ چلتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ ''اور اکٹھے کیے گئے واسطے سلیمان علیہ السلام کے لشکر جنوں اور انسانوں اور جانوروں سے پس وہ مثل بمثل کھڑے کیے جاتے ہیں'' بعض تفسیروں میں یوں بھی لکھا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا تخت وہ تھا جس پر سب لشکر چلتا تھا اور ہوا اس کو لے کر چلتی تھی شام سے یمن اور پھر یمن سے شام تقریباً ایک ماہ کی راہ ہے لیکن ہوا اس کی مسافت کو آدھے دن میں طے کر دیتی تھی۔ یمن میں پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا گیا تا کہ اس کے استعمال سے برتن بنائیں دیگیں

بنائیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت ہوا میں اڑتا تو جہاں کہیں زمین کی تہوں میں خزانے چھپے ہوتے، زمین آواز دیتی کہ اے سلیمان یہ خزانہ لے لو اور اپنے استعمال میں لے آؤ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں کو حکم دیتے تو پورا خزانہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لیے نہایت عالیشان نہایت پر تکلف ایسا محل بنوایا تھا کہ اس کا طول و عرض چھتیس کوس کا تھا اور اس کی اینٹیں سونے چاندی کی تھیں اور اس میں یاقوت و زمرد جڑے تھے اور اس میں تقریباً سات کوشک سات سو حرموں کے واسطے اور تین سو کوشک تین سو بیویوں اور حرموں کے پاس تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک درخواست کی کہ میں تمام مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے سمجھایا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نہ مانے تو اللہ تعالیٰ نے دریا کے کنارے ایک نہایت وسیع مکان کی تعمیر کا حکم دیا۔ نہایت کشادہ وسیع و عریض مکان بنوایا گیا بڑی بڑی لمبی چوڑی دیگیں پکوائی گئیں تھیں بائیس ہزار گائیں ذبح ہوئی تھیں اور باقی اشیاء ضیافت کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے اور یہ جامع التواریخ سے لکھا گیا ہے چنانچہ کھانا تیار ہوا تو ایک مچھلی آئی اور اس نے عرض کی مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے میں سب سے پہلے کھانا کھانا چاہتی ہوں اس نے تمام کھانا ایک ہی لقمہ میں کھا لیا۔ سلیمان علیہ السلام دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ مچھلی نے کہا کہ میں روزانہ تین لقمے لیتی ہوں میرا ابھی ایک لقمہ بنا ہے ابھی مزید دو لقموں کا کھانا باقی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سجدے میں گر کے اپنی نادانی کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ ایک اور روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت ہوا میں اڑ رہا تھا آپ نے دیکھا کہ ہدہد پرندوں میں سے غائب ہے۔ ہدہد کا پتہ کیا تو اس نے خوشخبری سنائی کہ میں نے ایک قوم سبا دیکھی ہے جس میں ایک عورت حکمران ہے اس شہر کا نام سبا ہے۔ بلقیس کے تابع بارہ ہزار سردار ہیں اور ہر سردار کے تابع ایک ایک لاکھ سوار و پیادہ ہر وقت رہتے ہیں۔ اس کی قوم اس کا سجدہ کرتی ہے اور وہ سب کے سب سورج کو سجدہ کرتے تھے اور اسی کو خدا مانتے تھے۔ اور حقیقی معبود کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط لکھ کر اور سلیمانی مہر لگا کر ہدہد کی چونچ میں دیا اور وہ جا کر ملکہ بلقیس کے محل میں گیا جہاں وہ سو رہی تھی ہدہد نے وہ اس کے سینے پر رکھا اور آ گیا۔ خط میں اسے مسلمان ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ ملکہ بلقیس نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے نکاح بھی کر لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ۹۲۴ ق م کو وفات پائی۔

قرآن پاک میں آپ کی زندگی اور حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں خصوصاً ملکہ سبا بلقیس کا واقعہ مسجد اقصیٰ بھی آپ نے بنوائی تھی۔

گرچہ باشی موروہم بے بال و پر
حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

(کلیات فارسی: ص ۱۵۸)

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
زموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید

(کلیات فارسی: ص ۳۰۵)

حدیثِ عشق بہ اہل ہوس چہ میگوئی
بچشم مور مکش سرمۂ سلیمانی

(کلیات فارسی: ص ۳۰۶)

اے مسلماں دگر اعجازِ سلیماں آموز
دیدہ بر خاتم تو اہرمنے نیست کہ نیست

(کلیات فارسی: ص ۳۵۱)

ooo

حضرت ابراہیم علیہ السلام، خلیل اللہ

اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے ایک شہر اُور، عراق میں پیدا ہوئے۔ لفظ ابراہیم بعض ماہرین لسانیات کے نزدیک عبرانی ''آبرام'' یا آبراہام سے نکلا ہے پہلے لفظ کے معانی جدامجد جبکہ دوسرے لفظ کے معانی قبیلہ کا سردار کے ہیں۔ آپ کے والد آزر بت پرست اور بت فروش تھے بعض روایات میں چچا بتایا گیا ہے تاہم ابراہیم علیہ السلام بتوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس وقت وہاں نمرود کی حکومت تھی جو اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ بتوں کی پوجا چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرو۔ اس پر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دربار میں بلایا جہاں دونوں میں سوال و جواب ہوئے۔ نمرود لاچار ہوگیا اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال کر جلا دینے کا حکم دیا مگر وہ آگ خدا کے حکم سے ٹھنڈی ہوگئی۔

ارشاد ربانی ہے:

''ہم نے کہا اے آگ ابراہیمؑ پر خنک اور سلامتی بن جاؤ'' (۷۰۔ انبیاء)

ان کی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر خدا نے اس فرد واحد کو ایک امت قرار دیا کیونکہ ایک خدا ترس معاشرے اور مرکز ایمان کے اوصاف ان کے وجود میں جمع ہوگئے تھے (ابراہیمؑ ڈرنے والا) اللہ کے لیے یکسو ہونے والا ایک امت تھا (۱۲۰......النحل)

''حضرت ابراہیم بطور امت کے ایک ملت عالم وجود میں لے آئے اہل مامور ہیں کہ ان کے دین زندہ پر چلیں آخر پیغمبر خدا بھی توحید ابراہیمی کے ہی پیرو ہیں۔'' (۱۸۴: النحل)

قرآن مجید میں ان کا اسمائے گرامی ۶۹ بار ذکر ہوا ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ ابراہیم کا

ترجمہ پڑھنے سے ان کی عظمت کے کئی در وا ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی نسل سے ہی بعد میں پیغمبر آتے رہے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے بنی اسرائیل کے نبی آئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں نبی آخرالزماں ﷺ پیدا ہوئے۔ خانہ کعبہ کی بنیاد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر رکھی۔ اللہ کے حکم پر آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کر دینے کا تہیہ کیا مگر حضرت اسماعیل بچ رہے اور اللہ نے قربانی قبول کر لی۔ مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے ملت ابراہیمی بھی کہلاتے ہیں اور بڑی عید کے موقع پر قربانی بھی کرتے ہیں۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت
تا چراغِ یک محمد برفروخت (کلیات فارسی، ص۱۳)

عشق باد شوار و رزیدن خوش است
چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است (کلیات فارسی، ص۴۹)

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
توز آزر من زا ابراہیمؑ دور (کلیات فارسی، ص۵۹)

چوں ز بندِ آفل ابراہیمؑ رست
درمیان شعلہ ہانیکو نشست (کلیات فارسی، ص۶۸)

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش
قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش (کلیات فارسی، ص۷۶)

ما مسلمانیم و اولاد خلیلؑ
از ابیکم گیرا گر خواہی دلیل (کلیات فارسی، ص۹۳)

شعلۂ توحید را پروانہ بود
چوں براہیم اندریں بت خانہ بود (کلیات فارسی ، ص۹۸)

تارک آفل براہیم خلیلؑ
انبیا را نقشِ پائے او دلیل (کلیات فارسی، ص۱۰۰)

سِرِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود (کلیات فارسی، ص۱۱۱)

حق بروں آورد ایں تیغِ اصیل
از نیام آرزو ہائے خلیلؑ (کلیات فارسی، ص۱۱۹)

زانکہ مارا فطرت ابراہیمی است
ہم بہ مولیٰ نسبت ابراہیمی است (کلیات فارسی، ص۱۲۰)

دعویٰ او را دلیل استیم ما
از براہین خلیلؑ استیم ما (کلیات فارسی، ص۱۳۵)

اے کہ خور دتی زمینائے خلیلؑ
گرمی خونت ز صہبائے خلیلؑ (کلیات فارسی، ص۱۴۰)

ملتِ ماشانِ ابراہیمی است
شہدِ ما ایمان ابراہیمی است (کلیات فارسی، ص۱۶۲)

نہانش دارم از آزر نہاواں
کہ ایں سِرے زا اسرار خلیلؑ است (کلیات فارسی، ص۲۰۲)

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیمؑ معمارِ حرم شو (کلیات فارسی، ص۲۰۵)

خرد اندر سرم بت خانہ ریخت
خلیل عشق دیرم را حرم کرد (کلیات فارسی، ص۲۰۹)

خرد آتش فروزد ، دل بسوزد
ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است (کلیات فارسی،ص۲۱۲)

خلیلِ او حریف آتشے نیست
کلیمش یک شرردرجان ندارد (کلیات فارسی،ص۳۰۲)

بہ ہر زمانہ خلیل است و آتش نمرود
چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہِ حیات (کلیات فارسی،ص۳۱۴)

چہ گویمت ز مسلمان نا مسلمانے
جزایں کہ پور خلیلؑ است و آزری داند (کلیات فارسی،ص۳۴۶)

مدتے در آتشِ نمرودی سوزد خلیل
تا تہی گرد د حریش از خدا وندانِ پیر (کلیات فارسی،ص۳۶۷)

خویش را در نارِ آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیلؑ از آذر است (کلیات فارسی،ص۳۷۱)

جلوہَ اوبے کلیمؑ و شعلہَ او بے خلیلؑ
عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گراست (کلیات فارسی،ص۳۷۸)

قرأتے کز دے خلیل آید بوجد
روحِ پاک جبرئیل آید بوجد! (کلیات فارسی،ص۶۴۹)

صاحبِ سرمایہ از بس خلیلؑ
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل (کلیات فارسی،ص۶۵۲)

در گذر مثلِ کلیم از رودِ نیل
سوئے آتش گام زن مثلِ خلیل! (کلیات فارسی،ص۶۷۱)

خود حریم خویش و ابراہیم خویش
چوں ذبیح اللہ در تسلیم خویش (کلیات فارسی، ص۶۷۵)

برقیام خویش می آرددلیل
از مزاجِ ایں زمانِ بے خلیل (کلیات فارسی، ص۶۷۶)

ہر یکے ترسندہ از ذکر جمیل
ہر یکے آزردہ از ضرب خلیل (کلیات فارسی، ص۶۷۸)

در نگرآں حلقۂ وحدت شکست
آلِ ابراہیم بے ذوق الست! (کلیات فارسی، ص۶۷۹)

پیرِ روم آں صاحب و ذکر جمیل
ضربِ او را سطوتِ ضربِ خلیل (کلیات فارسی، ص۶۸۰)

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم (کلیات فارسی، ص۷۰۶)

او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ
او محمدؐ ، او کتاب و او جبرئیل (کلیات فارسی، ص۷۹۵)

باش مانندِ خلیل اللہ مست
ہر کہن بت خانہ را باید شکست (کلیات فارسی، ص۸۰۳)

در محبّت پختہ کے گردد خلیل
تانگر دد لَا سوے اِلّا دلیل (کلیات فارسی، ص۸۱۵)

دریں بت خانہ اولادِ براہیم
نمک پروردۂ نمرود تا چند (کلیات فارسی، ص۸۹۴)

خداداند کہ مانندِ براہیم
بہ نارِ اوچہ بے پروانشستم (کلیاتِ فارسی،ص۹۳۴)

بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش
زفیضِ شاں براہیمی تواں کرد (کلیاتِ فارسی،ص۹۵۷)

براہیماں ز نمروداں نترسند
کہ عودِ خام را آتش عیار است (کلیاتِ فارسی،ص۱۰۲۲)

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیمِ عشق (کلیاتِ اردو۔ص:۱۱۴)

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں (کلیاتِ اردو۔ص:۲۰۰)

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہیں اندازِ گلستاں پیدا (کلیاتِ اردو۔ص:۲۰۵)

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری (کلیاتِ اردو۔ص:۲۱۱)

ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن (کلیاتِ اردو۔ص:۲۴۰)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری (کلیاتِ اردو۔ص:۲۵۲)

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟ (کلیاتِ اردو۔ص:۲۵۷)

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل (کلیاتِ اردو۔ص:۲۵۸)

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز! (کلیاتِ اردو۔ص:۲۶۴)

خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے (کلیاتِ اردو۔ص:۲۶۸)

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے! (کلیاتِ اردو۔ص:۲۶۹)

دگر شاخِ خلیل از خونِ مانمناک میگردد
ببازِ از محبّت نقدِ کامل عیار آمد (کلیاتِ اردو۔ص:۲۷۵)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِتماشائے لبِ بام ابھی (کلیاتِ اردو۔ص:۲۷۸)

عذابِ دانشِ حاضر سے با خبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ (کلیاتِ اردو۔ص:۳۵۵)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالہ میں ہے (کلیاتِ اردو۔ص:۳۶۰)

آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی (کلیاتِ اردو۔ص:۳۶۴)

یقیں مثلِ خلیلؑ آتش نشینی!
یقیں اللہ مستی خود گزینی!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بتر بے یقینی! (کلیاتِ اردو۔ص:۴۷۳)

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبر حسینؑ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عسق! (کلیاتِ اردو۔ص:۴۰۴)

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہٰ الا اللہ (کلیاتِ اردو۔ص:۴۷۷)

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سِرّ محمد ﷺ و براہیمؑ (کلیاتِ اردو۔ص:۴۸۰)

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم (کلیاتِ اردو۔ص:۴۸۸)

ooo

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام، اللہ کے نبی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحب زادے تھے۔ بچے ہی تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو اس بنجر اور بے آب و گیاہ مقام پر چھوڑ آئے جو آج مکہ معظمہ کے متبرک نام سے یاد کیا جاتا ہے اور تمام دنیائے اسلام کا قبلہ ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مل کر یہاں اللہ کا گھر بنایا جو بیت اللہ کے نام سے مشہور ہے۔ مؤرخین کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کنیز، حضرت ہاجرہ اور ساز و سامان لیے فلسطین جا کر آباد ہوئے۔ وہ اولاد نرینہ کے خواہش مند تھے لیکن طویل عمری کی وجہ سے یہ خواہش دم توڑتی نظر آرہی تھی۔ حضرت سارہ کنیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشورہ دیا کہ وہ کنیز حضرت ہاجرہ سے شادی کر لیں اس تجویز کے مطابق حضرت ہاجرہ سے نکاح کر لیا گیا اور اولاد کی خواہش پوری ہونے کی خوشخبری سامنے آئی۔ جب حضرت سارہ کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ تین اعضا کاٹنے کی قسم کھائی حالات سے تنگ آ کر حضرت ہاجرہ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلی گئیں۔ مقررہ وقت پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضرت لوط کے محل میں جنم لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی درازی عمر کی دعا مانگی۔ تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا عندیہ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ حضرت اسماعیل کو برکت دے گا اس کی نسل بڑھے گی جس کے بارہ سردار ہوں گے۔ آپ کا تذکرہ سورۃ البقرہ، الانعام، النساء، ابراہیم، الصافات، مریم اور سورۃ الانبیاء میں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیگم حاجرہ اور شیر خوار بچے حضرت اسماعیل کو ملک شام سے کعبہ کے قریب ایک درخت کے نیچے زم

زم کے موجودہ مقام سے اوپر والے حصے پر ایک سنسان میدان میں ایک تھیلی کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر واپس چلے گئے۔ حضرت ہاجرہ نے اس پانی اور کھجوروں پر کچھ دن گزارہ کیا لیکن یہ خوراک بہت جلد ختم ہوگئی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھوک اور پیاس سے تڑپنے لگے وہ کوہ صفا پر چڑھیں اور پھر مروہ تک بھاگتی رہیں۔ اچانک ان کے کان میں ایک آواز سنائی دی کہ محسوس ہوا کہ انھیں کوئی آواز دے رہا ہے۔ شفقت پدری میں حضرت ہاجرہ نے کہا کہ اگر تم میری مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کے سامنے کھڑے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ ان کے ایڑیاں رگڑنے سے یہاں ایک چشمہ پیدا ہوگیا جو آج تک جاری ہے جسے زم زم کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں ذبح کرنا چاہا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام فوراً اس کے لیے تیار ہو گئے لیکن اللہ نے ان کو بچالیا۔ اسی وجہ سے آپ ''ذبیح اللہ'' کہلاتے ہیں۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود (کلیات فارسی، ص۱۱۱)

خود حریم خویش و ابراہیمؑ خویش
چوں ذبیح اللہ در تسلیم خویش (کلیات فارسی، ص۶۷۵)

علامہ محمد اقبال نے اردو کلیات میں بھی حضرت اسماعیلؑ کے اسمائے گرامی کو اشعار میں استعمال کیا ہے جو کہ صفحہ ۳۰۶، ۳۵۵، پر موجود ہیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی؟ (کلیات اردو، ص۳۰۶)

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل؟ (کلیات فارسی، ص۳۵۵)

OOO

حضرت خضر علیہ السلام

خضر علیہ السلام ایک پیغمبر کا لقب، اصل نام نامعلوم۔ بفتح خ، بکسر ض اور بکسر خ و بکسون، دونوں صحیح، قرآن کی سورۃ الکہف (آیت ۶۰۔۸۲) میں خدا کے ایک بندے کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور مفسّرین کی اکثریت کے نزدیک اس سے مراد حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خادم (جسے مفسّرین نے یوشع علیہ السلام لکھا ہے) کے ساتھ مجمع البحرین جارہے تھے کہ راستے میں آپ کی ملاقات اللہ کے ایک بندے سے ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اگر آپ اپنے علم میں سے کچھ مجھے بھی سکھادیں تو میں چندروز آپ کے ساتھ رہوں۔ ''بندے'' نے کہا کہ آپ جو واقعات دیکھیں گے ان پر صبر نہ کرسکیں گے۔ اگر آپ کو میرے ساتھ رہنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کی بابت سوال نہ کرنا۔ اس قول وقرار کے بعد دونوں سفر پر روانہ ہوگئے۔ راستے میں اللہ کے بندے نے چند عجیب وغریب باتیں کیں (کشتی میں سوراخ، ایک لڑکے کا قتل اور بغیر معاوضہ ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کرنا)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ ہوسکا اور آپ ان باتوں کا سبب پوچھ بیٹھے۔ اللہ کے بندے نے سبب تو بتادیا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کلام عرب میں خضر بمعنی سبزہ آیا ہے ایشیائی لوگ ان کو دریا اور صحرا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ آب حیات پینے سے عمر جاوداں پائی۔

طاقت پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیٰ ادراک را (کلیات فارسی، ص۱۶)

اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب
می نخواہد از خضر یک جام آب (کلیات فارسی، ص۲۴)

خضر و در ظلماتِ او آبِ حیات
زندہ تر از آبِ چشمش کائنات (کلیات فارسی،ص ۳۵)

می چکد آبِ خضر از تاکِ او
مرہمِ زخمِ مسیحا خاکِ او (کلیات فارسی،ص ۱۵۹)

طاقت پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسی ادراک را (کلیات فارسی،ص ۱۶)

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریک سوزو ساز بحر و بر شو (کلیات فارسی،ص ۲۰۶)

خطا را بحکمت مگرداں صواب
خضر رانگیری بدام سراب (کلیات فارسی،ص ۳۷۵)

بے پشت بو د بادۂ سر جوشِ زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم (کلیات فارسی،ص ۳۸۲)

من شکوہ خسروی اور ادہم
تخت کسریٰ زیر پائے اونہم (کلیات فارسی،ص ۱۸۷)

با سکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل ، زندگی مشکل تراست (کلیات فارسی،ص ۳۸۸)

خضرِ من! از سرم ایں بارگراں پاک انداز
خرد از گرمیٔ صہبا بگدازے نرسید (کلیات فارسی،ص ۴۲۱)

خضر وقت از خلوت دشت حجاز آید بروں
کارواں زیں وادیٔ دورودراز آید بروں (کلیات فارسی،ص ۴۶۵)

وادیٔ خوش بے نشیب و بے فراز
آبِ خضر آرد بخاکِ او نیاز (کلیات فارسی، ص ۶۷۷)

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت (کلیات فارسی، ص ۷۸۸)

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضر خجستہ پا ہوں میں (کلیات اردو۔ص: ۴۱)

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا (کلیات اردو۔ص ۹۶)

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے (کلیات اردو۔ص: ۱۲۴)

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر (کلیات اردو۔ص ۱۵۷)

تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمر دراز میں (کلیات اردو۔ص ۱۹۸)

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے (کلیات اردو۔ص ۱۰۷)

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر (کلیات اردو۔ص ۲۴۲)

نظم: خضرِ راہ

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب!
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب!
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب
دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا
اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکارا
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
کشتیٔ مسکین، و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے ؟ سلطنت کیا چیز ہے؟

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیاء کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ
خاک و خان میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟

(کلیاتِ اردو۔ص: ۲۵۵۔۲۵۷)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

(کلیاتِ اردو۔ص۲۶۲)

خضر کیوں کر بتائے ، کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

(کلیاتِ اردو،ص۳۷۸)

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم ، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو!

(کلیاتِ اردو،ص۴۳۶)

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈتا رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق؟

(کلیاتِ اردو۔ص۵۰۵)

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

(کلیاتِ اردو۔ص۶۸۴)

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

(کلیاتِ اردو۔ص۶۸۶)

ooo

خلفائے راشدینؓ

و

صحابہ کرامؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ

نبی پاک ﷺ کے وصال کے بعد ۱۱ ہجری بمطابق ۶۳۲ عیسوی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پہلا خلیفہ چن لیا گیا۔ ۳۳ ہزار صحابہ کرام نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انھیں خلیفۃ الرسول تسلیم کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۵۷۳ عیسوی میں پیدا ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے اڑھائی برس چھوٹے تھے۔ حُسنِ اخلاق، پاک بازی، راست بازی اور ایثار و قربانی ان کی شخصیت کے اہم اوصاف تھے۔ مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کر کے صدیق کا لقب پایا۔ خواتین میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مکہ امراء مکہ میں بہت معزز تھے۔ آپ کی تبلیغ سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ہجرت مدینہ کے موقع پر وہ آپ ﷺ کے یارِ غار رہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت صدیقؓ نے اپنا سب کچھ راہ خدا میں قربان کر دیا۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں بہت سے فتنے منظرِ عام پر آئے۔ آپؓ نے تدبر اور بصیرت سے بہت سے مسائل حل کیے۔ طلیحہ اسدی (اسد قبیلے کا سردار)، مسیلمہ کذاب (یمامہ کے علاقے میں بنو حنیفہ کا فرد)، اسود عنسی (یمن کا باشندہ)، سجاع (عورت) نے نبوت کے دعوے کر کے لوگوں کو راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کی۔ بنو تمیم کی سرکوبی کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے حضور پاک ﷺ کی اسلامی ریاست کو دور دور تک پھیلایا عراق، عراق کی فتح، جنگ سلاسل، جنگ ندار، جنگ دلجہ، جنگ الیس، حیرہ، جنگ فراض، جنگ بابل، شام، بصری، جنگ اجنادین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مدعیان نبوت اور منکرین زکوٰۃ کے خلاف بحرین، عمان، یمن، اور دیگر علاقہ جات میں قابل ذکر کامیابیاں حاصل کیں۔ دو سال تین ماہ دس دن دورِ خلافت میں انھوں نے رسالت مآب ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر

عمل پیرا ہوتے ہوئے انصاف و مساوات کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ وہ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ ہجری بروز پیر بمطابق ۶۳۴ عیسوی وفات پا گئے۔

یں سبق صدیقؓ را صدیق کرد
سر خوش از پیانۂ تحقیق کرد (کلیات فارسی، ص۹۵)

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری بادیدۂ صدیق اگر (کلیات فارسی، ص۱۰۱)

من شبے صدیق را دیدم بخواب
گل ز خاک راہِ او چیرم بخواب (کلیات فارسی، ص۱۵۶)

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند (کلیات فارسی، ص۱۸۸)

سروری در دینِ ماخدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است (کلیات فارسی، ص۱۹۰)

بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو
انا الحق گوے و صدیقِ خودی شو (کلیات فارسی، ص۵۶۳)

گرمئ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ (کلیات فارسی، ص۸۳۵)

عہد صدیقؓ از جمالش تازہ شد
عہدِ فاروقؓ از جلالش تازہ شد (کلیات فارسی، ص۸۵۱)

ازاں فقرے کہ با صدیق دا دی
بشورے آور ایں آسودہ جاں را (کلیات فارسی، ص۹۲۰)

نظم: حضرت ابوبکر صدیقؓ

اک دن رسولِ پاک نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہ حق میں جو ہوں تم میں مالدار

ارشادِ سن کے فرطِ طرب سے عمر اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار

دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیق سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

لائے غرض کہ مال رسول امیں کے پاس
ایثار کی ہے دستِ نگر ابتدائے کار

پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار

رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنی خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملت بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبّت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار

ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضور چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار

اے تجھ سے دیدہ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوین روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس!

(کلیات اردو۔ص ۲۲۴)

اے کہ نشناسی خفی راز جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش! (کلیاتِ اردو۔ص ۲۶۶)

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے (کلیات اردو۔ص ۴۱۶)

ooo

حضرت عمر فاروقؓ

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا۔'' اس فرمان سے حضرت عمر فاروقؓ کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ، نبی پاک ﷺ سے تقریباً گیارہ سال چھوٹے تھے۔ آپؓ کے والد کا نام خطاب تھا۔ آپؓ کی شریکِ سفر ہشام بن مغیرہ کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام کے بعد مسلمان کھلے عام عبادت کرنے لگے اور اسلام سورج کی کرنوں کی طرح پھیلنے لگا۔ اسلام کی سربلندی اور بقا کے لیے آپؓ کی خدمات لازوال ہیں۔ جرأت، شجاعت، ایثار و قربانی، رعب و دبدبہ آپؓ کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ کفار آپؓ کے نام سے کانپتے تھے۔ آپؓ کی شخصیت اور گفت گو سے کفارِ مکہ خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد 21 جمادی الثانی 13 ہجری (634 عیسوی) حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آنحضرت ﷺ نے آپؓ کے لیے خصوصی دعا مانگی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ نبوت کے چھٹے سال وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اُن کی جرأت و بہادری کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے آپ کو فاروق کا لقب دیا۔ فاروق کا مطلب حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔ مقبوضہ ممالک کو آٹھ نئے صوبوں مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، فلسطین اور مصر میں تقسیم کیا۔ کچھ عرصہ بعد فلسطین اور مصر کو مزید دو صوبوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایران کے قدیم صوبے جو نوشیروانی، دور سے کام کر رہے تھے انھیں بحال کر دیا۔ خراسان، آذربائیجان اور فارس صوبوں کو بہت سے اضلاع اور تحصیلوں میں تقسیم کر کے نظام حکومت کو بہتر بنایا۔

آپؓ نے اسلامی ریاست میں جو اہم اقدامات کیے اُن کی جھلکیاں آج بھی نظر آتی ہیں۔ آپؓ نے افسرِ خزانہ، قاضی، بیت المال، محکمۂ پولیس، خفیہ پولیس، جیل خانہ، کرنسی اور خارجہ امور کی طرف خاص توجہ دی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ انھوں نے تمام صوبوں کے گورنرز کو ہدایت جاری کی کہ وہ صحت مندانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حکومت میں شامل لوگوں اور عوام کو فوجی تربیت، تلوار چلانے کی تربیت، نیزہ بازی حتٰی کہ شعر و سخن میں دل چسپی لینے کا حکم دیا۔ آپؓ کی شخصیت میں قوتِ فیصلہ، انصاف اور مساوات شامل تھی۔ عدل و انصاف کا معیار آج بھی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ فوجی اعتبار سے زیادہ تر فتوحات آپؓ کے دور میں ہوئیں۔ اردگرد کے بہت سے علاقے اسلامی ریاست میں شامل کر لیے۔ غیر مسلم جرنیل بھی آپؓ کی فتوحات سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ آج پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے مرادِ رسول ﷺ، حضرت عمرِ فاروقؓ کی حکمتِ عملی سے فیض یاب ہونے کی ضرورت ہے۔ آپؓ کا سنہری دور تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یکم محرم کو عالمِ اسلام میں آپؓ کا یومِ شہادت منایا جاتا ہے۔

اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار	ارشاد سن کے، فرط طرب سے عمرؓ اٹھے
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار!	پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ

(کلیات اردو، ص۲۲۴)

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی! (کلیات اردو، ص۶۴۱)

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ
الحذر از منت غیر الحذر (کلیات فارسی، ص۲۳)

عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد
حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد (کلیات فارسی، ص۵۲)

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذر می شود (کلیات فارسی، ص۹۲)

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند (کلیات فارسی، ص۱۸۸)

سروری در دینِ ما خدمت گری است
عدلِ فاروقی ، و فقرِ حیدری است (کلیاتِ فارسی، ص ۱۹۰)

اے نخیلِ دشت تو بالندہ تر
برنخیزد از تو فاروقے دگر؟ (کلیاتِ فارسی، ص ۶۸۵)

گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ (کلیاتِ فارسی، ص ۸۳۵)

عصر خودرا بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں روح عمرؓ (کلیاتِ فارسی، ص ۸۳۷)

عہدِ صدیق از جمالش تازہ شد
عہد فاروق از جلالش تازہ شد (کلیاتِ فارسی، ص ۸۵۱)

من حضورِ آں شہ والا گہر
بے نوا مردے بدر بار عمرؓ (کلیاتِ فارسی، ص ۸۵۸)

نگاہ ے وام کن از چشمِ فاروق
قدم بیباک نہ در عالمِ نو! (کلیاتِ فارسی، ص ۹۴۴)

بگو فاروق را پیغام فاروق
کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز! (کلیاتِ فارسی، ص ۹۶۰)

درونِ خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دل فاروق کشتند (کلیاتِ فارسی، ص ۹۶۲)

تو میدانیٔ کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را (کلیاتِ فارسی، ص ۹۷۶)

OOO

حضرت عثمان غنیؓ

حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرِ فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے خلیفہ سوم کی حیثیت سے اسلامی ریاست کا انتظام سنبھالا۔

حضرت عثمانؓ اسلامی تاریخ میں فراخ دلی اور انسانیت کی خدمت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ شہنشاہ کائنات ﷺ کی دو بیٹیاں حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ حضرت عثمان غنیؓ کے نکاح میں رہیں اس لیے حضرت عثمان غنیؓ ''ذوالنورین'' کے نام سے بھی مقبول ہوئے۔ ذوالنورین کا مطلب دو نور رکھنے والا ہے۔ سخاوت کی وجہ سے آپؓ کا لقب ''غنی'' بھی ہے۔

حضرت عثمانؓ، عفان ابی العاص کے فرزند تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ شفیق، صابر، تحمل مزاج، نرم خو، خدا ترس، اور رحم دل تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ اپنے کاروبار تجارت کی وجہ سے اہلِ قریش میں بہت معزز اور مال دار تصور کیے جاتے تھے جو کوئی آپ سے سخت لہجے میں بات کرتا تو آپ نرمی اور پیار سے جواب دیتے۔ مال و دولت کو خدا کی راہ میں لٹانے والوں میں سے تھے۔ کبھی حرص و لالچ نہ کیا بل کہ جو کچھ بھی کمایا راہ خدا میں دے دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ ان کی فیاضی اور دریا دلی کے بہت چرچے ہوئے۔ بیس ہزار روپے میں ایک کنواں خرید کر انسانوں کے لیے وقف کیا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ایک جنگ میں تیرہ ہزار سپاہیوں کے لیے اپنی جیب سے ساز و سامان خریدا۔

آپؓ کی سخاوت کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مدینہ میں قحط پڑ گیا۔ آپؓ نے خوراک کا ایک بہت بڑا ذخیرہ خرید کر غربا میں تقسیم کر دیا۔ وہ، آنحضرت ﷺ سے عمر میں چھ سال چھوٹے

تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تبلیغ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یادر ہیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے بہا دولت سے نوازا تھا جو انھوں نے اسلام کے فروغ میں صرف کی۔ ان کی سخاوت اور دریا دلی سے کسی کو انکار نہیں تھا ان کا نصف دور پر سکون گزرا، تجارت اور سلطنت کی حدود میں اضافہ ہوا۔ حضرت عثمان غنیؓ چوں کہ نرم مزاج، صلح جو شخصیت کے حامل تھے اس لیے بہت سی بغاوتوں نے سر اٹھالیا۔

حضرت عثمانِ غنیؓ نے مخالفین کی سرگرمیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں کئی فتوحات ہوئیں۔ خصوصی طور پر شمالی افریقہ، طرابلس، تیونس، مراکش، الجزائر، قبرص، ایران اور کئی دوسرے علاقے اسلامی سلطنت کا حصہ بنے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے بحری فوج اور اسلامی بیڑے کی بنیاد رکھی۔ آپؓ کے دور میں یہ بحری بیڑہ مکران تک پہنچا جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی فاتحین نے اُس دور میں ہمارے موجودہ خطے کو سعادت بخشی۔

آپؓ کی شخصیت اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کا جذبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اگر آج بھی امیر لوگ، حضرت عثمان غنیؓ کی طرح سخاوت کریں تو مسلمان ممالک سے غربت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ دولت آنی جانی چیز ہے اسے جمع کرنا فضول ہے۔ ہمیں دوسروں کے دکھ سکھ میں شرکت کرنے کے علاوہ اپنے مال سے بھی اُن کی مدد کرنی چاہیے۔

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

(کلیات اردو، ص ۲۰۴)

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری!

(کلیات اردو، ص ۳۵۲)

OOO

حضرت علیؓ، بوتراب، شیر خدا

آپؓ کا نام ''علی بن ابی طالب'' اور کنیت ''بوالحسن وابوتراب'' ہے آپ سرکار قدس ﷺ کے چچا ابوطالب کے صاحبزادے ہیں یعنی حضور ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں آپؓ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہے اور یہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر کے ہجرت فرمائی۔ آپؓ بروز جمعۃ المبارک ۱۳ رجب کو واقعہ فیل کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئے۔ بعض مؤرخین نے تیرہ برس بھی تحریر کیا ہے اور اعلان نبوت سے پہلے ہی مولائے کل سید الرسل جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی پرورش میں آئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نوعمر لوگوں میں سب سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ دس سال تھی۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے والد تھے۔ خلفائے راشدین میں چوتھے خلیفہ تھے۔ آپؓ نے خلافت کی ذمہ داری ۳۵ھ یا ۳۶ھ میں سنبھالی اور پانچ سال تین ماہ تک آپ خلیفہ رہے۔ بعض روایات میں چار سال ۹ ماہ یہ مدت بتائی گئی ہے۔ بروز دوشنبہ ۲۵ رمضان المبارک ۴۵ھ میں آپؓ نے وصال فرمایا۔ مستند روایات کے مطابق ۱۹ رمضان المبارک کو مسجد کوفہ میں ابن ملجم نے جب آپؓ سجدہ میں تھے سر پر زہر میں ڈبائی تلوار سے شدید ضرب لگائی ۲۱ رمضان کو شہادت ہوئی۔ نجف اشرف میں تدفین ہوئی۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور حضرت علیؓ کی قبور ایک ہی گنبد میں ہیں۔ بعض مورخین نے تاریخ وفات ۲۳ رمضان المبارک تحریر کی ہے۔ آپ نے ۶۳ یا ۶۵ سال عمر پائی۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغرب سے سورج کا رخ دوبار پھیرا ایک بار نبی معظم حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ میں اور دوسری بار آپؓ کی رحلت کے بعد۔ نجف اشرف میں

آپؒ کا مزار مبارک ہے۔

''شواہد النبوۃ'' میں تحریر ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو وصیت فرمائی کی میری رحلت کے بعد میری میت کو نجف میں غزنین کے مقام پر لے جانا وہاں ایک سفید پتھر ہوگا جس سے روشنی پھوٹ رہی ہوگی وہ روشن پتھر ہٹاؤ گے تو اس کے نیچے ایک گڑھا دکھائی دے گا مجھے اس میں سپر خاک کرنا۔ حدیث مبارکہ ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ اے علی میرے لیے تو ایسا ہی ہے جیسے موسیٰ کے لیے ہارون مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔''

علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کرام کے بعد خلفائے راشدین کا مقام سب سے بلند ہے۔

مرسل حق کرد نامش بو تراب
حق یداللہ خواند در ام الکتاب (کلیات فارسی، ص ۴۷)

ہر کہ در آفاق گردد بو تراب
باز گرداند زمغرب آفتاب (کلیات فارسی، ص ۴۸)

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی (کلیات اردو: ص ۵۹)

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے (کلیات اردو: ص ۲۰۴)

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری! (کلیات اردو: ص ۲۵۲)

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری (کلیات اردو: ص ۲۵۳)

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ، ہشیار باش! (کلیات اردو: ص ۲۶۶)

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ فقر بوذرؓ صدقِ سلیمانیؓ! (کلیات اردو: ص ۲۷۰)

نہ خدا رہا نہ صنم رہے نہ رقیب دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللہی نہ کہیں ابولہبی رہی (کلیات اردو: ص ۲۸۲)

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوے حیدرؓ بھی عطا کر (کلیات اردو: ص ۳۰۱)

دار و اسکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدؓ اللہی! (کلیات اردو: ص ۳۴۹)

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و باطل
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے (کلیات اردو: ص ۳۵۶)

یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ! (کلیات اردو: ص ۳۶۰)

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی! (کلیات اردو: ص ۳۷۵)

کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق! (کلیات اردو: ص ۳۷۹)

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے (کلیات اردو: ص ۴۱۶)

دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پورِ علیؓ زبو علی چند (کلیات اردو: ص ۴۸۱)

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ! (کلیات اردو: ص ۴۸۹)

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک (کلیات اردو: ص ۵۸۵)

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری (کلیات اردو: ص ۶۳۳)

ooo

حضرت ابوذر غفاریؓ

حضرت ابوذر غفاری مشہور صحابی اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ اوران کا فقر ضرب المثل، قناعت قابل تقلید اوران کی قلندری بے مثال ہے۔ اقبال مردِ مومن کی جو خصوصیات بیان کرتے ہیں ان میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نبی پاک ﷺ ان کے مشوروں کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری کی زندگی تغیّر و تبدل کا شکار رہی۔ وہ قبیلہ بنو غفار سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلے کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے بھی رہزنی کا پیشہ اختیار کرلیا لیکن شرک اور بت پرستی سے نفرت کرتے تھے جب رسول اکرم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو مکہ پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہوئے حضور کے وصال تک مدینہ میں رہے پھر شام چلے گئے۔ وہاں کے مسلمانوں میں دولت کی ہوس کی برملا مخالفت کی جس سے شام کے امراء ان کے مخالف ہوگئے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو واپس بلایا۔ انھوں نے ایک گاؤں میں اقامت اختیار کی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کا وظیفہ مقرر کیا لیکن انھوں نے یہ وظیفہ وصول کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے حضور ﷺ سے شیخ الاسلام کا لقب پایا۔ ابوذر غفاری سرمایہ داری کے سخت خلاف تھے۔ فقر و استغنا کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے مقبول ترین انسان تھے۔ جب انسان فقر کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے تو تسخیر کائنات کا عمل بہت آسان نظر آتا ہے۔ انھوں نے دنیوی اسباب و آسائش سے بالاتر ہو کر زندگی گزاری۔ انھوں نے اپنی ذات کو اسلام کے لیے وقف کردیا اور نگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں قدر پالی۔ اصول فطرت ہے کہ جو شخص محبوب الٰہی سے پیار کرتا ہے، کائنات کی نظر میں مقبول ہو جاتا ہے۔ آج حضرت ابوذر غفاریؓ ہم سب کے لیے انسان دوستی کی علامت ہیں۔

اسود از توحید احمری شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود (کلیات فارسی، ص۹۲)

نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلق بلالؓ و قنبرؓ است (کلیات فارسی، ص۱۰۶)

ہم فقیرے ، ہم شہِ گردوں فرے
اردشیرے بار وانِ بوذرؓے (کلیات فارسی، ص۱۹۰)

چوں ابوذر خود گداز اندر نماز
ضربتش ہنگام کیں خارا گداز (کلیات فارسی، ص۸۵۱)

بایزید و شبلی و بوذر ازوست
امتاں را طغرل و سنجرا زوست (کلیات فارسی، ص۷۸۰)

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ توحیدؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلیمانیؓ! (کلیات اردو۔ص۲۷۰)

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بُوذر و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؑ؟ (کلیات اردو۔ص۳۱۵)

ooo

حضرت ایوب انصاریؓ

حضرت ایوب انصاریؓ، رسول اللہ ﷺ کے ایک مشہور صحابی ہیں، ان کا اصل نام خالد بن زید تھا لیکن کنیت ''ابوایوب'' اتنی مشہور ہوئی کہ لوگوں کو آپؓ کا اصل نام بھول گیا اور ابوایوب انصاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابوایوبؓ خزرج کے خاندان بنو بخار سے تعلق رکھتے تھے جو رسول اکرم ﷺ کے نانہالی رشتہ دار تھا ان کا سلسلۂ نسب خالد بن زید بن کلب بن ثعلبہ بن عبد عوف خزرجی ہے۔ حضرت ابوایوبؓ کی والدہ کا نام ہند بنت سعد خزرجی تھا جو حضرت ابوایوبؓ کے والد زین بن کلب کی ماموں زاد بہن تھی۔ حضرت ابوایوبؓ، ہجرت نبوی سے اکتیس برس قبل ۴۰ عام الفیل میں یثرب میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار انصار کے سابقون الاولون میں ہوتا ہے وہ حضور ﷺ کے مدینہ منورہ میں نزول فرمانے سے پہلے ہی حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغی کوششوں کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ پہنچے تو اس کے باشندوں نے ادب و احترام اور عقیدت و محبت سے ان کا استقبال کیا۔ ہر آنکھ آپ کو دیکھنے کے لیے فرش راہ تھی۔ بڑے بڑے سردار آپ کے استقبال کے لیے منتظر تھے۔ سردار کہتے اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ہمارے ہاں قیام کریں، ہم آپ ﷺ کی خدمت بھی کریں گے اور حفاظت بھی کریں گے مگر اللہ کے رسول نے کہا اونٹنی جہاں جا کر بیٹھے گی وہیں قیام ہوگا۔ اونٹنی چلتی رہی چلتی رہی بالآخر وہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے آ کر بیٹھ گئی یہ دیکھ کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کا دل فرحت و انبساط سے لبریز ہو گیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کا استقبال کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ لپکے۔ انھوں نے آپ ﷺ کا سامان اٹھالیا اور خوشی خوشی اپنے گھر میں اس طرح لائے جیسے دنیا کا قیمتی ترین خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو۔ ابوایوب انصاریؓ کا مکان

دو منزلہ تھا حضور اکرم ﷺ نے نچلی منزل میں رہنا پسند فرمایا حضرت ابوایوبؓ نے آپ ﷺ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور آپ ﷺ کو اسی جگہ ٹھہرایا جسے آپ ﷺ نے پسند فرمایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ اور ان کی بیوی اُوپر والی منزل پر چلے گئے معاً انھیں خیال آیا کہ حضور اکرم ﷺ نیچے اور ہم ان کے اوپر یہ بے ادبی ہوگی لہٰذا وہ مکان کے ایسے کونے میں چلے گئے جس کے بارے میں علم تھا کہ یہ حضور اکرم ﷺ کے اوپر نہیں ہے۔ چلتے بھی تو کنارے کنارے چلتے۔ حضور اکرم ﷺ سات مہینے ان کے ہاں قیام پذیر رہے۔ ایک رات پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا تو انھیں فوراً خیال آیا کہ کہیں پانی ختم المرسلین حضرت مصطفیٰ ﷺ کے اوپر نہ ٹپکے اس پانی کو جذب کرنے کے لیے انھوں اپنے اکلوتے کمبل سے جذب کرنا شروع کر دیا۔ سات ماہ کے بعد ان کے مکان کے سامنے خالی پلاٹ میں جہاں آ کر اونٹنی بیٹھی تھی ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ مسجد کے اردگرد آپ ﷺ کے اور ازواجِ مطہرات کے لیے جو لے بنائے گئے تھے اور آپ ﷺ، حضرت ابوایوبؓ کے پڑوس میں رہنے لگے۔ کتنے اچھے اور شریف پڑوسی تھے جو ان دونوں کو میسر آئے۔

ایک موقع پر حضرت ابوایوب ﷺ نے رات بھر کاشانہ نبوی ﷺ پر پہرہ دیا۔ صبح ہوئی تو سرورِ عالم ﷺ نے ان کے حق میں دعا مانگی ''اے ابوایوبؓ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے کہ تم نے اس کے نبی ﷺ کی نگہبانی کی۔'' یہ حضور ﷺ کی دعا کا اثر تھا کہ حضرت ابوایوبؓ زندگی بھر مصائب و آلام سے محفوظ رہے اور وفات کے بعد صدیوں تک نصاریٰ ان کی قبر کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہے۔ ان کا مدفن قسطنطنیہ ہی مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ آج بھی ترکی کی حکومت ان کی قبر کی نگران ہے اور وہاں عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے

قسطنطنیہ (استنبول) کی لڑائی میں اسلامی فوج کے ساتھ گئے اور وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ایک سو پچاس احادیث مروی ہیں۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی سیرت کے کسی بھی باب پر نظر ڈالیں آپ کیف و سرور کے ایسے چمن زار میں پہنچ جائیں گے جس کے گل ہائے رنگا رنگ سے آپ کی آنکھوں کو طراوت حاصل ہوگی۔ آپؓ سچے عاشق رسول ﷺ اور بے پناہ محبت کرنے والے صحابی تھے۔ نبی ﷺ کے لیے جان کی پرواہ نہ کرنے والے صحابی کی قبر آج بھی منور اور بحفاظت ہے۔ ان کی قبر پر ہزاروں مسلمان عقیدت واحترام سے حاضری دیتے ہیں۔
علامہ محمد اقبال نے بھی ان کی رسول پاک ﷺ سے لازوال محبت کو دیکھتے ہوئے ان کا

اپنے کلام میں تذکرہ کیا ہے۔

نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربت ایوبِ انصاریؓ سے آتی ہے صدا

(کلیات اردو، ص ۱۴۶)

ooo

کلامِ اقبال

حضرت اویس قرنیؒ

حضرت بلال حبشی اور حضرت اویس قرنیؒ کے پیمانۂ عشق تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔لفظ ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے تہی دست محسوس ہوتے ہیں۔حضرت بلال کے عشق کی داستانیں مختلف حوالوں سے ادب میں موجود ہیں۔حضرت اویس قرنیؒ عشق رسول ﷺ میں مستغرق ہوکر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ نبی پاک ﷺ نے ان کے اس جذبہ کو سراہتے ہوئے ان کے لیے تحفہ عقیدت (خرقہ) بھی بھیجوایا۔حضرت اویس قرنی کا تعلق قبیلہ قرن سے تھا جو کہ نجد میں واقع ہے۔ان کی تعریف حضور اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔حضرت اویس قرنیؒ زیارت رسول ﷺ سے مستفیض نہ ہو سکے۔ حضرت اویس قرنی اپنی والدہ جو کہ بہت زیادہ ضعیف تھیں کی شبانہ روز خدمت میں رہتے تھے۔ایک اور وجہ یہ تھی کہ آپ جذب کی کیفیت میں رہتے۔ان کا پیشہ شتربانی تھا اس کی آمدن سے گزربسر کرتے تھے۔

غزوۂ احد میں رسول پاک ﷺ کے دانت شہید ہو گئے تو آپؓ نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے اس لیے کہ میرے محبوب کے دانت ٹوٹے ہیں تو میرے سلامت کیوں رہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے وصال سے قبل وصیت فرمائی کہ میری کالی کملی اویس قرنیؒ تک پہنچانا اور اسے کہنا کہ میری امت کی مغفرت کے لیے دعا کرے۔حضور اکرم ﷺ کی یہ وصیت حضرت فاروق اعظمؓ نے اویس قرنیؒ تک خرقہ پہنچایا اور امت کے لیے دعا کی استدعا بھی کی۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا کی بدولت ربیعہ اور مفر کی بھیڑون کے بالوں کی تعداد سے زیادہ سرورِ کونین ﷺ کی امت کی بخشش فرمادی اور امت کی تعداد میں اضافہ فرمایا۔

آپؒ کا وصال ایک روایت کے بموجب ۳۲ھ بمطابق ۳ رجب اور دوسری روایت کے مطابق ۳۷ھ میں ہوا۔ حضرت اویس قرنیؓ کے وصال کے بارے میں ''شواہ النبوۃ'' میں درج ہے کہ عرار میں جو آذربیجان کا علاقہ ہے آپ کا وقت آخر تھا تو لوگوں نے آپؒ کی قبر کھودنا چاہی وہاں ایک چٹان پر قبر بنی ہوئی مل گئی جب کفن پہنانے کے ارادہ کیا تو ایسے عمدہ اور صاف کپڑے دستیاب ہوئے جو انسانی ہاتھوں سے بنے ہوئے نہ تھے چنانچہ ان ہی میں آپ کو کفنا کر دفن کیا گیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں ان کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بو ذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا؟

ooo

حضرت بلالؓ

حضرت بلالؓ پہلے موذن اسلام تھے ان کی آواز بہت پر سوز تھی ۵۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ صحابی رسولؐ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ حضرت بلالؓ کے والد کا نام رباح تھا۔ آپؓ نسلاً حبشی تھے۔ ابتدائی دور میں ہی اسلام قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ دور غلامی میں صرف اس وجہ سے ان پر مظالم ڈھائے گئے کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور آقا انہیں اسلام چھوڑنے کو کہتے مگر آپ انکار کر دیتے۔ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ جلتے ہوئے انگاروں پر لیٹایا گیا کوڑے برسائے گئے مگر آپ نے اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے آپؓ کو خرید کر آزاد کیا۔ ہمیشہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں رہے اور تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جب آنحضرت ﷺ نے نماز سے قبل اذان دینے کا طریقہ پسند فرمایا تو پہلے موذن حضرت بلالؓ منتخب ہوئے۔ ۶۰ سال کی عمر میں، دمشق میں انتقال کیا۔ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد شام کی جنگ میں شریک ہوئے۔

از تہید ستاں رخ زیبا مپوش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
(کلیات فارسی، ص۷۶)

نعرہ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلق بلالؓ و قنبرؓ است
(کلیات فارسی، ص۱۰۶)

نظم: بلالؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چُھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورت سلمانؓ ادا شناس تری
شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید
خنک دے کہ تپید و دے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ نا شکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر
تپش زشعلہ گرفتند و بردلِ تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصلِ تو زدند
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری

کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا ایک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا!
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا!

(کلیات اردو: ص ۸۰)

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں!

(کلیات اردو: ص ۱۶۸)

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

(کلیات اردو: ص ۲۰۳)

گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

(کلیات اردو: ص ۲۰۷)

نظم: بلالؓ

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جو لانگہ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تراس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلک نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلال وہ حبشی زادہ حقیر
فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینہ بلال
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

(کلیات اردو: ص ۲۴۱)

ooo

حضرت سلمان فارسیؓ

صحابی رسول تھے۔ مجوسی نام مابہ تھا لقب سلمان الخیر ابو عبداللہ۔ وطن اصفہان خاندان آب الملک، والد اصفہان میں زمیندار تھے مذہباً مجوسی (آتش پرست) تھے۔ ایران کے ایک آتش پرست خاندان سے تھے۔ ان کا والد آتش کدہ کا منتظم تھا۔ روحانی سکون کے لیے بعد میں آپ نے عیسائی مذہب قبول کیا لیکن جب پتہ چلا کہ عرب میں توحید کی آواز بلند ہوئی ہے تو مدینہ پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ یہ غلام تھے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے زرِ کفالت ادا کر کے آزاد کرایا۔ انھوں نے غزوہ احزاب میں حصہ لیا اور مدینہ منورہ کے گرد خندق انہی کے مشورے سے کھودی گئی۔ کیونکہ حضرت سلمانؓ ایران میں یہ طریقہ جنگ دیکھ چکے تھے چنانچہ اسی خندق کے طفیل مسلمان کامیاب ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران پر فوج کشی ہوئی، جس میں انھوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کی فتح کے بعد مدائن کے گورنر مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں فوت ہوئے اور مدائن میں ہی ۳۳ھ میں دفن ہوئے۔ حضرت سلمان کو حضور ﷺ سے بڑی محبت تھی۔ وہ زیادہ تر رسول اللہ ﷺ کے قریب رہنا پسند کرتے تھے ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ حضرت سلمانؓ کی مذہب اسلام سے شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے ان کے خاندان کے متعلق پوچھا جاتا تو فرماتے کہ میں سلمان بن اسلام ہوں۔

فارغ از باب و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش (کلیات فارسی: ص۱۶۲)

عشق را آئین سلمانی نماند
خاک ایراں ماند و ایرانی نماند (کلیات فارسی:ص۱۸۸)

در امارت فقر را افزودہ اند
مثلِ سلمانؓ در مدائن بودہ اند (کلیات فارسی:ص۱۹۰)

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
رستخیزے برعرب آوردہ است (کلیات فارسی:ص۶۴۳)

ایں سلمانی است ، آں سلمانی است
آں سراپا فقر و ایں سلمانی است (کلیات فارسی:ص۷۸۰)

ز سیما ے کہ سو دم بر در غیر
سجودے بوذرؓ و سلمانؓ نیاید (کلیات فارسی:ص۶۴۳)

ooo

حضرت امام حسینؓ

یوں تو مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ قربانیوں سے بھری پڑی ہے لیکن جو قربانی ۱۰ محرم کو فرات کے کنارے دشت کربلا میں حضرت امام حسینؓ نے پیش کی، تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ نواسۂ رسولؐ نے جو قربانی دی وہ وقت کی پیشانی پر قیامت تک جھومر کی طرح لہراتی رہے گی۔ امام عالی مقامؓ کے جانثار ساتھی خوش قسمت تھے جنھیں نواسۂ رسولؐ کی قربت حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی مسلمانوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ زبان پر مرثیے ہوتے ہیں اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ دل قاتلان حسینؓ پر لعنت بھیجتا ہے، اس طرح اس خونی داستان کی یاد ہر سال منائی جاتی ہے۔ محسن انسانیت ﷺ کو اپنے دونوں نواسوںؓ سے بہت محبت تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا حسنؓ اور حسینؓ جوانان بہشت کے سردار ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ''حسینؓ مجھ سے اور میں حسینؓ سے ہوں''، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت نے حسینؓ کا ایسا امتحان لیا جس میں انھوں نے حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے کے لیے اپنی متاعِ گراں بھی قربان کر دی۔ یزید نے جب مسلمانوں کے مختلف گروہوں سے بیعت کا سلسلہ شروع کیا تاکہ شخصی حکومت کو مستحکم کرے تو بسترِ مرگ پر حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کو نصیحت کی کہ وہ نواسۂ رسول کے ساتھ صلح و آشتی سے رہے اور ان کے ادب و احترام میں کمی نہ آنے دے لیکن یزید نے اس کے برعکس کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی آمریت کا دور دورہ ہوا۔ حکومت چند مفاد پرست لوگوں کے ہاتھ آ گئی، شراب و کباب اور طاؤس و رباب کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ پازیب کی جھنکار اور عیش و نشاط عام ہو گئے۔ یوں تو یزید کی تخت نشینی ہی اسلامی جمہوریت کے خلاف تھی لیکن حکومت کے طور طریقوں

نے اسلامی روایات اور ثقافت کو بالکل مسخ کر دیا۔ یزید نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے امام حسینؓ کو عزت و حشمت اور عہدے کا لالچ دے کر ان کی آواز حق دبانے کی بھرپور کوشش کی لیکن حضرت امام حسینؓ نے ہر پیشکش ٹھکرا دی اور باطل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امام حسینؓ جن کی پرورش تاجدارِ عرب و عجم ﷺ نے فرمائی تھی، جنھیں آنحضرت ﷺ کندھوں پر بٹھایا کرتے تھے، جو حضرت علیؓ شیرِ خدا کے فرزند تھے، انھوں نے بیعت کرنے کا اعلان سنتے ہی اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا اور بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت امام حسینؓ امن و سلامتی کے داعی تھے۔ انھوں نے پر آشوب دور میں اپنا وطن مدینہ چھوڑ کر مکہ معظمہ ہجرت کی لیکن یزید نے حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے تاکہ وہ حضرت امام حسینؓ کو دارلاحق میں ہی ختم کر دیں، جہاں قتال حرام ہوتا ہے۔ یزید کی اس سازش کا علم حضرت امام حسینؓ کو ہو گیا۔ 3 ذی الحجہ 60 ہجری یعنی 680 عیسوی کو آپؓ مکہ سے عراق کی جانب روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی یزید کی فوج نے آپؓ کو روک لیا اور بیعت کا مطالبہ دہرایا۔ آپؓ نے پھر انکار کر دیا، اسی طرح آپؓ کو 2 محرم 61 ہجری کو کربلا جیسی بے رونق جگہ پر ٹھہرنا پڑا۔ جانثاروں کے اس قافلے کے سامنے عراق کی مشہور چھاؤنی، کوفہ سے بھاری تعداد میں فوج جمع کر دی گئی، جس کی تعداد کم و بیش 30 ہزار تھی۔ حق کے یہ پروانے یادِ خدا میں مصروف رہے لیکن یزیدی لشکر کی طرف سے طرح طرح کی اذیتیں شروع ہو گئیں۔ بالآخر 10 محرم 61 ہجری 16 اکتوبر 680 عیسوی بروز جمعۃ المبارک کو یزیدی لشکر نے حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ حسینؓ کے ساتھیوں نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا، ایمان و ضمیر کی قوت نے رنگ دکھایا اور انھوں نے جبین شرف باطل کے در پر جھکانے کے بجائے اپنے سروں کی قربانی دی۔ جانثاری کی جو اعلیٰ مثال ان کے ساتھیوں نے پیش کی وہ بے مثال ہے اور ناقابل فراموش ہے۔

المختصر دین اسلام کے احیاء کے لیے حضرت امام حسینؓ نے میدان کربلا میں جو بے مثل شہادت کی رسم ادا کی اس پر فرشتے بھی عش عش کر رہے ہوں گے۔ کربلا کا ذرہ ذرہ اس عظیم قربانی کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا رہا۔ انھوں نے بڑی جرأت و شجاعت سے یزیدی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے حق و صداقت کا پرچم بلند کیا آپؓ نے اپنا سر دے کر حق کا بول بالا کیا۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنے کردار و عمل سے یہ بات ثابت کر دی کہ حق پرست انسان مادی ترقی، اسلحہ کی کثرت یا تعداد کی فراوانی سے نہیں گھبراتا۔ اس کے عزائم کو مادی اسباب پست نہیں کر سکتے۔ امام حسینؓ نے اپنا خاندان راہ حق

پر قربان کر دیا اگر وہ اس وقت خاموش رہتے تو قیامت تک کے لیے غلط نظیر قائم ہو جاتی۔ غلط نظام حکومت کی وجہ سے اسلام کو نقصان پہنچتا۔ یہ قربانی ہمیں سبق دیتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نظامِ حیات کے اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو ان اصولوں کے تحفظ کے لیے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ سانحۂ کربلا اپنے دامن میں یقین و ایمان کا عظیم سرمایہ رکھتا ہے۔ حضرت حسینؓ جذبہ جہاد کی عملی تصویر تھے۔ آپؓ نے جہاد کا جو انداز اختیار کیا' تاریخ انسانی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت امام حسینؓ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا زریں طریقہ یہ ہے کہ ہم آپؓ کی حیاتِ طیبہ سے سبق حاصل کریں اور باطل قوتوں کے خلاف جہاد کریں۔ علامہ محمد اقبال نے حضرت امام حسینؓ کے اس کارنامے پر کئی اشعار فارسی اور اردو میں کہے ہیں اور ان کی بہادری اور شجاعت کا ذکر کیا ہے۔

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم
زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم (کلیات فارسی،ص ۱۱۱)

در نوائے زندگی سوز از حسینؓ
اہلِ حق حریت آموز از حسینؓ (کلیات فارسی،ص ۱۵۳)

تا حسینےؓ شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد (کلیات فارسی،ص ۱۵۵)

خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را
دوش براہبر زند ، راہ یگانہ طے کند (کلیات فارسی،ص ۴۰۳)

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
فقر و سلطاں وارثِ جذبِ حسینؓ (کلیات فارسی،ص ۷۶۰)

فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ (کلیات فارسی،ص ۸۱۸)

گرمیٔ ہنگامہ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ (کلیات فارسی، ص۸۳۵)

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دارابھی گیسوئے دجلہ وفرات! (کلیات اردو: ص۴۰۴)

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق (کلیات اردو: ص۴۰۴)

ooo

حضرت خالدؓ بن ولید

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بڑے صحابی تھے۔ خالد بن ولید بڑے سپہ سالار اور جرنیل تھے۔ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو انہی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے کئی غزوات میں حصہ لیا۔ حضور اکرم ﷺ نے آپ کو سیف اللہ کے لقب سے سرفراز کیا۔ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد مسیلمہ کذاب کو جہنم رسید کیا۔ جنگ یرموک میں حضرت عمرؓ نے ان کو سپہ سالار سے معزول کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت خالدؓ نے ان کا قصیدہ لکھنے پر ایک شاعر کو انعام واکرام سے نوازا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو مختلف جنگوں میں جو فتوحات ہوئی ہیں وہ اللہ کے کرم سے ہوئی ہیں اس میں خالدؓ بن ولید کے زور بازو اور شمشیر زنی کا نتیجہ نہیں ہے۔ حضرت خالد بن ولید نے بھی ان کے حکم کو خوش دلی سے تسلیم کیا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ خالد بن ولید ۲۱ھ میں رحلت فرمائی۔

قوتِ بازوے خالدؓ دیدہٖ
شام را بر سر شفق پاشیدہٖ (کلیات فارسی، ص ۹۷)

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند (کلیات فارسی، ص ۱۸۸)

خاکِ بطحا خالدے دیگر بزاے
نغمۂ توحید راد دیگر سراے (کلیات فارسی، ص ۶۸۵)

جبرِ خالد عالمے برہم زند
جبر مابیخ و بن ما برکند (کلیات فارسی، ص ۷۰۹)

اُردو

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالد جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ
(کلیات فارسی، ص ۴۸۹)

ooo

حضرت زین العابدینؓ

حضرت امام حسین کے فرزند تھے۔ نام علی، کنیت ابوالحسن محمد، القاب سید الساجدین، زین العابدین سجاد اور عابد۔ ایران کے آخری تاجدار یزدگرد کے نواسے تھے۔ واقعہ کربلا کے موقع پر بیمار اور بچے تھے، اس لیے جنگ میں شریک نہ ہوئے۔ جنگ کے بعد گرفتار ہو کر یزید کے سامنے پیش ہوئے، جس نے خواتین کے ساتھ آپ کو بھی رہا کر دیا۔ آپؓ کا شمار آئمہ دوازدہ میں چوتھے نمبر پر ہے۔ اور آپؓ امام ہیں آپؓ بمقام مدینہ ۳۳ھ، ۳۶ھ یا ۳۸ھ میں پیدا ہوئے آپؓ کی والدہ یزدجبر دین نوشیرواں کی بیٹی شہر بانو تھیں۔ اہلِ بیت کی شہادت کے بعد آپ دل شکستہ ہو چکے تھے، اس لیے مدینے میں عزلت نشینی اختیار کر لی۔ عبداللہ بن زبیرؓ اور یزید کی چپقلش میں آپ غیر جانبدار رہے اور مختار ثقفی کی دعوت پر بھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ آپؓ کا وصال ۹۴ھ یا ۹۵ھ میں ۱۸ محرم کی شب کو ہوا بعض مستند روایات کے مطابق ۲۵ محرم ہے اور آپؓ نے ۵۶۔ ۶۱۔ ۶۲ سال کی عمر پائی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؓ وضو فرماتے تو آپؓ کا چہرہ زرد ہو جایا کرتا تھا آپؓ کا جسم پورے کا پورا کانپنے لگتا تھا آپؓ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپؓ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ وضو کے بعد میں کس کی بارگاہ میں حاضری دینے والا ہوں۔ آپؓ مدینہ میں جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ متعدد احادیث آپ سے مروی ہیں۔ فقہی مسائل میں مدینے کے سات مشہور فقہا کے بعد آٹھواں درجہ آپ کا ہے۔ ۸۷ ہجری میں جب روضہ نبوی ﷺ کی تعمیر کا وقت آیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سنگ بنیاد رکھنے کا فریضہ آپ کے دست مبارک سے انجام دلوایا۔

بے خبر مرداں زر زم کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زین العابدینؓ

(کلیاتِ فارسی، ص ۶۷۶)

حضرت ابنِ مسعودؓ

صحابہ کرام کو چرخِ رسول ﷺ کے ستارے کہتے ہیں۔ حضور مثلِ آفتاب اور صحابہ اکرام کرنوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ عرب کے ریگ زاروں کو آفتاب و مہتاب میں بدلنے کا سہرا نور آفتاب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے سر ہے۔ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کے ایک اک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ کلام اقبال سے یہی بات اخذ ہوتی ہے کہ آج ہماری زندگی ان کی عطا کردہ نعمت ہے انھوں نے قربانیاں دیں اور ہمیں جینے کا حوصلہ بخشا۔ اعتبار اور پیار ایسے پرندے ہیں جن میں سے ایک بھی اڑ جائے تو دوسرا خود ہی اڑ جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے پیار اور اعتماد کی لازوال مثالیں قائم کیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نہ صرف عاشق رسول تھے بل کہ انھوں نے صحابہ کرام کو بھی اپنی فکر جولانیوں میں شامل رکھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی سے ہی قیامت کا ہولناک دن بھی ہمارے لیے خوبصورت اور پُر امن ہو جائے گا۔ حضرت ابن مسعود محفل نبی معظم ﷺ کے درخشندہ ستارے ہیں جن کی چمک دمک سے راہ ہدایت ہمارا استقبال کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ان صحابہ میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑے ممتاز تھے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حقیقت میں فقہ کے بانی وہی تھے۔ ابتدائے عہد اسلام میں جب مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی تو وہ مشرب بہ اسلام ہوئے۔ ابن مسعود نے تقریباً تمام غزاوات میں شرکت کی۔ جنگ یرموک میں بھی شریک ہوئے۔ اس جنگ میں انھوں نے اپنی شجاعت و بہادری کے ایسے واقعات چھوڑے ہیں کہ ان کی بہادری چہارم دانگ عالم میں پھیل گئی۔ ۲۰ھ میں عبداللہ بن مسعود کوفہ کے قاضی تعینات ہوئے۔ وہ دس برس اس منصب جلیلہ پر فائز

رہے۔ انھوں نے عدل و انصاف کی لاتعداد مثالیں قائم کیں۔ عہد حضرت عثمان غنیؓ میں معزول ہوئے مدینہ آتے ہوئے راستے میں ابوذر غفاریؓ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ساٹھ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ ان کا سال وفات ۳۳ھ ہے۔ نبی پاک ﷺ سے بے پناہ عقیدت و احترام رکھتے تھے۔ انھوں نے حضور پاک ﷺ سے بہت اکتساب فیض کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے محبوب خدا کی خدمت کی اور اللہ نے انھیں شہرت دوام بخشی۔

ابن مسعود آں چراغ افروز عشق
جسم و جان او سراپا سوز عشق

(کلیات فارسی، ص ۱۶۲)

ooo

حضرت ابو عبیدہؓ

معروف صحابیٔ رسول ﷺ ہیں۔ ابو عبیدہؓ بن الجراح، لقب امین الملت تھا۔ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں تھے۔ آپؓ ان لوگوں میں سے تھے جن کو آنحضرت ﷺ نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ تمام غزوات میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ ایک قابل جرنیل تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا تم ابو عبیدہ اور حضرت عمرؓ میں سے کسی کو اپنا امیر بنالو۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یہ اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف بنا دیے گئے تھے۔ اقبال ان کی دلیری اور شجاعت کے معترف تھے انھوں نے ان کو زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے

ابو عبیدہ رخصت پکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

(کلیاتِ اردو، ص ۲۴۷)

ooo

حضرت فاطمۃ الزہراؑ، بتول

عاشقِ رسول ﷺ، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو اہلِ بیت سے دلی محبّت تھی۔ محمد مصطفیٰ ﷺ و آل محمد ﷺ سے ان کی والہانہ عقیدت ان کے فکری آہنگ میں نمایاں رنگ ہے۔ حضرت فاطمہ الزہرہؓ تاجدار کائنات، مخزنِ کائنات، سرورِ کائنات، منشائے کائنات، مقصودِ کائنات، رونقِ کائنات، حُسن کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔ آپؓ کی کنیت اُمِ محمد ﷺ تھی۔ آپؓ کے بہت القاب تھے خاص طور پر سیدہ عالم، سردار النساء اہل جنت یعنی جنت میں خواتین کی سردار اور اپنی زندگی میں بھی خواتین کی سردار تھیں۔ آپ طاہرہ۔ مطہرہ کے لقب سے بھی جانی جاتی تھیں جس کے معنی پاک کے ہیں۔

آپؓ سیرت وصورت میں حضور ﷺ سے بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ آپؓ، حضرت خدیجہؓ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ والدہ اور والد ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ کی قربت نے آپؓ کو پاکیزہ اخلاق کی مالکہ بنادیا تھا۔ بچپن میں ہی سنجیدہ اور ذہین تھیں۔ بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں متانت اور سادگی تھی ہمیشہ اپنے والد محترم کے پاس رہتیں۔ حضور اکرم ﷺ، آپؓ کو ''بتول'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جب آپؓ، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس تشریف لے جاتیں تو آپ ﷺ احترام میں کھڑے ہوجاتے اور آپؓ کو اپنے پاس بٹھاتے اور ان کے سر اور آنکھوں پر بوسہ دیتے۔

ہجرت کے پانچ ماہ بعد آپ کا نکاح حضرت علی المرتضیٰؓ سے ہوا۔ اس وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر ۱۸ سال اور حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا کی عمر ۲۱ برس اور پانچ ماہ تھی۔ چار سو درہم حضرت فاطمہ الزہراؑ کو حق مہر دیا گیا۔ یہ رقم حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنی زرہ بیچ کر دی۔ یہ زرہ حضرت عثمانؓ نے خریدا۔ حضرت علیؓ نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا اور حضرت محمد ﷺ نے اپنی لونڈی ام ایمنؓ کے

ہمراہ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت کیا۔

شہنشاہ کائنات حضرت محمد ﷺ کی بیٹی کو جہیز میں زیورات میں بازوبند اور کپڑوں میں چار زعفرانی رنگی ہوئی ایک چادر، ایک چمڑے کا گدا جس میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔ ایک تکیہ، آٹا پیسنے والی چکی، ایک مشکیزہ اور دو ڈول شامل تھے۔ حضرت فاطمہؓ نہایت عبادت گزار اور متقی خاتون تھیں گھر کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ حضرت اکرم ﷺ جب بھی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ کو فاطمہؓ سے زیادہ کسی اور سے اتنی محبّت نہ تھی۔ حضرت فاطمہؓ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا کہنا ہے کہ وہ جنت کی عورتوں کی ملکہ ہیں۔ ان کو اسی لیے خاتونِ جنت بھی کہا جاتا ہے۔ آپ نہایت صابر خاتون تھیں۔

حضرت فاطمہؓ کی پانچ اولادیں حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت محسنؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ تھیں۔ حضرت فاطمہؓ نے ۲۹ سال اور چند مہینوں کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے چھ مہینے بعد تین رمضان ۱۱ھ کی رات کو انتقال فرمایا۔ حضرت علیؓ کو وصیت فرمائی کہ انہیں رات کو ہی دفن کر دیا جائے۔ حضرت عباسؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آں امام عاشقاں پورِ بتولؓ
سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ (کلیات فارسی، ص۱۱۰)

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؓ عزیز (کلیات فارسی، ص۱۵۲)

مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ (کلیات فارسی، ص۱۵۳)

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ مبند (کلیات فارسی، ص۱۵۵)

بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرؓے بگیری (کلیات فارسی، ص۱۱۰)

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ؟ (کلیات اردو، ص۳۱۵)

اولیاءِ کرام

و

بزرگانِ دین

حضرت داتا گنج بخشؒ

حضرت داتا گنج بخش برعظیم پاک و ہند کے ممتاز صوفی بزرگ ہیں، سلطان مسعود بن محمود غزنوی (۴۲۲۔۴۳۲ھ) کے آخری عہد حکومت میں لاہور تشریف لائے اور یہاں رُشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا۔ ان کا اسم گرامی علی، ابوالحسن کنیت اور داتا گنج بخش لقب ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید عثمان تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسنؓ سے جاملتا ہے۔ ان کو ہجویری اور جلابی اس لیے کہتے ہیں کہ مدتوں غزنی کے نواحی محلوں یا گاؤں میں آپ کا قیام رہا۔ ابتدائی تعلیم کے بارے میں اپنی معروف کتاب ''کشف المحجوب'' میں اپنے جن اساتذہ کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت ابوالعباس بن محمد شقانی، ابوجعفر بن مصباح صیدلانی، شیخ ابوالقاسم بن علی عبداللہ گرگانی ہیں۔ سلسلہ جنیدیہ کے جید عالم حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ سے حضرت داتا گنج بخش نے روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی۔

روحانی تربیت اور تزکیۂ نفس کے لیے داتا ہجویری نے مختلف ممالک کے اسفار کیے جن میں شام، بغداد، عراق، ایران، آذربائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، ماوراالنہر اور ترکستان وغیرہ کی خوب سیاحت کی، اور ہر مقام کے اولیاء و صوفیاء سے مستفید ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ طویل سفر میں رہنے کے باوجود ہمیشہ نماز باجماعت پڑھنے اور نماز جمعہ کے لیے کسی بھی شہر کی مسجد کا رخ کرتے رہے۔ ظاہری نمود و نمائش کے سخت خلاف تھے۔

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ: حضرت علی ہجویری لاہور میں دن کے وقت تعلیم دیتے اور رات کو طالبانِ حق کو ہدایت کیا کرتے، ان کی رہبری سے ہزاروں جاہل عالم بن گئے، کافروں نے اسلام قبول کیا، گمراہوں نے ہدایت کی راہ پائی، دیوانے ہوش مند ہوگئے، جن کا علم

ناقص تھا، کامل ہوئے، فاسق و فاجر پارسا بن گئے، ان دنوں لاہور ان علماء کا مرکز تھا، جنھوں نے حضرت علی ہجویری کی تعلیم سے فیض پایا تھا۔"

حضرت داتا گنج بخش ہجویری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے صوفیائے خام کے سبب تصوف اور اسلامی تشخّص برباد ہو رہا تھا کی درستی کی۔ ان صوفیائے خام نے قرآن و سنت سے روگردانی کر کے اسلامی صورت حال کو تباہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ داتا گنج بخش ہجویری نے اس گدلے ہوئے ماحول کو اپنے علم و فضل سے بہتر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لاہور کی زندگی کے بارے میں پروفیسر شیخ عبدالرشید نے اپنے رسالے "حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش" ان کی کتاب کشف الاسرار سے نقل کیے ہیں ایک جگہ حضرت علی ہجویری لکھتے ہیں کہ "ایک بزرگ حسام الدین سے ملا اور ان کی پارسائی سے بے حد متاثر ہوا، میں نے التجا کی کہ میری روحانی ترقی کے لیے کچھ ارشاد فرمایے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہر دم لوگوں کی دل جوئی اور تسکین میں مصروف رہو تا کہ وہ اپنا غم بھول جائیں۔۔۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگاؤ۔۔۔ حاصل کیا ہوا علم ضائع نہ کرو۔ ہر وقت اپنے مرشد سے لو لگائے رکھو۔"

حضرت داتا گنج بخش نے ۴۶۵ھ میں وصال فرمایا آپ کے مزار پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے چلہ کاٹا اور جب معرفت ملی اور روانہ ہونے لگے تو کہا......

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل ، کاملاں را رہنما

یہ نکتہ میں نے سیکھا بو الحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے!

(کلیاتِ اردو، ص ۳۷۹)

OOO

ابنِ بدرون

ہسپانیہ اپنے علم فضل کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ غرناطہ اسپین کا تاریخی مقام ہے۔ مسلمانوں نے جہاں اپنے جاہ وجلال کی یادیں چھوڑی ہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں یورپ کا ایک اپنی شناخت رکھنے والا علاقہ دمشق اور بغداد کو بھی شرماتا تھا۔ اموی خلفاء ۱۳۸ء سے ۴۲۲ھ تک اور پھر ۴۰۷ سے ۴۴۹ھ تک ملوک الطوائف کے ادوار میں رہا۔ غرناطہ پر ۸۹۷ ہجری تک بنی زہری، بنی عامر، بنی نصیر وغیرہ حکومت کرتے رہے۔ یہ شہر ہسپانیہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ الحمراعمارت کی وجہ سے بھی اس کی شہرت ہے۔ یہ سرخ خشت وسنگ سے تعمیر کردہ محل ہے جو بنی نصر نے بنوایا تھا۔ یہ ہسپانیہ میں سرخ محل کی وجہ سے مقبول ہے۔ امویوں کے زوال کے بعد اموی ہشام کی ذُرّیت میں عبدالرحمٰن الداخل اپنی جان بچاتا ہوا ہسپانیہ آیا اور اس نے وہاں حکومت قائم کر لی اس کی یہ حکومت تین سو سال قائم رہی یعنی ۱۳۰ھ سے ۴۲۲ھ تک۔

امویوں کے بعد کئی دیگر خاندان بھی برسراقتدار رہے جن میں بنونصر بہت مقبول ہے۔ الحمرا کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اسے مغرب کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو تباہ و برباد کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن یہ عمارت آج بھی سینۂ خاک پر جلوہ افروز ہے۔ اس عمارت میں ایک طلسمی حصار موجود ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی خوبصورتی اور پُراسراریت میں جکڑ لیتا ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کو ۱۲۱۳ء میں محمد ثانی نے بنوانا شروع کیا اور یوسف اول نے ۱۳۴۵ء میں اسے مکمل کروایا۔

غرناطہ (اسپین) کی تباہ و بربادی پر ایک شہر آشوب ابن عبدون نے لکھا جس میں اس نے اس کی عروج وزوال کی ساری داستان کو بیان کیا ہے۔ ابن بدرون نے اس شہر آشوب کی شرح لکھی

ہے۔ اسپین کے صوبہ اندلوزیا (اندلس) کا معروف شہر قرطبہ موجود ہے جس میں مسجدِ قرطبہ کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ اقبال نے بھی ایک نظم ''مسجدِ قرطبہ'' لکھ کر اس کی عظمتِ رفتہ کے گن گائے ہیں۔

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

(کلیات اردو، ص ۱۳۴)

ooo

شیخ احمد رفاعیؒ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال فکری اعتبار سے بہت سے شاعروں ادیبوں سے اختلاف رائے کر لیتے تھے۔ لیکن ان کی خوبیوں کو کسی طرح فراموش ہونے نہیں دیتے تھے۔ شیخ احمد رفاعی کا تعلق عراق سے تھا۔ شیخ سید احمد رفاعی ۱۵ رجب ۵۱۲ ہجری بمطابق ۱۱۱۸ء کو قریہ حسن میں پیدا ہوئے۔ قریہ حسن واسط اور بصرے کے عین درمیان میں واقع ہے آپ کی کنیت ابوالعباس اور لقب محی الدین تھا۔ آپ کے جدامجد میں سے سید حسن کا لقب رفاعہ تھا، جس کے معنی بلند آواز کے ہیں اسی نسبت سے آپ رفاعی مقبول ہوئے۔ آپ نے عبدالسمیع حربونی سے قرآن مجید حفظ کیا، ۵۱۹ھ (۱۱۲۵ء) میں آپ کے والد نے بغداد میں وفات پائی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد ان کے ماموں شیخ منصور بطائی نے حضرت سید احمد کی کفالت کا ذمہ لیا۔ تعلیم وتربیب کے لیے ان کے ماموں نے آپ کو ابوالفضل شیخ علی قادری واسطی کے پاس واسط بھیجا۔ بیس سال کی عمر میں آپ تعلیم مکمل کی۔ شیخ احمد رفاعی خوش قسمت ہیں کہ انھیں ابولفضل شیخ علی قادری واسطی، شیخ ابوبکر واسطی، اور شیخ عبدالملک الحربونی سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ ان اساتذہ نے ان کے جوہر قابل کو نکھارا

انھوں نے بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ وہ اپنے دور کے دانش ور تھے۔ شیخ احمد رفاعی نے عجمی تصورات سے پرہیز کرنے کی دعوت دی کیونکہ عجمی خیالات وتصورات نے تصوف کے اندر اسلامی تعلیمات کو مسخ کیا۔ علامہ محمد اقبال نے اس کے خلاف ہمیشہ جہاد کیا۔

شیخ احمد رفاعی حصول علم کے بعد درس وتدریس میں مصروف ہو گئے اس کے بعد آپ علم باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ماموں شیخ باز الاشہب منصور کے دست حق پرست بیعت ہو کر

خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ہزاروں لاکھوں مریدوں کے قلب منور کیے اور علم باطن اور علم ظاہر کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ نے زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح فرمائی۔ آپ اپنی تعلیمات میں قرآن حکیم اور پیروی رسول ﷺ پر زور دیتے۔ حضرت شیخ احمد رفاعی سلسلہء رفاعیہ کے بانی ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اس سلسلہ کے لوگ بہت کم ہیں جب کہ یہ سلسلہ عراق، عرب، مصر اور شام میں بہت مقبول ہوا۔ شیخ احمد رفاعی نے چھٹی صدی ہجری میں رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کیا۔ ان کی خانقاہ اصلاح و تربیت کا گہوارہ رہی ہے جس سے ہزاروں لوگوں نے اکتساب فیض کرتے ہوئے سلوک و معرفت کی منازل طے کیں۔ یہاں سے نورِ معرفت لینے والے دنیا بھر میں پھیل گئے اور عالمِ انسانیت کو نور ہدایت دینے لگے۔

ان کی کتابوں میں خاص طور پر ''مجالیس الاحمدیہ''، ''کتاب الحکم''، ''آثار النافعہ''، ''الحکم الساطعہ''، ''البرھان المویّد'' وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب الحکم کا ترجمہ فارسی سے اردو میں مولانا عبدالحکیم شرر نے کیا جو ۱۹۱۶ء میں دل گداز پریس لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ایک مدت سے نایاب تھی اس کا ایک نیا ایڈیشن محمد عبداللہ قریشی نے ایک مربوط و مبسوط مقدمہ کے ساتھ آئینہ ادب لاہور سے شائع کروایا۔ شمع ہدایت کے پروانوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی متاع سے کم نہیں۔

سفینۃ الاولیاء میں ان کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الاول ۵۷۸ھ (۱۱۸۳ء) درج ہے شیخ احمد رفاعی ام عبیدہ کی خانقاہ میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بہن کے صاحبزادے علی بن عثمان مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔

شیخ احمد سید گردوں جناب
کاسب نور از ضمیرش آفتاب

(کلیاتِ فارسی، ص ۱۲۹)

ooo

شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانیؒ

تاریخِ اسلام میں کلمۂ حق بلند کرنے والوں میں حضرت مجدد الف ثانی المعروف شیخ احمد سرہندی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ دینِ اسلام کی حقانیت کے لیے انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انھوں نے حق کی خاطر ظالم قوتوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا اسمِ گرامی احمد، لقب بدرالدین کنیت ابوالبرکات ہے۔ حضرت مجدد کے والد کا نام شیخ عبدالاحد ہے، حضرت مجدد الف ثانی کی ولادت ۱۴ شوال روز جمعۃ بوقت نصب شب ۹۷۱ھ بمطابق ۱۵۶۴ء میں ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن الخطابؓ سے جاملتا ہے۔ قرآنِ مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے والد سے تعلیم حاصل کرتے رہے، اس کے بعد انھوں نے مولانا کمال کشمیری، مولانا محمد یعقوب کشمیری اور مولانا عبدالرحمٰن سے اکتسابِ فیض کیا۔ مجدد الف ثانی درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور اسی دوران وہ آگرہ بھی تشریف لے گئے جہاں وہ جید اکابر علماء سے ملے یہیں آپ کی فیضی اور ابوالفضل سے بھی ملاقات ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے والد انہیں آگرے سے واپس تھانیسر لے گئے وہاں ان کا نکاح شیخ سلطان کی صاحبزادی سے ہوا۔

حضرت مجدد الف ثانی کے علم وفضل کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ابوالفیض فیضی قرآن مجید کی تفسیر بے نقط لکھ رہے تھے اس وقت ہندوستان کے جید علماء میں مولانا جمال الدین تاوی ان کی معاونت کے لیے ہمہ وقت ان کے پاس تھے پھر ایک مقام آیا کہ اس توضیح و تشریح سے سب عاجز رہے تب فیضی نے حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا کہ یہ وہ مقام ہے کہ جس کی

تشریح سے علماء قاصر رہے اگر آپ اس کی تشریح وتفہیم بے نقط کر دیں تو شکر گزار ہوں گا۔حضرت مجدد الف ثانی نے کمال ہنر سے بے نقط تشریح فرمائی کہ تمام علماء ششدر رہ گئے۔اوران کے علم وفضل کی تعریف کرنے لگے۔جب ان کے والد ماجد ۱۰۰۷ھ بمطابق ۹۷-۱۶۹۶ء میں وفات پا گئے۔ آپ کے ایک ہمدم دیرینہ شیخ حسن کشمیری نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی اتنی تعریف کی کہ مجدد الف ثانی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ایک ہفتہ دہلی میں قیام کیااور تین چار روز کے بعد سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔دو ماہ اور کچھ دن میں آپ نے سلسلہ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیااور آپ کے مرشد نے آپ کو وطن رخصت کیا۔

مجدد الف ثانی نے نہایت نازک اور کٹھن دور میں اسلامی تعلیمات لوگوں میں بہم پہنچائیں جب شہنشاہ اکبر نے ایک الگ ''دینِ الٰہی'' بنالیا تھا۔اس وقت آپ نے لوگوں کو اکبری دینِ الٰہی سے نجات دینے کے لیے حکومت ہند کے خلاف بغاوت اور اسلامی شریعت اور نفاذ کے لیے سرگرمِ عمل ہوئے تو اکبر کو ان کی حکومت مخالف کارروائیاں ناپسند آئیں اور انہیں دربار میں مدعو کیا گیا۔شہنشاہ اکبر نے دربار میں داخلے کے لیے ایسا دروازہ نصب کیا جس میں جھک کر آنا پڑتا تھا۔مجدد الف ثانی نے آنے سے انکار کر دیا جس پر جہانگیر نے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔

قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود انھوں نے دین کی اشاعت کا کام جاری رکھا۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جہانگیر نے انھیں آزاد کر دیااور پھر ان کا مرید ہو گیا۔

اس مردِ قلندر اور مردِ مومن کے بارے میں علامہ محمد اقبال بہت احترام اور عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔یہاں تک کہ علامہ اقبال نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کی ولادت پر منت مانی کی جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو انھیں مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری کے لیے حاضر ہوں گے اس منت کو پورا کرنے کے لیے ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو جاوید اقبال کے ہمراہ سرہند تشریف لے گئے اور حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دی۔ڈاکٹر علامہ اقبال نے مزار مبارک کی زیارت کے بعد لکھا ہے:

مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا، بڑا پاکیزہ مقام ہے پانی اس کا سرد و شیریں ہے، سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا، جس کی بنا حضرت عمر بن العاصؓ نے رکھی تھی، اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب وتمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں، یہ شہر

فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت و آباد میں دگنا تھا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی بارگاہ میں اُن کے فیوض و برکات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں......

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

بالِ جبریل میں پنجاب کے پیرزادوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی کی شان میں نغمہ سرا ہیں۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے، وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں، ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

علامہ محمد اقبال دیگر صوفیوں کی طرح حضرت مجدد الف ثانی سے بہت حد تک متاثر تھے کہ وہ ان کے نظریہ ہمہ از اوست کے قائل ہیں۔ حضرت مجدد سالک کی آخری منزل مقام عبدیت کو قرار

دیتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی نے جو گمراہیاں پیدا کی تھیں۔ وہ جہانگیر کے دور میں بعض اپنی اصل صورت میں اور بعض دوسرے رنگ میں موجود تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے لوگوں کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے سعی کی اور انھوں نے بتایا کہ وہ گمراہ نہ ہوں اور قرآن وسنت سے رابطہ استوار رکھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس دور میں دین حق کی نشاۃ ثانیہ کی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی رہنمائی کی خاطر ایک ہزار سال بعد ایسے پسندیدہ برگزیدہ ہستیوں کو بھیجتا ہے جو اسلامی تعلیمات کی تجدید کرتے ہیں۔ مجدد الف ثانی کا شمار ایسے ہی برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے۔ ان کی جلائی ہوئی شمع آج بھی منور ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اشاعت دین کا فریضہ انجام دیں۔

کاش بودے در زمانِ احمدے
تار سیدے برسرورے سرمدے

(کلیات فارسی، ص ۱۴۱۷)

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے، وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں ، ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق
طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار

(کلیات اردو، ص ۴۵۰)

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

(کلیات اردو، ص ۳۰۴)

ooo

حضرت شمس تبریزیؒ

حضرت شمس تبریزی کا اصل نام محمد بن علی بن ملک داوٗد تبریزی ہے۔ آپ کو اپنے والد ماجد سے خرقۂ ولایت ملا جو حضرت ابوالنجب سہروردیؒ سے پانچ واسطوں سے ملتا ہے۔ بعض انھیں شیخ ابوبکر زنبیل باف کا مرید بتاتے ہیں، بعضوں کا بیان ہے کہ شیخ رکن الدین سنجاسی کے مرید ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے بابا کمال جندی سے بیعت کی تھی۔ آخری روایت زیادہ صحیح ہے

فیض صحبت زاہد ابوبکر ہمدانیؒ سے کیا اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ آپ کے والد محترم نے فرمایا کہ عبداللہ کو وہ سب کچھ ملا جو میں نے خدا تعالیٰ سے مانگا اور مجھے جو کچھ دریچے سے ملا عبداللہ کے لیے اس کا دروازہ کھول دیا گیا۔ آپ توحید آشنا اور صاحبِ کرامت بزرگ ہوئے۔

آپؒ نے فرمایا۔ ایک آہ سے میں منصور جیسے ہزاروں بزرگ پیدا کرسکتا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا کہ نماز، روزہ، اور شب بیداری جیسے اسباب بندگی سے جو درویش تعلق نہیں رکھتا وہ ہرگز درویش نہیں بلکہ درویشی کے لیے باعث ننگ ورسوائی ہے اگر یہ سب کچھ حاصل ہے تو پھر وہ اصل ولی اللہ ہے۔
خوجوں کے مرکزی جن کا ملتان میں ایک شان دار روضہ ہے۔ انہیں عام طور پر شاہ شمس تبریز کہا جاتا ہے۔ لیکن خوجہ روایات کے مطابق وہ ایران کے شہر سبزوار سے تشریف لائے۔ ان کی نسبت متعدد روایات عوام میں مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق جب ملتان کے ایک قصاب نے انہیں گوشت کی بوٹی بھون کردینے سے انکار کیا تو انھوں نے سورج کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ سورج سوانیزے پر آ گیا جس سے انھوں نے اپنی بوٹی بھون لی، لیکن شہر میں قیامت برپا ہوگئی۔ پنجاب کی ایک جماعت (جو خوجوں کے موجودہ امام آغا خان کو مانتی ہے) اپنے آپ کو شاہ شمس کے نام پر شمسی کہتی ہے۔ ملتان گزیٹیئر میں آپ کو

حضرت بہاء الدین بہاالحق کا ہم عصر لکھا ہے سہروردی روایات کے مطابق مشہور سہروردی بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کو "رکن الدین عالم" کا لقب آپ نے عطا فرمایا تھا، جو مختصر ہو کر "رکنِ عالم" رہ گیا۔

حضرت شمس تبریزی ایک درویش بزرگ جس کی غلامی نے حضرت مولانا روم کو مولائے روم بنا دیا۔ اقبال نے "اسرار خودی" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ مولانا روم طلباء کو درس دے رہے تھے کہ شمس تبریز آ گئے اور مولانا روم کے درس سنتے رہے۔ وہ علم کے دریا بہا رہے تھے۔ ان کے اردگرد کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شمس تبریز نے کہا کہ یہ شور و ہنگامہ کیا مچا رکھا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا...... اے بے وقوف چپ رہ، میری بات چیت تیری سمجھ سے بالاتر ہے۔ شمس تبریز نے خشمگیں نگاہوں سے رومی کی کتابوں کو دیکھا تو کتابوں کو آگ لگ گئی۔ مولانا روم بڑے حیران ہوئے اور درس چھوڑ کر شمس تبریز کے پیچھے چلے گئے۔

حضرت شمس تبریز نے مریدوں کی نذر و نیاز کو کبھی اپنے لیے ذریعہ معیشت نہیں بنایا بلکہ وہ عوام کی طرح اپنی معیشت حاصل کرنے کے لیے ازار بند بُنتے، اور انہیں کو فروخت کر کے اپنی روزی حاصل کرتے۔ تنہائی پسند تھے، اکثر دعا فرمایا کرتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔ جب کسی سے رنجیدہ ہوتے تو اسے دعا کرتے کہ خداوندا اس کی عمر دراز کر، اور اسے مال زیادہ دے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے حضرت شمس تبریز کا سنِ وفات ۶۴۵ھ قرار دیا ہے بعض مصنفین نے آپ کا سال وفات ۶۶۰ھ قرار دیا ہے۔ حضرت شمس تبریز علامہ اقبال کے مرشد معنوی مولانا روم کے پیر ہیں، ایک مرید کو اپنے پیر کے پیر سے جو محبت اور عقیدت ہو سکتی ہے بیان سے باہر ہے۔

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال
جست راہ مکتبِ مُلّا جلال (کلیات فارسی، ص ۶۷)

سوزِ شمس از گفتۂ مُلّا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود (کلیات فارسی، ص ۶۷)

گذشت از پیشِ آں دانائے تبریز
قیامت ہا کہ رست از کشت چنگیز (کلیات فارسی، ص ۵۳۸)

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز
روم را در آتش تبریز سوز (اسرارخودی،ص۔۔۔۔۔)

اُردو

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں، وہی تبریزؔ ہے ساقی

(کلیاتِ اردو، ص۳۰۳)

OOO

مولانا جلال الدین رومیؒ

مولانا جلال الدین رومی بلخ میں ۶۰۴ھ بمطابق ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے آپ کو مولانا روم اور مولانا رومی کے علاوہ پیرِ روم، پیرِ حق سرشت، پیرِ یزدانی، پیرِ عجم، مرشدِ روم اور پیرِ ہندی کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی کے والدِ محترم محمد بن حسین ملقب بہاء الدین اس دور کے اکابر علماء و مشائخ میں اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلفاء میں تھے اور سلطان علاء الدین خوارزم شاہ کے مزاج میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ پند و موعظت کی وجہ آپ کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ لوگ آپ کو دیوانہ وار چاہتے تھے وہیں کچھ مخالفین بھی پیدا ہوئے لہٰذا ان کے والد بلغ سے ہجرت کر کے بغداد کے راستے اپنے صاحبزادے مولانا جلال الدین رومی کے ہمراہ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اس وقت مولانا جلال الدین رومی کی عمر ۱۴ برس تھی۔

راستے میں مختلف شہروں میں قیام کرتے رہے اور لوگ جوق در جوق زیارت کے لیے حاضریاں دیتے رہے۔ اسی طرح جب آپ نیشاپور پہنچے تو حضرت خواجہ فریدالدین عطار آپ سے ملنے کے لیے آئے مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو اپنے سینے سے لگالیا اور ان کے والد سے کہا کہ اس جوہرِ قابل سے غافل نہ ہونا، پھر اپنی مثنوی ''اسرارنامہ'' مولانا روم کو دی۔ حج و زیارت کے بعد ملاطیہ پہنچے اس شہر میں چار سال قیام کیا اس کے بعد لارندہ تشریف لے گئے لارندہ سلجوقیوں کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر میں آپ نے سات سال قیام کیا۔ پھر سلطان علاء الدین کیقباد کی دعوت پر اس کے دارالحکومت قونیہ تشریف لے گئے اور وہاں سلطان العلماء بہاالدین جو علوم ظاہری اور باطنی میں بلند

مقام رکھتے، درس وتدریس، ارشاد وتلقین میں مصروف ہو گئے۔ علاء الدین کیقباد آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تا۔ شیخ بہاء الدین نے جمعہ کے روز ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ ھ بمطابق ۱۲۳۱ء کو وفات پائی۔

مولانا جلال الدین رومی نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد سے حاصل کی، ان کی وفات کے بعد اپنے والد کر مرید سید برہان محقق ترمذی جو اس زمانے میں قونیہ آئے ہوئے تھے اور اکابر العلماء اور اہل طریقت میں تھے، ان کے حلقہ درس میں شریک ہو کر اکتساب فیض کیا اور پورے نو سال اس مرد حق آگاہ سے تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے، اور اکثر علوم وفنون ان سے حاصل کیے۔ مولانا روم نے حلب کا بھی سفر کیا جو دمشق کی طرح مدینۃ العلم بن چکا تھا۔ حلب پہنچ کر حلاویہ کے دارالاقامہ میں قیام کیا۔ مولانا مدرسہ حلاویہ کے علاوہ دیگر مدرسوں سے بھی علم حاصل کرتے رہے۔

دمشق سے مولانا پھر قونیہ تشریف لائے۔ یہاں حضرت شمس تبریز آپ کی زندگی میں داخل ہوئے انھوں نے آپ کی زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز مولانا روم گھر میں تشریف فرما تھے آپ کے شاگرد دارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے، اتفاقاً حضرت شمس تبریز کسی طرف سے ادھر آنکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے اور مولانا سے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے، یہ کہنا تھا کہ تمام کتابوں کو آگ لگ گئی، مولانا روم نے کہا یہ کیا ہے؟ حضرت شمس تبریز نے جواب دیا، یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے یہ کہہ کر حضرت شمس تبریز وہاں سے چل دیئے۔ اور مولانا روم ان کے پیچھے ان کو ڈھونڈتے پھرے۔

حضرت شمس تبریز کو ان کے پیر بابا کمال جندی نے حکم دیا کہ روم جاؤ وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔ شمس تبریز قونیہ پہنچے اور یوں مولانا روم نے ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ حضرت شمس تبریز اکثر دعا فرمایا کرتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔ عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم جاؤ۔ برنج فروشوں کی سرائے میں اترے۔ یہیں ان کی ملاقات مولانا روم سے ہوئی تھی۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں جس نے مولانا روم کے اندر عشق حقیقی کی جوت جلا دی اور وہ علم ظاہری وباطنی سے سرفراز ہوئے۔ مولانا روم، حضرت شمس تبریز کی خدمت میں رہتے اور ایک دم کے لیے بھی ان سے جدا نہ ہوتے۔ ایک روز چپکے سے شمس تبریز قونیہ سے نکل کر دمشق چلے گئے۔ مولانا روم ان کے فراق میں نڈھال ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد شمس تبریز نے مولانا کو ایک خط لکھا۔ مولانا روم

نے قیمتی تحائف اور ایک وفد کو بھیجا کہ شمس تبریز کو واپس لایا جائے۔ اس کارواں نے حضرت شمس تبریز کو واپس لانے کے لیے راضی کر لیا۔ مولانا روم نے خود قونیہ سے نکل کر ان کے استقبال کیا۔ مدت تک بڑے ذوق وشوق کی صحبتیں رہیں۔

مولانا روم بیمار ہوئے تو پورا شہر عیادت کے لیے ٹوٹ پڑا۔ حضرت شیخ صدر الدین قونیوی بھی عیادت کو آئے تندرستی اور صحت کی دعا دی مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں ایک پیرہن کا پردہ باقی رہ گیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں مل جائے۔ وصیت فرمائی کی میرا جنازہ مولانا صدر الدین پڑھائیں گے اور میرے بعد میرا جانشین مولانا حسام الدین چلپی ہوں گے۔ آخری لمحات میں اپنے مریدوں کو فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، کھانے، سونے اور گفتگو میں کمی کرو، گناہوں سے دور رہو، روزے برابر رکھو، ہر طرح کے لوگوں کی جفا برداشت کرو۔ عامیوں کی ہم نشینی چھوڑ دو۔ نیکوں اور بزرگوں سے صحبت رکھو، بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔

آخر ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ بمطابق ۱۲۷۳ء بروز یکشنبہ غروب آفتاب کے وقت آپ واصل الی اللہ ہوئے۔ مولانا امتیاز الدین نے غسل دیا شیخ صدر الدین نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرط غم سے چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئے آخر قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ قونیہ میں مولانا کا مزار مبارک آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

علامہ محمد اقبال مولانا روم سے بے حد متاثر تھے۔ اقبال نے ہمیشہ ان کو مرشد کامل سمجھا ہے اور اپنے فارسی اور اُردو کلام میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم
دفترِ سر بستہ اسرارِ علوم (کلیات فارسی، ص ۸)

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد (کلیات فارسی، ص ۹)

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطار کرد (کلیات فارسی، ص ۱۱)

شمعِ خود را ہمچو رومی برفروز
روم را در آتشِ تبریز سوز (کلیات فارسی، ص۱۹)

اے کہ باشی در پے کسبِ علوم
باتو میگویم پیامِ پیرِ روم (کلیات فارسی، ص۶٦)

پیر تبریزی ز ارشاد کمال
جستِ راہِ مکتبِ مُلّا جلال (کلیات فارسی، ص۶۷)

مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است
آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است (کلیات فارسی، ص۱۳۱)

مرشدِ رومی حکیم پاک زاد
سرِّ مرگ و زندگی برما کشاد (کلیات فارسی، ص۱۹۰)

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من (کلیات فارسی، ص۲۴۸)

بوعلی اندر غبار ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت (کلیات فارسی، ص۲۷٦)

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور
تاغوطہ زند جانم در آتش تبریزے (کلیات فارسی، ص۳۳۱)

بیا کہ من زخم پیر روم آو روم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادہ عنبی است (کلیات فارسی، ص۳۳۵)

شعلۂ درگیر زد برخس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزل ما کبریا است" (کلیات فارسی، ص۳۴۱)

گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار (کلیات فارسی، ص۳۷۶)

شرارے جستۂ گیر از درونم
کہ من مانند رومی گرم خونم (کلیات فارسی، ص۵۶۷)

راز معنی مرشد رومی کشود
فکرِ من بر آستانش در سجود (کلیات فارسی، ص۵۷۷)

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید
از پس کہ پارہ آمد پدپد (کلیات فارسی، ص۶۰۷)

گفت رومی از گمانہا پاک شو
خوگرِ رسم و رہ افلاک شو (کلیات فارسی، ص۶۲۰)

گفت رومی خیز و گامے پیش نہ
دولتِ بیدار را از کف مدہ (کلیات فارسی، ص۶۲۱)

ہر کجا رومی برد آنجا برد
یک دو دم از غیر او بیگانہ شو (کلیات فارسی، ص۶۲۱)

گفت با رومی کہ ہمراہ تو کیست
در نگاہش آرزوے زند گیست (کلیات فارسی، ص۶۲۲)

نظم: رومی

(پہلا اور آخری شعر)

مردے اندر جستجو آوارہ ثابتے با فطرت سیارہ
من ندانم چیست در آب و گلش من ندانم از مقام و منزلش
(کلیات فارسی، ص۶۲۳)

نظم: رومی

(پہلا اور آخری شعر)

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر راسنگ فسن

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاک اوبا سوزِ جاں ہمراہ نیست (کلیات فارسی، ص۶۲۴)

من بہ رومی گفتم اے دانائے راز
بر رفیق کم نظر بکشائے راز (کلیات فارسی، ص۶۲۹)

پیر رومی آں سراپا جذب و درد
ایں سخن دانم کہ باجانش چہ کرد (کلیات فارسی، ص۶۷۰)

رومیؔ ازا حوالِ جان من خبیر
گفت "می خواہی دگر عالم؟ بگیر (کلیات فارسی، ص۶۷۶)

پیر رومی آں صاحب، ذکرِ جمیل
ضربِ او را سطوت ضربِ خلیل (کلیات فارسی، ص۶۸۰)

پیرِ رومی سور طٰہٰ سرود
زیرِ دریا ماہتاب آمد فرود (کلیات فارسی، ص۶۸۲)

پیرِ روم آں مرشدِ اہل نظر
گفت "مریخ است ایں عالم نگر! (کلیات فارسی، ص۶۸۹)

گفت رومی "ایں قدر از خود مرو
ازدمِ آتش نوایاں زندہ شو (کلیات فارسی، ص۷۰۴)

گفت رومی وقت را از کف مدہ
اے کہ می خواہی کشود ہر گرہ (کلیات فارسی،ص۷۰۷)

تو کہ دانی از مقامِ پیر روم
می ندانی از کلامِ پیر روم (کلیات فارسی،ص۷۰۹)

گفت رومی خواجہ اہل فراق
آں سراپا سوزوآں خونیں ایاق (کلیات فارسی،ص۷۲۲)

پیر رومی آں امام راستاں
آشنائے ہر مقام راستاں (کلیات فارسی،ص۷۲۹)

گفت رومی " روح ہنداست ایں نگر
از فغانش سوز ہا اندر جگر (کلیات فارسی،ص۷۳۱)

من نہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست
گفت "ایں فرزانۂ المانوی است (کلیات فارسی،ص۷۴۰)

گفت رومی "اے گرفتارِ قیاس
در گذر از اعتباراتِ حواس (کلیات فارسی،ص۷۴۳)

حرفِ رومی درد لم سوزے فگند
آہ پنجاب ! آں زمین ارجمند! (کلیات فارسی،ص۷۴۶)

گفت رومیؔ "چشم دل بیدار بہ
پا بروں از حلقہ افکار نہ (کلیات فارسی،ص۷۵۹)

رومیؔ آں آئینۂ حسنِ ادب
باکمالِ دلبری بکشاد لب (کلیات فارسی،ص۷۶۱)

شیشۂ صبر و سکونم ریز ریز
پیر رومی گفت در گوشم کہ خیز (کلیات فارسی،ص۷۷۴)

پیرِ رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز (کلیات فارسی،ص۷۹۶)

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کاروان عشق و مستی را امیر (کلیات فارسی،ص۸۰۳)

نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم
خویش را در حرفِ او واسوختم (کلیات فارسی،ص۸۲۵)

عقل و دل را مستی از یک جام مے
اختلاطِ ذکر و فکرِ روم و رے (کلیات فارسی،ص۸۳۶)

ز آتش مردانِ حق می سوز مت
نکتۂ از پیر روم آموز مت (کلیات فارسی،ص۸۵۵)

آں حکیمِ غیب ، آں صاحب مقام
ترک جوش ، رومی از ذکرش تمام (کلیات فارسی،ص۸۶۴)

وقت است کہ بکشائم میخانہ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست (کلیات فارسی،ص۸۷۲)

شعر رومی خواند وخند ید و گریست
یا رب ایں دیوانہ فرزانہ کیست (کلیات فارسی،ص۸۷۳)

عطا کن شورِ رومی ، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی (کلیات فارسی،ص۸۹۷)

چو رومی در حرم دا دم اذاں من
از و آموختم اسرارِ جاں من (کلیات فارسی، ص۹۳۸)

زرومیؔ گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسودِ امیری (کلیات فارسی، ص۹۵۹)

نصیب از آتشے دارم کہ اول
سنائی از دلِ رومی برانگیخت (کلیات فارسی، ص۹۶۰)

برویم بستہ در ہارا کشاید
دو بیت از پیر رومی یا ز جامی (کلیات فارسی، ص۱۰۱۴)

عارف ہندی کہ بہ یکےاز غار ہائےقمر خلوت
گرفتہ واہل ہنداورا''جہاں دوست''می گویند (کلیات فارسی، ص۶۲۱)

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمۂ اش روش سواد (کلیات فارسی، ص۶۲۲)

پیرِ ہندی اند کے دم در کشید
باز در من دیدو بے تابانہ دید (کلیات فارسی، ص۶۲۵)

اُردو

جولان گہِ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا (کلیات اردو، ص۲۴۱)

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا (کلیات اردو، ص۲۴۱)

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے! (کلیات اردو ،ص۲۴۱)

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟ (کلیات اردو ،ص۲۶۴)

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی! (کلیات اردو ،ص۳۰۳)

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز سازِ رومی ، کبھی پیچ و تابِ رازیؔ! (کلیات اردو ،ص۳۰۹)

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں! (کلیات اردو ،ص۳۲۰)

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف (کلیات اردو ،ص۳۳۱)

عطار ہو ، رومی ہو ، رازیؔ ہو ، غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی! (کلیات اردو ،ص۳۴۸)

یا حیرت فارابیؔ یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ! (کلیات اردو ،ص۳۵۹)

نے مہرہ باقی ، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازیؔ! (کلیات اردو ،ص۳۶۳)

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں (کلیاتِ اُردو،ص۳۹۱)

یورپ سے ایک خط

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اکِ بحرِ پُر آشوب و پر اسرار ہے رومی!
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغِ راہِ احرار ہے رومی

(کلیات اردو، ص۴۴۰۔۴۴۱)

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا!

(کلیات اردو، ص۴۸۵)

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش!

(کلیات اردو، ص۵۸۰)

شکستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک!
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک!

(کلیات اردو، ص۵۸۳)

ooo

حضرت بایزید بسطامیؒ

حضرت بایزید بسطامیؒ، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی پسندیدہ شخصیات میں سے تھے چوں کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال خود عاشق رسول تھے اس لیے عاشقانِ رسول ﷺ سے گہری عقیدت فطری تھی۔ ان شخصیات میں حضرت بایزید بسطامیؒ سرفہرست ہیں۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کا رسول اکرم ﷺ سے عشق و محبت کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر خربوزہ نہیں کھایا۔ اس لیے کہ معلوم نہیں رسول اللہ ﷺ نے خربوزہ کس طرح کھایا ہوگا ایسا نہ ہو کہ سنت کی خلاف ورزی ہو جائے۔ ''رموز بے خودی'' میں علامہ نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ ایران کے صوبہ قومس کے شہر بسطام میں پیدا ہوا ہوئے۔ ان کی سن ولادت ۱۳۱ یا ۱۳۶ ہجری ملتا ہے۔ کچھ مورخین نے ۱۸۸ ہجری کو مستند قرار دیا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ ۲۶۱ ہجری میں وصال کر گئے اس اعتبار سے ۱۸۸ ہجری درست ہے۔ آپ کی والدہ نے طیفور نام رکھا تھا لیکن اپنے لقب یا کنیت بایزید کے نام سے مقبول ہوئے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ چند ماہ کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے ان کی تربیت بہترین انداز میں کی۔ تعلیم و تربیت کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ ملکِ شام روانہ ہوئے۔ وہ صحرانوردی کرتے رہے تین سال عبادت و ریاضت کے باوجود انھوں نے ایک سو ستر (۱۷۰) اہلِ علم و دانش سے اکتسابِ فیض کیا۔ حضرت سیدنا امام جعفر صادق کی صحبت میں بھی رہے۔ ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ اپنے اساتذہ کے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتے تھے۔ والدہ محترمہ کی خدمت اور بزرگوں کی اطاعت سے انھیں معرفت ملی۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''میری عمر بیس برس تھی کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اپنے ساتھ سلایا اور میں ان کے

ساتھ لیٹ گیا اور اپنا بازو بطور تکیہ ان کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ میرا ہاتھ سُن ہو گیا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے میرے ہاتھ سے جان ختم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے ان کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے سر کے نیچے سے باہر نہیں نکالا تاکہ ان کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ میں نے سورۃ اخلاص کا وظیفہ شروع کر دیا یہاں تک کہ دس ہزار مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھی اور پھر میں حقِ والدہ کے معاملہ میں اپنے ہاتھ سے بے نیاز ہو گیا۔''

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنے اشعار میں حضرت بایزید بسطامی کے عشقِ رسول ﷺ کی تعریف و توصیف میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ چوں کہ ایک عارف تھے اللہ تعالیٰ نے انھیں معرفت عطا کر رکھی تھی۔ ان کے چند اقوال نذرِ قارئین ہیں۔

- ☆ راہِ طریقت میں سب سے بڑی دولت وہ ہے جو مادر زاد ہو، اس کے بعد چشمِ بینا اور اس کے بعد گوش و ہوش ہیں اگر یہ تینوں چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر اچانک مر جانا ہی بہتر ہے۔''
- ☆ اللہ عزوجل نے اپنی خوشی سے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا اس لیے کہ بندہ ہونے کی حیثیت سے کس طرح اس کے دیدار کی تمنا کر سکتا ہوں۔
- ☆ عارفِ کامل وہی ہے جو آتش محبّت میں جلتا رہے۔
- ☆ عارفِ صادق وہی ہے جو خواہشات کو ترک کر کے خدا کی پسندیدگی کو ملحوظ رکھے۔
- ☆ لوگوں نے پوچھا کہ اللہ عزوجل بندوں کو اپنی مرضی سے جنت میں داخل نہیں کرتا؟ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا...... ''یقیناً اپنی مرضی سے ہی داخل کرتا ہے لیکن جس کو اپنی مرضی سے اعلیٰ وارفع بنادے اس کو جنت کی کیا خواہش''
- ☆ علم و خبر ایسے فرد سے سیکھو اور سنو جو علم سے معلوم تک اور خبر سے مخبر تک رسائی حاصل کر چکا ہو اور جو اعزاز دنیاوی کے لیے علم حاصل کرے اس کی صحبت سے کنارہ کش رہو اس لیے کہ اس کا علم خود اس کے لیے سودمند نہیں۔
- ☆ اللہ عزوجل اپنے محبوب بندوں کو تین چیزیں عطا فرماتا ہے۔ اول دریا کی طرح سخاوت، دوم آفتاب کی طرح روشنی، سوم زمین کی عاجزی۔
- ☆ انسانی خواہشات چھوڑ دینا درحقیقت واصل الی اللہ ہو جانا ہے اور جو واصل الی اللہ ہو جاتا ہے مخلوق اس کی فرمانبردار ہے۔

☆ بھوک ایک ایسا ابر ہے جس سے رحمت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔
☆ توحید خالص کے سوا ہر مسئلہ میں علماء کا اختلاف رحمت ہے۔
☆ ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کے تحت صبر کرے۔
☆ دو خصلتیں مخلوق کی تباہی کا باعث بنتی ہیں اول کسی بھی مخلوق کا احترام نہ کرنا، دوم خالق کے احسان کو ٹھکرا دینا۔

پاک مرداں چوں فضیل و بوسعید
عارفاں مثلِ جنید و بایزید (کلیات فارسی، ص ۶۴۸)

بود گبرے در زمانِ بایزید
گفتِ او را یک مسلمانِ سعید (کلیات فارسی، ص ۷۰۹)

گفت ایں ایماں اگر ہست اے مرید
آں کہ دارد شیخ عالم بایزید (کلیات فارسی، ص ۷۱۰)

بایزید و شبلی و بوذرازوست
امتاں را طغرل و سنجرازوست (کلیات فارسی، ص ۷۸۰)

اندر اخلاصِ عمل فردِ فرید
پادشاہے با مقامِ بایزید (کلیات فارسی، ص ۷۹۲)

تیغِ ایوبی ، نگاہِ بایزید
گنجہائے ہر دو عالم را کلید (کلیات فارسی، ص ۸۳۶)

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا (کلیات فارسی، ص ۹۰۳)

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ! (کلیات اردو۔ص ۳۶۵)

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود!
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب! (کلیات اردو۔ص ۴۰۵)

حضرت بوقلندرؒ

بوعلی قلندر: نام شاہ شرف الدین۔ عراق میں پیدا ہوئے تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے اور کچھ مدت تک دہلی کے قاضی رہے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ آپ ہریانہ کے شہر پانی پت میں ۵۰۶ھ بمطابق ۱۲۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ فخر الدین اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ ان کے والد کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ عراق سے ہجرت کر کے پانی پت میں آباد ہوئے۔ بوعلی قلندر نے ابتدائی تعلیم مولانا سید سراج الدین مکی سے حاصل کی۔ آپ کے استاد مولانا سراج الدین مکی ان سے بہت متاثر تھے۔ قرآنِ پاک بچپن میں ہی حفظ کر لیا تھا۔ ۲۰ سال تک قطب مینار میں دوسروں کو علم سکھاتے رہے۔ آپ کے خطبات کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ پورے ہندوستان سے لوگ جوق در جوق آپ کے خطبات سننے کے لیے آتے تھے۔

ان کی پیدائش کے چند روز بعد ان کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا تو بوعلی قلندر کے والد فخر الدین نے دروازہ کھولا ایک نورانی چہرے والا بزرگ دروازے پر کھڑا تھا اس نے فخر الدین کو مبارک باد دی اور کہا کہ آپ کے گھر ایک ایسا صاحبزادہ پیدا ہوا ہے کہ جس کے دل میں عشقِ الٰہی دکھائی دیتا ہے میں اس بچے کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس بزرگ کا نام مولانا فخر الدین عراقی تھا جب بچہ ان کی گود میں آیا تو انھوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تو بوعلی قلندر نے آنکھیں کھول دیں۔

حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کا ایک فارسی مجموعہ کلام میں منظرعام پر آیا جس کا بعد میں پنجابی منظوم ترجمہ بھی ہوا۔ بوعلی قلندر ایک روز خطبہ دینے کے لیے منبر پر موجود تھے کہ باہر سے ایک فقیر نے اونچی آواز میں کہا اے شرف الدین تو جس کام کے لیے دنیا میں آیا تھا تو اسے بھول چکا

ہے۔ یہ آواز سنتا تھی کہ آپ کے دل میں عشقِ الٰہی کا طوفان اُمڈ آیا اور آپ بارہ سال تک ایک دریا میں چلہ کاٹتے رہے۔ اور اللہ کی عبادت کرتے رہے۔ بارہ سال کے بعد ایک آواز آئی کہ ہم نے تیری عبادت قبول کر لی ہے جو مانگنا ہے مانگ۔ تو بوعلی قلندر نے دیدارِ الٰہی کی خواہش کر دی۔ اللہ تعالیٰ میں تیری محبت چاہتا ہوں۔ پھر آواز آئی کی ہم نے تجھ سے بڑے بڑے کام لینے ہیں اسی وقت ایک بزرگ پانی میں آئے اور انہیں باہر لے آئے۔ بوعلی قلندر سخت ناراض ہوئے کہ اے بزرگ تو نے میری بارہ سال کی محنت ضائع کر دی ہے۔ وہ بزرگ بولے بوعلی قلندر میں علی ابن طالب ہوں۔ بوعلی قلندر ان کے قدموں پر گر پڑے۔ آپ پر علم منکشف ہو گئے اور اس دن سے آپ کو قلندر کا خطاب ملا۔ دنیا میں اس وقت تک کوئی قلندر نہیں بن سکتا جب تک اسے علی ابن طالب خود علم عطا نہ کر دیں۔ آپ حضرت شہاب الدین چشتی کے مرید تھے آپ دنیا کو ترک کر کے مدتوں تک جنگلوں میں پھرتے رہے اور پھر پانی پت میں ڈیرہ جمایا اور ایک خانقاہ تعمیر کی جو مرجع خلائق بن گئی۔ سو سال کی عمر پا کر ۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔ بعض مؤرخین نے تاریخ وفات ۱۳۲۴ء بھی تحریر کی ہے۔ آج بھی ہزار لوگ مزاروں پر جاتے ہیں۔

باتو میگو یم حدیث بو علیؒ
در سواد ہند نامِ اوجلی (کلیات فارسی، ص ۲۵)

درحضورِ بو علی فریاد کرد
اشک از زندان چشم آزاد کرد (کلیات فارسی، ص ۲۶)

اے شناسائے مقام بوعلیؒ
جرعۂ آرم ز جامِ بو علیؒ (کلیات فارسی، ص ۱۵۸)

بوعلی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت (کلیات فارسی، ص ۲۷۶)

بوعلی دانندہ آب و گل است
بے خبر از خستگیہائے دل است (کلیات فارسی، ص ۸۶۵)

اُردو

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں! (کلیات اردو، ص ۴۴۰)

روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بو علی و رازی! (کلیات اردو، ص ۵۵۱)

○○○

حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ

عبدالرحمٰن کا لقب نور الدین تھا جب کہ جامی تخلص تھا آپ ایران کے ممتاز شاعر اور صوفی تھے۔۔صوبہ خراسان کی ولایت جام کے ایک گاؤں خرجرد میں ۸۱۷ھ کو پیدا ہوئے۔ آپؒ احمد دشتیؒ کے صاحبزادے تھے جن کی صفاہان کے ایک محلے اصفہان میں رہائش تھی۔ شیخ الاسلام احمد جامی سے عقیدت کی بنا پر جامی تخلص رکھا۔ جامی نویں صدی ہجری کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کے بعد فارسی زبان کا کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ جامی نے نظم میں بیشتر کتابیں لکھیں۔ جامی نے غزلیں، قصیدے، رباعیات اور موثر نعتیں غرض ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ جامی نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ جامی کی تصانیف نے ترکی اور ہندوستانی شعراء کو بہت متاثر کیا ہے۔ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات اور سمرقند گئے جو ایک زمانے میں اسلامی علوم وفنون اور ایرانی ادب کے مشہور مراکز تھے۔ تعلیم کے بعد سلوک وعرفان سے رجوع کیا اور سعد الدین محمد کاشغری اور خواجہ علی سمرقندی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ علم وعرفان میں اتنی ترقی کر گئے کہ بہاء الدین نقشبندی کے حلقہ طریقت میں ان کا شمار خلفاء میں ہونے لگا۔

۱۴۷۲ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ آپؒ نے کبھی فقر کا اظہار نہ کیا بلکہ آپ کا خیال تھا کہ کبھی کشف وکرامات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے آپ نے خود کو شعر وشاعری اور علوم ظاہری میں چھپائے رکھا۔ آپؒ نے فرمایا کہ اس انداز کا اخفا سلوک کی پہلی شرط ہے آپؒ کے ذہن پر شاعری کبھی عار نہ ہوتی اور نہ کبھی آپؒ نے ذکر قلبی سے غفلت برتی۔ آپؒ علم وعقل میں بے پایاں تھے آپ جیسے ذہین وفطین علماء شاذ ونادر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ درویشِ حق آگاہ تھے اور ظاہری وباطنی علوم

میں کامل تھے۔

آپ بے حد خوش مزاج خوش خلق بذلہ سنج اور شیریں سخن تھے۔ آپؒ کی گفتگو حکمت و دانائی لیے ہوئے تھی آپ کی گفتگو میں عقل و حکمت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا۔

آپ کی تصانیف میں ''نغمات الانس''، ''سلسلۃ الذہب''، ''سلامان وابسال''، ''تحفۃ الاحرار''، ''سبحۃ الابرار''، ''لیلیٰ مجنوں''، ''فردنامہ اسکندری اور ''شواہد النبوۃ'' ہیں۔ غزلوں کے تین مجموعے آپ کی یادگار ہیں۔ ان کی ایک مثنوی ''یوسف زلیخا'' کو بھی خوب شہرت نصیب ہوئی۔ آپ کا کلام فصاحت و بلاغت اور سوز و گداز کا مرقع ہے۔ نثر میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔

۸۱ سال کی عمر میں واصل فرمایا۔ آپ کا مزار عالیہ خیابان ہرات میں واقع ہے اپنے مرشد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثر او علاجِ خامیم (کلیات فارسی، ص ۲۱)

گہے شعرِ عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم (کلیات فارسی، ص ۹۱۰)

برویم بستہ در ہارا کشاید
دو بیت از پیر رومی یاز جامی (کلیات فارسی، ص ۱۰۱۴)

اُردو

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صدا نوری وہزار جامی!
(کلیات اردو، ص ۵۵۰)

ooo

حضرت سید جنیدؒ بغدادی

یہ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ ہوئے ہیں۔ تصوف میں ان کا بڑا مقام ہے۔ ان کا نام ابوالقاسم الجنید تھا۔ کنیت ابوالقاسم، القابات سید الطائفہ، طاؤس العلماء تھے۔ آپ کے والد محمد دین جنید نگینہ فروش تھے۔ سید جنید بغدادی بغداد میں پیدا ہوئے۔ اور وہی آپ کا وطن ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے طریقت میں پیروکار تھے۔ آپ طریقت وحقیقت میں اہل صفا کے سردار تھے۔ آپ اپنے زمانے کے امام السادات اور مقتدا تھے۔ آپ کی صحبت میں حارث محاسبی محمد قصابؒ نے شب و روز گزارے۔ ردیم، ابوالحسن، نوری، شبلی، اور خزاز اولیاء وصوفیا کے سلسلے آپ سے منسوب ہیں۔ جو مشائخ آپ سے نسبت رکھتے وہ جنیدیہ کہلاتے۔ اسی لیے امام الائمہ اور سید الطائفہ آپ کا لقب ہے۔ آپ کا ہر قول طریقت میں سند ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ متقدین ومتاخرین میں سے کوئی آپ پر اعتراض کی جرأت کرے۔

ایک روایت ہے کہ سرورِ کونین ﷺ کو کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ تشریف فرما ہیں اور حضرت جنید بغدادیؒ حاضر خدمت ہیں اسی دوران کوئی شخص آیا اور اس نے ایک فتویٰ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنیدؒ سے فتویٰ لو۔ اس شخص نے کہا کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں دوسروں سے فتویٰ لینے کا کیا مقصد یا رسول اللہ ﷺ۔ سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح تمام انبیاء کو اپنی اپنی امت پر فخر ہے ایسے ہی مجھے اپنے جنیدؒ پر فخر حاصل ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت دل کس وقت خوش رہ سکتا ہے فرمایا اس وقت جب دل جلوہ گاہِ کبریا ہو جائے (یعنی وہ وقت جب خدا ہی خدا دکھائی دے)

حضرت جنید بغدادی فرمایا کرتے کہ مردوں کو خصائل مردانہ اختیار کرنے چاہئیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ وہ شخص کبھی خوش نہیں رہ سکتا جسے معرفتِ خداوندی حاصل نہ ہو۔ فرمایا گزرے ہوئے وقت کا لوٹ آنا ممکن نہیں ہے کوئی چیز وقت سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ فرمایا مردانگی اسے کہتے ہیں کہ دوسروں پر اپنا بوجھ نہ ڈالو اور اپنے پاس جو کچھ جمع پونجی ہے وہ دوسروں میں بانٹ دو۔ فرمایا چار خصلتوں کا نام خلق ہے۔ الفت، سخاوت، شفقت اور نصیحت۔

ان کا نظریہ یہ تھا کہ فنا میں بقا ہے اور بقا واصل باللہ ہونا ہے۔ اقبال نے کئی مقام پر ان کا ذکر کیا ہے ''جاوید نامہ'' میں ان کے تصوف پر روشنی ڈالی گئی جوان کی روح، اقبال کو بتاتی ہے۔

۲۹۷ھ ۲۷ رجب بروز شنبہ آپ نے رحلت فرمائی۔ روایت ہے کہ جب وصال کا وقت قریب آیا تو زبان پر تسبیح جاری تھی چار انگلیاں بند اور انگشت شہادت کھلی تھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ بغداد میں آپ کا مزار عالیہ ہے۔

پاک مرداں چوں فضیل و بوسعید
عارفاں مثلِ جنید و بایزید (کلیات فارسی، ص ۶۴۸)

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا (کلیات فارسی، ص ۹۰۳)
شاعر: عزت بخاری

اُردو

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقر جنیدؒ و بسطامیؒ! (کلیات اردو، ص ۳۶۵)

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جُنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب! (کلیات اردو، ص ۴۰۵)

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں اک جنیدی و اک اردشیری! (کلیات اردو، ص ۴۱۰)

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی (کلیات اردو، ص ۶۸۵)

منصور حلاجؒ

حسین حلاج بن منصور البیضاوی جو منصور حلاج کے لقب سے مقبول ہوئے۔ان کی کنیت ابو المغیث تھی۔ ۸۵۸ء کے قریب بیضا (فارس) نواح طور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ہی صوفیوں کے ایک گروہ سے منسلک ہوئے حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔منصور حلاج معروف صوفی بزرگ جو تصوف کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔وحدت الوجود کے نظریہ میں مستغرق رہتے۔شیخ فرید الدین عطار نے تذکرہ الاولیاء میں لکھا ہے کہ پہلے وہ تستر میں آئے ،اور دو سال تک شیخ سہل بن عبداللہ کی خدمت میں رہے، پھر بغداد گئے، پھر بصرہ گئے اور عمرو بن عثمان کی خدمت میں رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی ،تقریباً اٹھارہ ماہ ان کی خدمت میں رہے۔یہیں منصور نے ابو یعقوب اقطع کی بیٹی سے شادی کی۔کسی وجہ سے ان کے استاد عمرو بن عثمان منصور ان سے ناراض ہوگئے۔اس کے بعد منصور حلاج بغداد تشریف لائے اور حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت جنید بغدادی نے انہیں سکوت اور خلوت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔حضرت جنید بغدادی نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جلد ہی اپنے خون سے دار کی لکڑیوں کو سرخ کرو گے،منصور نے جواب دیا کہ جس دن میں اپنے خون سے دار کی لکڑیوں کو سرخ کروں گا،اس دن آپ اہل فتویٰ کا لباس پہنیں گے۔حضرت جنید نے جب منصور کے سوالات کے جوابات نہ دیے،تو وہ ناراض ہوکر اور بغیر اجازت تستر چلے آئے اور ایک سال وہاں رہ کر غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔بعض لوگ ان کے مخالف ہوئے تو ان کے استاد گرامی عمرو بن عثمان بھی ان کے سخت مخالفت ہو گئے ایسے ایسے بیانات دیئے کہ منصور نے دل گرفتہ ہوکر جامۂ تصوف اتار پھینکا۔قبا پہننے لگے اور دنیا کے کاموں میں لگ

گئے۔ پھر یوں ہوا کہ منصور غائب ہو گئے اور خراسان، ماورالنہر، سیستان، اہواز آئے یہاں کے لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا وہاں انھوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ منصور نے دوبارہ جامۂ تصوف پہن لیا۔ اس کے بعد منصور مکہ معظمہ پہنچے۔ اسی سفر میں انھیں شعبدہ باز ہونے کی تہمت لگائی گئی۔ کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ سے واپسی پر منصور کے احوال میں تبدیلی پیدا ہوئی وہ جو باتیں کرتے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں یا پھر یوں کہیے کہ لوگ ان کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عجیب وغریب باتیں سن کر شہر بدر کر دیا۔ عجیب وغریب باتوں نے لوگوں کو ان کے خلاف زبان درازی پر مجبور کر دیا اور خلیفہ وقت تک پہنچائیں اور انھیں بتایا کہ منصور انا الحق کہتا ہے۔

علماء نے ان کے نعرہ ''انا الحق'' پر منصور کے قتل کا فتویٰ دیا۔ خلیفہ نے کہا جب تک کہ حضرت جنید بغدادی اس فتوے پر دستخط نہ فرمائیں عمل درآمد نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت جنید جبہ و دستار پہن کر دربار میں آئے اور فتوی پر لکھا نحن نحکم بالظاہر (ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں) اور فتویٰ ظاہر پر دیا جاتا ہے، باطن کا حال خدا جانتا ہے۔ اس طرح منصور کی وہ پیشگوئی پوری ہوگئی جو انھوں نے حضرت جنید کے جواب میں کی تھی کہ میں جس دن دار کی لکڑیوں کو اپنے خون سے سرخ کروں گا اس دن آپ اہل فتویٰ کا لباس پہنیں گے۔

منصور کو پھانسی پر لٹکانے سے قبل انھیں ایک سال قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا جیل خانے کے دروازے پر روزانہ لاکھوں افراد جمع ہو جاتے جو منصور سے مختلف مسائل کے بارے میں پوچھتے۔ پھر ملنے والوں پر پابندی لگا دی گئی۔ عطا اور عبداللہ بن خفیف ان سے ملتے رہے اور انہیں سمجھاتے رہے کہ اس قول سے معذرت کر لیں تا کہ آپ کو قید و بند سے رہائی دلائی جا سکے۔ منصور نے جواب دیا کہ جس نے کہا ہے اسی سے کہو کہ وہ معذرت کرے۔ عطا، منصور کا یہ جواب سن کر رو پڑے اور کہا کہ ہم خود منصور کی سپاہ کے ایک لشکری ہیں۔

منصور حلاج کو ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ (۹۲۲ء) کو بغداد میں محلہ باب الطاق میں دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس وقت منصور کی عمر ستانوے سال تھی۔ سفینۃ اولیاء میں منصور کے قتل کی تاریخ ۲۵ ذی الحجہ جب کہ نفحات الانس میں ۲۴ ذیقعدہ مذکور ہے۔ پہلے روز ان کو دار پر چڑھا دیا گیا دوسرے روز ان کی لاش کو جلایا گیا، تیسرے روز ان کی خاک کو ہوا میں اڑایا گیا۔

روایت میں آتا ہے کہ منصور سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے اور ماورالنہر گئے اس

کے بعد وہ بغداد چلے گئے اور تیسری مرتبہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے اور عرفات میں قیام کے وقت انھوں نے دعا کہ کہ اے خدا مجھے رسوا کرنا کہ لوگ مجھے برا بھلا کہتے رہیں۔

علامہ محمد اقبال نے منصور حلاج کا ذکر اپنے فارسی اور اردو کلام میں کیا ہے۔ وہ اس بزرگ سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شور ہا افگندہ در جانِ حرم
(کلیات فارسی، ص۷۰۴)

باز ایں حلاج بے دار و رسن
نوعِ دیگر گفتہ آں حرفِ کہن
(کلیات فارسی، ص۷۴۰)

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
(کلیات اردو ، ص۳۱۵)

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!
(کلیات اردو ، ص۵۸۰)

ooo

حضرت فخر الدین رازیؒ

علامہ فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسینی ۱۱۴۹ء کو ایران کے شہر ''رے'' میں پیدا ہوئے۔ آپ نے محدث، فقیہ، فلسفی کے حوالے سے شہرت پائی۔ ان کے والد ضیاء الدین عمر خطیب تھے۔ اسی لیے آپ کو ابن الخطیب بھی کہا جاتا ہے۔ شافعی اور اشعری عقیدہ رکھنے والے تھے۔ تبلیغ اسلام کے لیے بخارا، سمرقند، غزنی کے دورہ جات کیے اس کے بعد پنجاب کا دورہ کیا اور ہرات میں ڈیرہ جما لیا اور پھر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور وہیں ایک مدرسہ میں شیخ الاسلام کی حیثیت سے تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے آپ کی قدر دانی کرتے ہوئے آپ کی سرپرستی کی۔ آپ کی بے پناہ عزت واحترام کو دیکھ کر لوگ رشک کرنے لگے اور کئی لوگ ان کے حاسد بھی بن گئے انھی حاسدوں میں سے کسی نے آپ کو زہر دے دیا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ ابنِ سینا اور فارابی کے بہت معترف تھے۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نے دینِ اسلام کو فلسفیانہ پیرائے میں رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کے علم وفضل کو سبھی نے تسلیم کیا۔ علم وفضل کی وجہ سے علماء نے آپ کو عزت واحترام کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیا ہے۔ علمِ کلام میں آپ کی معروف تصنیف ''اساس التقدیس'' ہے۔ دوسری متداول تصنیف کا نام ''مفاتیح الغیب'' ہے جو تفسیر کبیر کے نام شہرت دوام پا چکی ہے۔ علامہ فخر الدین رازی ۱۲۰۹ء انتقال کر گئے۔

علامہ محمد اقبال نے دنیا بھر کے فلاسفروں کو نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ان کے علم وفضل کو بھی تسلیم کیا ہے۔ فخر الدین رازی بھی ایسے ہی فلسفی ہیں جن کے بارے میں علامہ محمد اقبال نے اپنے کلام

میں ان کو ہدیہ تحسین پیش کیا ہے۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی! (کلیات اردو۔ ص ۳۰۹)

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق! (کلیات اردو۔ ص ۳۲۶)

عطار ہو رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی! (کلیات اردو۔ ص ۳۴۸)

نے مُہرہ باقی، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی! (کلیات اردو۔ ص ۳۶۳)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف (کلیات اردو۔ ص ۳۷۰)

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرف رازی! (کلیات اردو۔ ص ۳۷۵)

روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بو علی و رازی (کلیات اردو۔ ص ۵۵۱)

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی (کلیات اردو۔ ص ۶۸۵)

ooo

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اہلِ تصوف سے بہت پیار کرتے تھے ان کی محافل میں بیٹھنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ ان کی عارفانہ شخصیت کا منفرد پہلو اہلِ تصوف ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ عشقِ رسولﷺ کی ایسی منزل پر تھے جس کا ادراک لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی مشہور زمانہ رباعی:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

ترجمہ ''اے خدا! تو دونوں جہانوں سے غنی ہے اور میں ایک درماندہ فقیر ہوں۔ تیرا کرم ہوگا کہ قیامت کے دن میری معافی قبول کرلے اور مجھے بخش دے اور اگر تو کسی وجہ سے میرا حساب کتاب کرنا اور میرے اعمال نامے کا جائزہ لینا ضروری خیال کرے تو اتنا کرم کرنا۔ میری فردِ گناہ، آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰﷺ کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا۔''

اقبال کا عاشقانِ رسولﷺ سے لگاؤ اور محبت ناقابل بیان ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نوازؒ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں جن سے علامہ اقبال بہت عقیدت رکھتے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ المعروف خواجہ غریب نواز کی پیدائش ایران کے صوبہ سیستان کے شہر سنجر میں ۱۱۴۱ء میں ہوئی۔ سنجر کو سلجوقیہ خاندان کے حکمران اور فاتح سلطان سنجر نے گیارہویں صدی عیسوی میں اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ جس وقت خواجہ غریب نواز کی پیدائش ہوئی اس

وقت مسلمانانِ عالم شدید انتشار و افتراق سے دوچار تھے۔ بیت المقدس پر عیسائی قابض تھے اور وہاں عیسائی افواج ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر چکی تھیں۔ لاتعداد مسلمان ملک بدر ہو چکے تھے۔ مسلمان سائنسی و روحانی علوم سے روگردانی کر چکے تھے اسپین اور شمالی افریقہ کے مسلم حکمرانوں کی باہمی جنگوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الفانسو نے ان پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ اندرونی طور پر فتنہ وفساد کا یہ عالم تھا کہ حسن بن صباح کے فدائیوں نے عباسی خلیفہ المسترشد باللہ کو قتل کر دیا۔ ملتِ اسلامیہ کا یہ انتشار شہر سنجر تک آ پہنچا تھا۔ حضرت خواجہ غریب نواز کی عمر ابھی تیرہ برس کی ہی تھی کہ حسن بن صباح کے فدائیوں نے سنجر پر حملہ کر دیا اور پورا شہر تباہ و برباد کر دیا کئی افراد کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ خواجہ غریب نواز کے والد سید غیاث الدین اپنے خاندان کو لے کر بڑی مشکلوں سے جان بچاتے ہوئے خراسان روانہ ہوئے۔ خراسان میں انھوں نے نیشاپور میں سکونت اختیار کی۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے والد کا نام سید غیاث الدین اور والدہ محترمہ کا نام مبارک ماہ نور تھا۔ ان کے والد علاقہ کے نہایت معزز شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ متقی و پرہیز گار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ثروت بھی تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی عمر ابھی پندرہ برس تھی کہ ان کے والد سید غیاث الدین رحلت فرما گئے اس سانحہ کو ابھی ایک سال بھی نہ گزرا کہ ان کی والدہ محترمہ ماہ نور بھی دنیا سے پردہ کر گئیں۔

خواجہ غریب نواز کے والد چونکہ صاحبِ ثروت تھے اس لیے ان کے حصہ میں خاصی دولت اور وسیع و عریض باغ اور ایک پن چکی ورثہ میں حاصل ہوئی۔ ایک روز ایک بزرگ ابراہیم قندوزی وہاں تشریف لائے یہ مردِ درویش مجذوب تھے۔ خواجہ صاحب نے انھیں بڑی عزت واحترام سے انہیں بٹھایا اور کھانا پیش کیا۔ درویش نے ان پر ایسی نگاہ کرم ڈالی کہ ان کے اندر کی دنیا تبدیل ہوگئی۔ خواجہ معین الدین چشتی سلوک کی اعلیٰ منزلوں کے راہی بن گئے۔ ان کا من منور ہو چکا تھا اور دنیا و مافیہا سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ نے سمرقند کے عالم دین مولانا حسام الدین بخاری کے آگے زانوئے تلمذ طے کیے۔ کچھ عرصہ علوم وفنون کے مرکز بخارا میں گزارا۔ بیس سال کی عمر میں آپ ریاضی، فلکیات اور علم طب کے ماہر ہوگئے تھے۔ شعور بیدار ہو چکا تھا ابھی مزید کچھ سیکھنے کی تمنا تھی اس تمنا کو پورا کرنے کے لیے خواجہ عثمان ہارونی کے پاس پہنچے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خواجہ عثمان ہارونی چشتیہ سلسلہ کے روحانی بزرگ تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان کے مختلف شہروں میں لوگوں کو رشد و ہدایت دیتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے دوران سفر اصفہان

میں خواجہ بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی انھوں نے بیعت کی درخواست کی جو آپ نے قبول کر لی۔
اصفہان سے حضرت بختیار کاکی کے ہمراہ خواجہ صاحب مکہ معظمہ پہنچے۔ رسول اکرم ﷺ کی روحانی زیارت بھی ہوئی جس میں آپ کو اجمیر جانے کو کہا گیا۔ ۱۱۸۹ء آپ مدینہ منورہ سے بغداد پہنچے کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا پھر افغانستان کے راستے لاہور پہنچے۔ لاہور میں حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار پر مراقبہ میں مشغول رہے مراقبہ کے بعد حجرہ سے باہر تشریف لائے تو یہ شعر ارشاد فرمایا:

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نور خدا
ناقصاں را پیرِ کامل ، کاملاں را رہنما

اس کے بعد حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہوئے۔ خواجہ معین الدین چشتی ملتان تشریف لے گئے جہاں آپ نے پانچ سال گزارے۔ اور سنسکرت، پراکرت اور دیگر زبانیں سیکھیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا عمیق نظری سے مطالعہ کیا۔ آپ نے راگ اور سُر کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ساز بجانا بھی سیکھا۔ اس کے بعد اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اجمیر کے قریب اجے پال نامی ایک مشہور جوگی رہتا تھا جس کے طلسم اور جادو کی پورے ہندوستان میں شہرت تھی۔ اس کے ایک ہزار پانچ سو چیلے تھے۔ ان میں سے سات سو چیلے ماہر جادوگر تھے بقیہ بھی اپنے ہنر میں ماہر تھے۔ حضرت خواجہ کی کرامتیں اجمیر میں زبان زدِ عام ہوئیں تو اجے پال آپ کو نیچا دکھانے کے لیے مختلف قسم کے جادو ٹونے کرنے لگا لیکن خواجہ صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد اجے پال ہوا میں اڑنے لگا۔ تاکہ خواجہ پر بلندی سے کوئی وار کر سکے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے نعلین کو اشارہ کیا اور نعلین اجے پال کے سر پر پہنچ گئیں اور لوگوں نے دیکھا کہ فضا میں حضرت خواجہ کی جوتیوں نے اسے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اجے پال اپنے فن میں ماہر تھا لیکن اب اسے احساس ہوا کہ اس کے فن کی حدیں یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی ہیں۔ لہٰذا وہ نیچے اترا اور صدقِ دل سے معافی کا طلب گار ہوا آپ نے معاف کر دیا اور وہ اپنے پندرہ سو چیلوں سمیت مسلمان ہو گیا۔

آپ ۶ رجب المرجب ۶۳۳ھ بمطابق ۱۲۳۵ء کو رحلت فرما گئے۔ آپ کا مزار اجمیر شریف میں مرجع خلائق ہے۔ آپ کا مزار سلطان محمود خلجی نے پختہ کرایا۔ آپ کے مزار کے قریب مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ مغل بادشاہ شاہ جہان نے آپ کے مزار کے گنبد کو سنگِ مرمر سے تعمیر کرایا۔ ہر سال ۶ رجب کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

چشتی، خواجہ معین الدین اجمیری

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
(کلیات اردو، ص ۸۷)

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
(کلیات اردو، ص ۹۶)

ooo

شیخ فرید الدین عطارؒ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا فکری خزینہ فارسی شاعری میں محفوظ ہے۔اُن کے نظریات کا نچوڑ بھی فارسی کلام کی وجہ سے مقبول ہوا۔اقبال کے اہم ترین نظریات فارسی ادب کی وجہ سے دنیا بھر میں پھیلتے گئے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے تقریباً تمام صوفیا شعراء کرام کے کلام کا مطالعہ کیا۔انھوں نے ان موضوعات کو کلاسیکی شعراء کرام کے کلام سے اخذ کیا جوان کی ذہن کی کسوٹی پر پورا اترتے تھے۔مولانا رومی،مولانا جامی،شیخ سعدی اور ایسے ہی دیگر شعراء کرام کی طرح اقبال نے شیخ فرید الدین عطار کے کلام میں گہری دل چسپی لی۔اقبال کو شیخ فرید الدین عطار کے صوفیانہ کلام سے اپنائیت کی خوشبو محسوس ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

شیخ فرید الدین عطار ۱۱۱۹ء کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔فارسی زبان وادب کے معروف شاعر تھے۔جوانی کا زمانہ علوم ومعارف کی تحصیل مشائخ،کی خدمات،تہذیبِ نفس اور کسبِ علوم میں گزارا۔آخر میں مقامِ ارشاد پر فائز ہوئے اور اہلِ دل کا کعبہ بنے۔مولانا روم نے بھی ان کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔علامہ اقبال بھی عطار سے بہت متاثر تھے۔فرید الدین عطار نے مصر،دمشق، ہندوستان،ترکستان اور مکہ کی سیاحت بھی کی تھی۔۱۲۲۹ء آپ کا سالِ وفات ہے۔آپ کی تیس کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ان میں سے تین خاص طور پر مشہور ہیں۔اول قصائد اور غزلیات کا دیوان جس میں دس ہزار کے قریب اشعار ہیں جو قصائد،نعت اور پند و معرفت پر مشتمل ہیں۔دوم تذکرۃ الاولیا سوم مثنوی منطق الطیر مؤخر الذکر کتاب میں وحدت الوجود کا فلسفہ بن گیا گیا ہے۔

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطار کرد (کلیاتِ فارسی،ص۱۱)

مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید (کلیاتِ فارسی،ص۵۳۸)

عطارؒ فریدالدین

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا
خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
نگہ پیدا کر اے غافلِ تجلّی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!
نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ! (کلیات اردو، ص۳۱۴)

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی! (کلیات اردو، ص۳۴۸)

مقامِ ذکر، کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا! (کلیات اردو، ص۴۸۵)

ooo

حضرت فارابیؒ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے حُسنِ تخیّل کا عکس صوفی دانش وروں سے حاصل کیا۔ اقبال مسلمان صوفیائے کرام کے تقریباً سلسلہ عالیہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ انھیں خودی، خدا، کائنات، انسان، انسانیت، بہادری، جرأت اور شجاعت کا پیغام دینے والے مسلمان مبلّغین، مفسّرین، محققین، مرتبین، مولفین اور مصنفین سے لگاؤ رہا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی زندگی میں جو اقبال کی شخصیت کے اس پہلو سے آشنا نہیں تھے ان کے وصال کے بعد وہ اقبال کو درویش صفت شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ علامہ اقبال ابو النصر محمد فارابی کی شخصی عظمت اور فلسفۂ زیست سے واقفیت رکھتے تھے۔ ترکستان سے علامہ اقبال کی عقیدت بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان تمام امور کی وجہ سے اقبال کی اپنے عہد کے نامور دانش ور فارابی سے انسیت قابل تعریف ہے۔

ابو النصر محمد الفارابی، فاراب (ترکستان) میں ۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے ممتاز اور جید علماء سے اکتسابِ فیض کیا۔ کچھ عرصہ بغداد میں گزارانے کے بعد حلب چلے گئے جہاں فرمانروا سیف الدولہ کے مقربین میں شامل ہوئے۔ یونانی فلسفے پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ الفارابی نے تخلیق کائنات، بقائے روح اور موت کے بعد سزا و جزا جیسے مسائل پر ارسطو اور افلاطون کے درمیان بنیادی موافقت بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ افلاطونی مکتب فکر کے ایک جدید اسلامی شاخ کے نمائندہ اور بانی تھے۔ اہلِ عرب اسے ''استاد ثانی'' (بعد از ارسطو) کے نام سے بھی جانتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق وہ دنیا کی ۷۰ زبانیں بول سکتے تھے۔ فارابی کو ریاضی اور موسیقی کے فنون میں بھی کمال حاصل تھا۔ فارابی کو بعض نئی دھنوں کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف فلسفیانہ

موضوعات پر بہت بلند پایہ مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف ''الجمع بین رای الحکیمین''، ''رسالہ فصوص الحکم''، ''سیاستہ المدینہ''، ''آراء اہل المدینہ الفاضلہ اور کتاب الموسیقی الکبیر'' شامل ہیں۔

ماجد فخری نے الفارابی کو عرب نوفلاطونیت کا بانی اور پروکلس کے بعد اس فلسفیانہ تحریک کی تاریخ میں پہلی ''نمایاں شخصیت'' قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ الفارابی نوفلاطونی کے ساتھ ساتھ ارسطوئی بھی تھے۔ انھوں نے ''روح کے بارے میں'' ۲۰۰ مرتبہ اور حتیٰ کہ ''طبیعیات'' ۴۰ مرتبہ پڑھی تھی۔ چنانچہ ان کا ارسطوئی اصطلاحات کا استعمال کرنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ انھوں نے اپنی زیادہ تر کتب بغداد میں تصنیف کیں انھوں نے دمشق، مصر، ہران، اور حلب کے اسفار بھی کیے۔

الفارابی کا سیاسی فلسفہ بھی غور طلب ہے اس نے اپنی دنیا کو سیاسی اعتبار سے کئی حصوں میں منقسم کیا۔ مثلاً وہ معاشرے کی تین اقسام بیان کرتے ہیں جو کامل ہیں ان کا آئیڈیل ''مدینۃ الفضیلۃ'' وہ ہے جو نیکی اور مسرت کی جستجو کو اپنا نصب العین بنائے اور جہاں نیکیوں کی فراوانی ہو۔ الفارابی کے مطابق اخلاق صرف اس ریاست میں مکمل ہو سکتے ہیں جو محض سیاسی ادارہ نہیں بلکہ مذہبی جماعت بھی ہو۔ ۸۷۰ تا ۱۰۲۳ء کے درمیانی عرصے اور اس دور کے چار دیگر اہم مفکرین جن میں یحییٰ ابن عدی، ابوسلیمان سجستانی، ابن یوسف العامری اور ابوحیان التوحیدی کا عمیق مطالعہ کرنے سے ان سب کو فارابی مکتبہ کا حصہ ماننا پڑتا ہے۔ الفارابی نے ایک ہمہ گیر مذہب کو بطور آئیڈیل اپنایا جس میں دیگر تمام مذاہب واحد کائناتی مذہب کے علامتی اظہار خیال کیے گئے۔ اس کا یہ آئیڈیل آج بھی ہمارے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ الفارابی ۹۵۰ء میں وفات پا گیا۔

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم (کلیات فارسی، ص ۲۳۰)

یا حیرت فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ! (کلیات اردو، ص ۳۵۹)

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیّل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی (کلیات اردو، ص ۲۳۸)

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی! (کلیات اردو، ص ۲۶۷)

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ! (کلیات اردو، ص ۳۵۹)

ooo

حضرت امام غزالیؒ

ابو حامد محمد بن حامد الغزالی اپنے عہد کے ممتاز دانشور تھے جنھوں نے اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کی خوبیوں کا تعین کیا۔ مسلمان مفکّرین میں انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا تاریخ اور سیاسیات کے طالب علم حضرت امام غزالیؒ کے سیاسی و سماجی نظریات سے یقیناً واقف ہوں گے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنے عہد میں حضرت امام غزالیؒ کے سیاسی نظریات کی ضرورت محسوس کی۔

ابو حامد محمد بن حامد الغزالی ۵۰۵ھ بمطابق ۹۵۸ء میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غریب آدمی تھے اور انھیں علم اور دین سے گہری رغبت تھی وہ اکثر نیک اور صالح اولاد کی دعا مانگا کرتے تھے۔ اُن کی دعا کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول کیا اور انھیں امام غزالیؒ کی صورت میں بیٹا عطا کیا۔ جس نے آگے چل کر اپنے خاندان کا نام روشن کیا، اور نیک نامی میں دنیا بھر میں مقبول ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۳۴ سال تک مدرسہ نظامیہ بغداد کے پرنسپل رہے، آپ علم دین کے مجدد، مبصر، شریعت کے مفسّر، دینی قوانین اور مسائل کے مجتہدانہ رائے رکھنے والے عالم، علم اخلاق او ررروحانیت پر فلسفیانہ انداز سے بحث کرنے والے۔ علم نفسیات کے ماہر، تصوف اور معرفت کی حقیقت بیان کرنے والے، اسلامی معاشرت اور ثقافت کے نکتہ داں، تعلیم وتربیت کے ماہر، اسلامی زندگی کا صحیح نظریہ پیش کرنے والے دنیائے اسلام کے عظیم مفکّر اور مدبر حضرت امام غزالی کا نام محمد، حجتہ الاسلام لقب اور غزالی عرف تھا۔ دراصل عربی زبان وادب میں غزل کاتنے کو کہتے ہیں چونکہ آپ کے خاندان میں سوت کات کر بیچا جاتا تھا اسی مناسبت سے انھیں غزالی کہا جاتا ہے۔

وہ اپنے شہر کے ایک مدرسہ میں پڑھتے رہے احمد بن محمد راز کانی سے تعلیم حاصل کرتے

رہے اس کے بعد انھوں نے جرجان کے مدرسے میں داخلہ لیا وہ ایک عرصہ تک امام ابونصر اسماعیلی سے بھی اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ اس زمانے میں استاد جو کچھ بولتا شاگرد اسے نوٹ کرتے رہتے تھے یوں ایک ضخیم کتاب امام غزالی نے بھی لکھ لی اور واپس وطن جاتے ہوئے راستے میں ڈاکوؤں نے تمام اشیاء لوٹ لیں۔ امام غزالی ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور التجا کی کہ صرف میری کتاب مجھے واپس کر دی جائے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے یہ کہہ کر کتاب واپس کر دی کہ صاحبزادے لگتا ہے تم نے ابھی کچھ بھی نہیں سیکھا۔ ایک کتاب کے کھو جانے سے تیرا سارا کچھ چلا گیا اس کو سینے میں محفوظ کر لیتے تو تمہارا علم کبھی کوئی نہ چھین سکتا تھا'' اس بات کا امام غزالی پر بہت اثر ہوا انھوں نے تین برس میں مکمل کتاب از بر کر لی۔

اپنے دور میں نیشاپور میں ''مدرسہ بیہقیہ'' امام الحرمین تھے جن کی قابلیت کے اس وقت کے تمام علماء معترف تھے۔ امام غزالی نے نیشاپور جا کر ان سے علمی پیاس بجھائی۔ امام غزالی کا امام الحرمین کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ امام الحرمین کے شاگردوں کی تعداد چار سو تھی جن میں سے تین طالب علم ذہانت و فطانت، قابلیت اور علم کے اعتبار سے ممتاز اور منفرد تھے اور عام طور پر مساوی سمجھے جاتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی کو اپنے ہم عصر اور ہم پلہ ہراسی اور احمد بن خواضی پر بھی فوقیت حاصل تھی۔ امام الحرمین امام غزالی کی یہ کہہ کر تعریف کیا کرتے تھے کہ ''غزالی علم کا سمندر ہے'' امام غزالی نے علم میں بڑا نام پیدا کیا لیکن انھوں نے تا دمِ مرگ اپنے استاد کا دامن نہ چھوڑا۔ امام الحرمین کی وفات کے بعد انھوں نے نیشاپور کو خیر باد کہا۔

امامِ غزالی جب نظام الملک کے دربار میں پہنچے تو ان کا مباحثہ دربار میں موجود علماء سے ہوا۔ امام غزالی نے ان کی زبانیں بند کر دیں۔ نظام الملک پر اس کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے مدرسہ نظامیہ کا صدر مدرسی امام غزالی کو مقرر کیا۔ صدر مدرسی کی خواہش لیے کئی علماء رخصت ہو چکے تھے۔ جب عالم فخر الاسلام محمد بن احمد شاشی مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے تو بے اختیار رونے لگے ان کے بعد امام غزالی کو یہ اعزاز ملا۔ ان کا اثر و رسوخ حکومت کے ارباب اختیار میں بہت زیادہ تھا ان کے مشورے کے بغیر کوئی بھی اہم کام انجام نہ پاتا۔

امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''احیا العلوم الدین'' لکھی انھوں نے اُن خرابیوں کو دور کیا جن سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ انھوں نے ان غلطیوں کا سدباب کیا جو یونانی فلسفے کی وجہ سے

معاشرے میں پھیل رہی تھیں۔ امام غزالی نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیم اور ان کے اصولوں کو ایسے انداز اور سلیقے سے پیش کیا کہ اسلام کا سکہ پھر سے دلوں پر بیٹھ گیا۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ امام غزالی جس زمانے میں ہوئے۔ اس میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جنگ ٹھنی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صلیبی جنگیں بھی شروع تھیں۔ اکثر مسلمان حکومتیں آپس میں برسر پیکار تھیں فلسفہ ومنطق کی وجہ سے ان میں سے اسلام کی اصل شکل دیکھنا مشکل ہوگئی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر امام نے فلسفہ اور علم الکلام کو کلیتہً خیر باد کہہ دیا۔ اس طرح عوام کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ اسلامی تعلیمات کا حقیقی مقصد ایک صحت مند معاشرہ قائم کرنا ہے۔ امام صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ کسی ایسے مناظرے یا درس وتدریس میں شریک نہ ہوں گے۔ جن سے اسلامی فرقوں میں افتراق پیدا ہوتا ہو۔ انھوں نے مسلمانوں کو کہا کہ وہ اپنی قوتیں بیکار باتوں پر صرف کر رہے ہیں۔ امام صاحب نے مسلمانوں کی بہت ہی اہم خدمات انجام دیں۔ اسی وجہ سے انھیں حجتہ الاسلام کہا جاتا ہے۔
حضرت امام غزالی نے ۱۰۶۱ء میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۵۵ برس تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ امام غزالی نے پیر کے دن صبح اٹھ کر وضو کیا نماز پڑھی پھر کفن منگوایا۔ کفن کو آنکھوں سے لگایا اور کہا ''آقا کا حکم سر آنکھوں پر'' یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ لوگوں نے دیکھا تو ان کی وفات ہو چکی تھی۔ لوگ شدت غم سے نڈھال ہو گئے تھے انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہر طبقہ اور گروہ میں ان کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ امام غزالیؒ نہایت پرہیزگار اور متقی شخص تھے انھوں نے اشاعت دین کے لیے بہت کام کیا ان کے اس کام کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے حضرت امام غزالیؒ کے افکار ونظریات کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کو اپنے اندر جذب بھی کیا۔ علامہ اقبال نے اپنے کئی اشعار میں امام غزالی کو ہدیہ عقیدت اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

تا غزالی درسِ اللہ ھو گرفت
ذکر و فکر از دودمان او گرفت (کلیات فارسی، ص۷۴۶)

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی (کلیات اردو، ص۲۰۳)

عطار ہو، رومی ہو، رازؔی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی! (کلیات اردو، ص ۳۴۸)

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازؔی (کلیات اردو، ص ۶۸۵)

دو صد بوحامد و رازی نیر زد
بنا دانے کہ چشمش راہ بین است (کلیات فارسی، ص ۱۰۱۹)

ooo

حضرت فضیل بن عیاضؒ

فضیل بن عیاض کی کنیت ابوعلی جبکہ کوفہ وطن تھا، بعض جگہ آپ کوخراسان کا باشندہ بتایا گیا ہے اور سمر قند میں پیدا ہوئے۔ حضرت فضیل بن عیاض صوفیا کے اس اولین طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا زمانہ ۷۶۱ء سے ۸۵۰ء تک کا ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض قزاقوں کے سردار تھے۔ مسافروں سے لوٹ مار کر کے جو سامان لاتے اسی پر گزارا کرتے۔ ایک روز ایک قافلہ پر حملہ کیا مال اسباب لوٹنے لگے تو ایک مسافر نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت کی: الم یان للذ بن آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (ترجمہ: کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب اللہ کے ذکر سے خشوع حاصل کریں) اس آیت نے حضرت فضیل بن عیاض کے دل پر اثر کیا اور ان کی دنیا بدل گئی۔ انھوں نے اس قافلے کو چھوڑ دیا۔ وہ زار و قطار رونے لگے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں پھرنے لگے اسی دوران ایک اور قافلہ ادھر سے گزرا تو انھوں نے قافلہ روک کر ان سے پوچھا کہ یہاں کوئی فضیل قزاق ہے جو لوٹ مار کرتا ہے اب اس سے کوئی خطرہ تو نہیں؟

حضرت فضیل نے روتے ہوئے کہا کہ اب اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں وہ سچے دل سے توبہ کر چکا ہے۔ اب آپ کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد حضرت فضیل بن عیاض کوفہ چلے گئے اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں رہے وہاں سے بغداد کا رخ کیا اور حضرت خواجہ حسن بصری سے بیعت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ رحلت فرما چکے تھے پھر انھوں نے حضرت خواجہ عبدالواحد کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بیعت ہوئے۔

ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ حضرت خواجہ فضیؒ۔ ں بن عیاص کے

گھر پر حاضر ہوئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے پوچھا کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا امیر المومنین حضرت فضیل نے اندر سے فرمایا کہ امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام، اور میرا ان سے کیا واسطہ؟ وزیر نے کہا کہ ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے۔ اندر سے جواب آیا کہ میں اجازت تو نہیں دے سکتا لیکن تم اگر حکماً اندر آنا چاہو تو آؤ۔ وزیر اور خلیفہ ہارون الرشید اندر آگئے کہا کہ کچھ نصیحت فرما دیں۔ حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا یہ ملک تمہارا گھر ہے اور اس ملک کے رہنے والے تمہاری اولاد، ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے اور بچیوں سے نیک سلوک کرو، یاد رکھو اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکی سوگئی تو قیامت کے دن وہ بھی تمہارا دامن پکڑ سکتی ہے۔ ۸۰۲ء میں وفات پائی مزار مبارک مکہ شریف میں ہے۔ ان کے خلفاء میں حضرت ابراہیم بن ادھم، شیخ محمد شیرازہ، خواجہ بشر حافی، شیخ ابی رجا عطاری، خواجہ عبداللہ سیاری نے ان کے مشن کو جاری رکھا اور رشد و ہدایت کی شمع کو روشن رکھا۔

من نیا بم از حیات ایں جانشاں
از کجامی آید و آواز اذاں؟
گفت رومی ایں مقامِ اولیاست
آشنا ایں خاکداں باخاکِ ماست
بوالبشر چوں رخت از فردوس بست
یک دو روزے اندریں عالم نشست
ایں فضا ہا سوز آہش دیدہ است
نالہ ہائے صبح گاہش دیدہ است
زائرانِ ایں مقام ارجمند
پاک مرداں از مقامات بلند
پاک مرداں چوں فضیل و بوسعید
عارفاں مثل جنید و بایزید

(کلیات فارسی، ص ۶۴۸)

OOO

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ

حضرت ابوسعید ابوالخیر فارسی زبان وادب کے ممتاز شعراء میں سے تھے۔ وہ گیارہویں صدی عیسوی کے اکابر مشائخ میں ہیں، آپ نے رباعیوں میں اپنے صوفیانہ خیالات کی نشرواشاعت کی۔ انھوں نے فارسی رباعیات کا ایک قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر ۳۵۷ھ کو پیدا ہوئے۔ ابوعبداللہ خضریٰ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے مرنے کے بعد امام ابوبکر قفال مروزی سے مزید فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر سرخس آئے، اور امام ابوعلی زائرین ابن احمد سے تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ شیخ ابوالفضل حسن سرخسی، ابوالعباس احمد قصاب اور حضر ابوالحسن خرقانی سے اکتسابِ فیض کیا، اور حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

شعرالعجم میں مولانا شبلی نے ان کے متعلق لکھا ہے:

> ''سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ادا کیے، وہ شیخ بوعلی سینا کے معاصر تھے، ان سے اور شیخ سے اکثر مراسلت رہتی تھی، شیخ مشکل مسائل ان سے دریافت کرتا تھا اور وہ جواب دیتے تھے یہ مراسلات آج بھی موجود ہیں۔''

حضرت ابوسعید ابوالخیر نہایت منکسر المزاج تھے۔ مال، دولت مندوں سے لے کر درویشوں میں بانٹتے رہتے تھے، کینہ جوئی کو سخت ناپسند کرتے تھے شیخ فریدالدین عطار نے ان کی عظمت بزرگانہ کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''آں فانی مطلق، آں باقی برحق، آں محبوب الٰہی، آں معشوق نامتناہی آں نازنین مملک، آں بستانِ معرفت آں عرش فلک سیر، قطب عالم ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ سرہ بادشاہ

عہد بود بر جملہ اکابر و مشائخ۔"

حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ ہر ایک سے خواہ وہ کسی مذہب و مسلک سے تعلق رکھتا ہو، نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کو نہایت شفقت و محبت سے اسلام کی خوبیاں سمجھاتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ آپ اپنے مریدوں کے ساتھ عیسائیوں کے ایک گرجا میں گئے، عیسائیوں کو آپ کی آمد سے نہایت مسرت و حیرت ہوئی اور آپ کا یہ طریقہ کار اتحاد و الفت کا سبب بنا۔

نیشاپور قیام کے دوران ایک روز حیرہ کے قبرستان میں اپنے مریدوں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ایک شیخ کی قبر پر دیکھا کہ کچھ لوگ شراب پی رہے ہیں اور کچھ دف بجا رہے ہیں ان کے مریدوں کو سخت غصہ آیا وہ ان کو مارنے کے لیے لپکے مگر آپ نے منع کر دیا اور خود جا کر انہیں پیار محبت سے سمجھایا اور ان کے لیے دعائے خیر کی۔ وہ لوگ آپ کے اس طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوئے اور شراب گرا دی دف بجانا چھوڑ دیا بلکہ توڑ دیا۔ اور آپ کے گھوڑے کے قدموں میں گرے ان تمام لوگوں کی زندگی بدل گئی ان کے دل منور ہو چکے ہیں۔

شاعری میں ان کا موضوع عشق حقیقی تھا وہ عشق حقیقی کی آگ دلوں میں گرماتے۔ ان کی شاعری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر نے میھنہ میں ۴ شعبان، جمعہ کی شب ۴۴۰ھ (۱۰۴۹ء) میں وفات پائی۔

پاک مرداں چوں فضیل و بوسعید
عارفاں مثل جنید و بایزید

(کلیات فارسی، ص ۶۴۸)

ooo

حضرت سید علی ہمدانیؒ امیر کبیر

حضرت علامہ محمد اقبال نے مختلف صوفیاء کرام کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے اولیا کرام کے بارے میں لکھتے رہے ہیں۔ جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے عالم تصور میں جنت الفردوس کی سیر کرتے ہوئے ملا محمد طاہر غنی کی زبان سے امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی کی شان میں جو مداح سرائی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

سید علی ہمدانی کا لقب امیر کبیر تھا، ان کے والد کا نام سید شہاب الدین ہے۔ آپ کا سلسلہ ۱۶ واسطوں سے حضرت علیؓ سے جاملتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے جناب امیر کبیر، بن میر شہاب الدین، بن میر سید، محمد بن سید علی، بن سید یوسف، بن سید شرف الدین، بن سید محب اللہ، بن سید محمد ثانی، بن سید جعفر، بن سید عبداللہ، بن سید محمد اول، بن سید علی حسن، بن سید حسین، بن سید جعفر الحجہ، بن سید عبداللہ زاہد، بن امام ہمام، زین العابدین، بن الحسین الشہیدؓ۔

سید علی ہمدانی ۷۱۴ھ بمطابق ۱۳۱۴ء کو بی بی فاطمہ کے بطن سے ہمدان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۷۳ سال کی عمر پائی۔ حضرت سید علی ہمدانی شیخ الدین محمود بن عبداللہ المر دقانی سے بیعت تھے، لیکن فیوض باطنی کا اکتساب آپ نے حضرت تقی الدین علی دوستی سے کیا تھا۔ جب شیخ تقی الدین کا انتقال ہوا تو اس کے بعد شیخ شرف الدین محمود کی طرف رجوع ہوئے۔ ۲۱ سال کی عمر میں آپ نے دنیا کے سفر کا آغاز کیا۔ تیمور کی ہنگامہ خیزیوں کی وجہ سے انھیں اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔

ایک روایت ہزار چار سو اولیائے کرام کی صحبت سے فیضیات ہوئے اور چار سو اولیائے کرام سے ایک مجلس میں ملاقات کی۔ حضرت سید علی ہمدانی ۱۳۸۰ء میں کشمیر تشریف لے گئے ان

کے ہمراہ تقریباً سات سے زائد رفقا و سادات اور خادم تھے۔ ان لوگوں نے بھی کشمیر میں رُشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے۔

کشمیر تشریف لانے کے بعد محلہ علاء الدین پورہ کی ایک سرائے میں قیام فرمایا اور پانچوں وقت کی نماز کے لیے دریائے جہلم کے کنارے ایک چوکور چبوترہ بنوایا۔ جہاں اب آپ کی خانقاہ ہے۔ ان کے کشمیر آنے سے قبل اس خطے پر جہالت کی تاریکیاں ہر سو چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے آنے سے ہر طرف اجالا ہوا۔ سید حسام الدین راشدی نے تذکرہ شعرائے کشمیر میں ساتھ آنے والے رفقاء کے تعارف دے رکھے ہیں۔ جن میں خاص طور پر میر سید حسین سامانی، سید جلال الدین عطائی، سید کمال، حضرت جمال الدین محدث، حضرت سید فیروز، سید محمد کاظم، حضرت میر رکن الدین، سید فخر الدین، سید محمد قریشی، مولانا پیر محمد قادری، شیخ سلیمان، اور شیخ احمد خوش خواں شامل تھے۔

کشمیر کی مشہور ترین عارفہ خاتون للہ، سید علی ہمدانی کے پاس حاضر ہو مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان ہی خاتون نے شیخ نور الدین رشی کو جو کہ سرچشمہ الہام تھے بچپن ہی میں دودھ پلایا تھا۔ اس دور کے فرمانروا سلطان قطب الدین نے سید علی ہمدانی کی زیر تربیت رہ کر اپنے آپ کو بھی اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ حضرت سید علی ہمدانی نے قطب الدین کو اپنی کلاہ عنایت کی تھی۔ کلاہ نسل در نسل آگے منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ فتح شاہ کے پاس رہی فتح شاہ نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد اسے میرے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کلاہ ان کے کفن میں ان کے ساتھ مدفون ہوئی۔ سید علی ہمدانی کشمیر سے روانہ ہو کر سوادِ اکبر پہنچے تو ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ (۸۵-۱۳۸۴ء) کو آپ نے وفات پائی۔ دریائے جہلم کے کنارے نماز پڑھنے کی غرض سے تعمیر کردہ چبوترا کو ایک شاندار خانقاہ میں تبدیل کر دیا۔ اس عمارت کی تعمیر ۷۹۸ھ سے ۷۹۹ھ تک مکمل ہوئی۔ ان کی خانقاہ، خانقاہ معلیٰ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسجد جو مسجد شاہ ہمدان کے نام سے معروف ہے۔ یہ خانقاہ اور مسجد شہر سری نگر میں محلہ علاء الدین پورہ میں فتح کدل و زینا کدل پلوں کے درمیاں واقع ہے۔

نظم: زیارت امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانیؒ و مُلا طاہر غنی کشمیری

حرفِ رومی درد لم سوزے فگند
آہ پنجاب ، آں زمین ارجمند

از تپ یاراں تپیدم در بہشت
کہنہ غمہار خریدم در بہشت
تا دراں گلشن صدائے درد مند
از کنارِ حوضِ کوثر شد بلند
"جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را
گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں" (غنی)
گفت رومی آنچہ می آید نگر
دل مدہ با آنچہ بگذشت اے پسر
شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقر او باطن غنی ، ظاہر غنی
نغمہ می خواند آں مست مدام
در حضور سیدِ والا مقام
سید السادات ، سالار عجم
دستِ او معمار تقدیر اُمم
تاغزالی درس اللہ ہو گرفت
ذکر و فکر از دود مانِ او گرفت
مرشدِ آں کشور مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں رامشیر !
خطہ راآں شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر
باہنر ہائے غریب و دلپذیر
یک نگاہِ او کشاید صد گرہ
خیز و تیر کش را بدل راہے بدہ

در حضورِ شاہ ہمدان

زندہ رود

از تو خواہم سرِ یزداں را کلید
طاعت از ما جست و شیطاں آفرید
زشت و ناخوش راچناں آراستن
در عمل ازما نکوئی خواستن
از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ
با قمارِ بدنشیں بازی کہ چہ
مشتِ خاک و ایں سپہر گرد گرد
خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد
کارِ ما ، افکارِ ما ، آزارِ ما
دشت باندان گزیدن کارما

شاہ ہمدان

بندۂ کزخویشتن دار و خبر
آفریند منفعت را از ضرر
بزم بادیو است آدم را و بال
رزم بادیو است آدم را جمال
خویش را برا ہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت
ورنہ باشی درد و گیتی تیرہ بخت
۔۔۔الخ

(کلیات فارسی،ص۷۴۶۔۷۴۸)

○○○

حضرت امام شافعیؒ

حضرت امام شافعیؒ مسلمانوں کے چار اماموں میں سے اپنے دور کے لحاظ سے تیسرے امام ہیں۔امام شافعیؒ اپنے کردار و عظمت کے لحاظ سے کئی اعتبار سے منفرد تھے۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے اس میں ان کی احتیاط اور عمیق نظری ضرب المثل ہے۔ حضرت امام شافعی کا اصل نام محمد تھا ابو عبداللہ کنیت جب کہ ناصر الحدیث لقب تھا۔ان کے والد گرامی کا نام ادریس بن عباس تھا۔ حضرت امام شافعیؒ کا سلسلہ نسب محمد بن ادریس بن عباس بن شافع بن السائب بن جنید بن عبد یزید کے بعد دو پشتوں میں ہاشم بن عبد مناف تک پہنچ جاتا ہے۔اس طرح عبد مناف پر آ کر امام شافعیؒ آنحضرت ﷺ کے ہم جدی ہو جاتے ہیں۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو آپ نہایت خوش قسمت ہیں کہ آپ آنحضرت ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہیں اسی لیے مطلبی کہلاتے ہیں۔ آپ کی والدہ کا تعلق یمن کے معروف قبیلے ازد سے ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا اصل وطن یمن تھا اس لیے آپ مطلبی ہونے کے علاوہ ہاشمی بھی تھے۔آپ کی پیدائش یمن کے قرب و جوار میں ہوئی لیکن نشو ونما کا زمانہ غزہ اور عسقلان میں گزرا جہاں یمنی قبائل آباد تھے۔

حضرت امام شافعیؒ کا سن ولادت ۱۵۰ھ ہے جب کہ اسی سال امام ابوحنیفہؒ کی رحلت ہوئی۔آپ کی ولادت کے وقت آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے جب آپ دو سال کے ہوئے آپ کی والدہ یمن آ گئیں اور اپنے بھائی کے پاس رہنے لگیں۔ حضرت امام شافعیؒ اپنے ماموں کی زیر کفالت پرورش پانے لگے۔سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا جب آٹھ سال کے ہوئے تو امام مالکؒ کی کتاب ''موطا'' ازبر کر لی۔جب ان کی عمر دس برس ہوئی تو انہیں ان کے

چچا کے پاس مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا۔ اسی شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کے چچا کی مالی حالت قدرے کمزور تھی اس لیے تعلیم کے حصول میں انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم تعلیم کے حصول کے ذوق میں کوئی کمی نہ آئی۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں دنوں مشہور محدث وفقیہ مسلم بن خالد زنگی بہت معروف تھے۔ امام شافعی ان کے پاس علمی پیاس بجھانے کے لیے پہنچ گئے۔ تین برس تک ان سے حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جب بھی امام مالک کا ذکر آتا تو آپ کے دل میں ان سے ملنے کی حسرت بے تاب ہونے لگتی مگر مدینہ منورہ جانے کا زادسفر نہ تھا۔ تاہم انھوں نے سو دینار جمع کر کے ان کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے آپ کی فہم وفراست کی خوب تعریف کی اور اپنے حلقہ درس میں شامل کرلیا۔ امام شافعی تین برس تک ان کی صحبت میں رہے۔ آپ نے حدیثِ نبوی ﷺ، علم فقہ اور تابعین کرام کے فتاویٰ کے متعلق تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد حضرت امام مالکؒ نے آپ کی قابلیت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے انہیں فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔ آپ نے مختلف علوم سیکھے اور ان میں بڑی مہارت حاصل کی ان میں خاص طور پر تیر اندازی، سپہ گری، ادب، فن لغت میں کمال حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے علم ہیئت ونجوم میں بھی خوب دسترس حاصل کی۔ طب قدیم کا بھی عمیق مطالعہ کیا۔

مکہ مکرمہ، مدینۃ النبی، یمن، شام، عراق، مصر اور الجزائر وغیرہ میں بھی گئے اور لوگوں کو رشد وہدایت دیتے ہوئے فقہی مسائل سے بھی آگاہ کیا۔ امام شافعی تفسیرِ قرآن میں بھی گہری دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں مسلم بن خالد زنگی، حضرت سفیان بن عینیہ، حضرت فضیل بن عیاضؒ، امام مالک بن انسؒ اور امام محمدؒ شامل ہیں۔ امام شافعی نجران کے گورنر بھی مقرر ہوئے۔ یمن کے والی کے خلاف کلمہ حق بھی بلند کیا۔ عربی کی مادری زبان تھی۔ امام شافعیؒ کا فقہ اسلامی پر بہت بڑا احسان ہے انھوں نے نہ صرف فقہ کے جمع کرنے پر بھرپور توجہ دی بلکہ وقت کے فتنوں کے خلاف بھی جہاد کیا۔ آپ ۳۰ رجب ۲۰۴ھ کو اپنے مالک حقیقی کے پاس جا پہنچے۔ آپ کی میت کو فراختہ الصغریٰ لے جایا گیا جو قاہرہ سے باہر واقع ہے وہیں ان کا مزار ہے۔

سبز بادا خاک پاک شافعیؒ
عالمے سر خوش ز تاکِ شافعیؒ

(کلیات فارسی، ص ۱۷)

ابوالفیض فیضی

مغلیہ حکمرانوں نے فنون لطیفہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دربار شعر وسخن کے حوالے سے آج بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ جہانگیر کے نورتن ہوں یا اکبر کی محفلِ دوستاں۔ شاعروں و ادیبوں کی حوصلہ افزائی کا خاص اہتمام دربارِ مغلیہ کا وتیرہ رہا۔ نہایت معذرت کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ مغلوں نے رقص وسرور، طاؤس ورباب کی محفلیں تو سجائیں لیکن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرف توجہ نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں نے تعلیمی ادارے قائم کر کے مسلمانوں کو زیر کیا۔ مفکرِ اسلام، مفسرِ حقیقت، مصورِ پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلمان حکمرانوں کی غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں کی نہ صرف مذمت کی بل کہ مسلمانوں کو پیغام بیداری دیا۔ مغلیہ درباروں سے وابستہ بہت سے احباب کا تذکرہ اقبال کے ہاں موجود ہے۔

ابوالفیض فیضی، دربارِ اکبری کے ملک الشعرا میں سے تھے۔ فیضی ۱۵۴۷ء کو اکبر آباد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ فیضی کے والد کا نام شیخ مبارک تھا جب کہ بڑے بھائی کا نام ابوالفضل تھا۔ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک رتن تھا۔ ابوالفیض فیضی نے بے نقط تفسیر قرآن لکھی۔ اس تفسیر کا نام ''سواطع الالہام'' ہے۔ جس میں انھوں نے بغیر نقطوں کے سارے الفاظ استعمال کر کے سب کو حیران وششدر کر دیا۔ یہ ان کے قادر الکلام ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پانچ معروف مثنویاں تصنیف کیں جن میں اکبر نامہ، ہفت کشود، نل دمن، سلیمان بلقیس اور مرکز الادوار شامل ہیں۔ ابوالفیض فیضی نے مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ ابوالفیض فیضی کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے طبرانی اور سنسکرات کی کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی کیے۔

الجبرا اور حساب پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ اکبر کے دینِ الٰہی کا بہت بڑا حامی تھا ۱۵۹۵ء کو انتقال ہوا۔ فیضی نے ایک سو سے زائد کتابیں لکھیں۔

فیضی

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبو کا بن کے مسلم کا تنِ خا کی

کیا ذرہ کو جگنو دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیبا کی

تغیّر آ گیا ایسا تدبر میں تخیّل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چا کی

کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دل کشا دکھلا گئی ساحر کی چالا کی

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خودفروشی، نا شکیبائی، ہو سنا کی

فروغِ شمع نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادرا کی

تو اے پروانہ ایں گرمی زشمعِ محفلے داری
چومن در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

(کلیات اردو، ص ۲۲۵)

ooo

حضرت امام جعفرؒ صادق

حضرت امام جعفر صادقؒ کی کنیت ابو اسمعیل اور ابو عبداللہ اسم گرامی اور لقب جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی المرتضیٰؓ ہے۔امام جعفر صادقؒ پانچویں امام حضرت محمد باقر کے بیٹے اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے پڑپوتے تھے۔آپؒ اسلامی فقہ کے بانی اور شیعہ مکتبہ فکر کے چھٹے امام ہیں۔دینیاتی اعتبار سے انھوں نے محدود نظریہ تقدیر کی حمایت کی اور پرچار کیا کہ حدیث اگر قرآن سے متصادم ہو تو اسے مسترد کر دینا چاہیے۔والدہ ماجدہ کا اسم گرامی فردہ بنت القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیقؓ ہے۔والدہ کی طرف سے آپ کا تعلق حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ بنتا ہے۔امام جعفر صادقؒ کے دو روحانی واسطے ہیں۔اول اپنے والد امام باقر کی نسبت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دوسری اپنی ماں کی طرف سے قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کسبِ فیض کیا تھا۔

اموی دور کے اواخر میں خلفاء کبھی کبھی مساجد میں خطبہ دیا کرتے تھے۔نتیجتاً امام جعفر نے اپنے والد کی وفات کے بعد خلافت کا عزم کیا تو اموی انہیں مہیب خطرہ خیال کرنے لگے۔اموی خلافت پہلے ہی بیرونی خطرات سے دوچار تھی۔سارے ایران میں شیعہ ازم کے فروغ نے مخالفت کو مزید مضبوط کر دیا۔۷۵۰۔۷۴۹ء میں عباسیوں کی ایک بغاوت امویوں کا تختہ الٹنے میں کامیاب رہی اور نئی خلافت کی بنیاد بھی انھوں نے ہی رکھی۔نئے خلفاء کا حضرت جعفر سے خطرہ محسوس کرنا اچنبھے کی بات نہیں۔خلیفہ المنصور (۷۵۔۷۵۴ء) انہیں اپنے نئے دارالخلافہ بغداد میں لانا چاہتا تھا کہ ان پر نظر رکھ سکے۔امامِ جعفر نے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔علوی محمد ابن عبداللہ کی وفات (۷۶۲ء) کے بعد امام جعفر نے بغداد چلے جانا موزوں خیال کیا۔تاہم ایک مختصر قیام

کے بعد انھوں نے المنصور کو قائل کر لیا کہ وہ خطرناک نہیں۔ تب وہ واپس مدینہ آئے اور وہیں وفات پائی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؒ ۸۵ھ بروز دوشنبہ ۱۷ ربیع الاول اور دیگر روایات کے مطابق ۸۳ھ ولادت ہوئی۔ ایک روایت کی رو سے آپؒ نے ۶۸ سال اور دوسری روایت کے مطابق ۶۵ سال آپؒ نے عمر پائی۔ آپؒ کا وصال مدینہ منورہ میں ۱۴۸ھ بروز دوشنبہ ۱۵ رجب کو ہوا اور آپؒ جنت البقیع میں دفن ہوئے جہاں امام باقرؒ، امام زین العابدینؒ اور امام حسن علیہ السلام مدفون ہیں۔

بلاشبہ آپ علمی طور پر جینیئس اور سیاسی لحاظ سے صائب الرائے تھے ان کے بہت سے شاگردوں میں ابوحنیفہ اور مالک ابن انس جیسے لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے اسلام شریعت کے دو الگ الگ مکاتب فکر حنفیہ اور مالکیہ کی بنیاد رکھی۔ جابر بن حیان بھی آپ کا شاگرد رہا۔

مسلمان مصنفین نے امام جعفر صادق کو تین بنیادی مذہبی نظریات کا خالق قرار دیا ہے اول...... انھوں نظریہ جبریت اور قدرت کے حوالے سے ایک درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے زور دیا کہ خدا نے کچھ چیزوں کو قطعی بنایا اور کچھ چیزوں کو انسان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ دوم...... علم الحدیث میں آپ نے یہ اصول رائج کیا کہ قرآن سے تضاد رکھنے والی کوئی بھی حدیث ناقص ہے۔ سوم...... آپ نے نبوی محمدی ﷺ نور کو نور کی ایک شعاع کے طور پر بیان کیا جو حضرت آدمؑ سے بھی پہلے تخلیق کر لیا گیا تھا۔ حضرت امام جعفر کے بیٹے حضرت اسماعیل آپ سے پہلے ہی وفات پا گئے انہیں آخری امام قرار دینے والے فرقے کے نمائندے آج اسمٰعیلی کہلاتے ہیں۔ اسمٰعیلیوں کے مطابق حضرت اسمٰعیل غیب میں چلے گئے تھے اور ایک روز دوبارہ ظاہر ہوں گے۔

امام جعفر صادق کے تین دیگر بیٹوں نے بھی امامت کا دعویٰ کیا جن میں سے موسیٰ کاظم کو قبولیت ملی۔ فقہ جعفریہ کے مطابق امام مبعوث من اللہ ہوتا ہے۔ منتخب نہیں کیا جاتا نیز معصوم ہوتا ہے۔ ان کی اولاد کے ذریعے یہ سلسلہ بارہویں امام تک پہنچا۔

ذوقِ جعفرؒ کاوش رازیؒ نماند
آبروئے ملت تازی نماند

(کلیات فارسی، ص ۱۲۵)

ooo

فاطمہ بنتِ عبداللہ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنے کلام میں بہت سی ایسی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہیں۔ فاطمہ بنت عبداللہ تاریخ اسلام میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ لیبیا جو پہلے طرابلس کے نام سے معروف تھا صدیوں ترکی حکومت کے ماتحت رہا۔۱۹۱۲ء میں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ لیکن آخر شکست کھائی اور لیبیا پر اطالویوں کا قبضہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود آزادی کے متوالے اطالویوں کی مزاحمت کرتے رہے۔ ان کی حریت پسندی اور جرأت و بہادری کی بہت سی داستانیں لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ جن میں ایک گیارہ سالہ لڑکی فاطمہ کی کہانی بڑی جرأت آمیز ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ قبیلہ البراعصہ کے سردار شیخ عبداللہ کی صاحبزادی تھی۔ یہ قبیلہ تعداد اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا۔ ترک عرب مجاہدوں کو سرکاری خزانے سے خوراک وغیرہ کے لیے کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ شیخ نے اس رقم کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا اور حقیقی معنی میں جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کیا ان کے خاندان کی تمام عورتیں اور مرد میدان جنگ میں شہید ہوئے۔

یہ بچی کاندھے پر مشک اٹھائے مسلمان زخمی سپاہیوں کو پانی پلاتی تھی۔ سنساتی ہوئی گولیاں اس کے قریب سے گزر رہی تھیں لیکن یہ بہادر بچی اپنے کام میں بڑی مستعدی سے مصروف تھی۔ یکا یک اس کے ایک گولی لگی اور وہ جام شہادت نوش کر گئی۔ اقبال نے اس بہادر بچی کو ہدیہ تحسین کرتے ہوئے ایک نظم کہی جس میں اس کی بہادری و شجاعت کا بھرپور انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کو دشتِ صحرا کی حوا قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسلام کے غازیوں کو

پانی پلانے کی خدمت کا اعزاز تجھے حاصل ہوا یہ سعادت تیری ہی قسمت تھی۔ تو نے رب کریم کی راہ میں سامانِ حرب، تلوار اور ڈھال کے بغیر جہاد کیا۔

نظم: فاطمہ بنتِ عبداللہ

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ!

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاطِ انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو نا آشنا ہے قیدِ صبح وشام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پر تو بھی ہے

(کلیات اردو، ص ۲۱۴)

ooo

مسلم فاتحین، حکمران
سائنس دان اور مفکّرین

ابنِ سعود عبدالعزیز

امیر عبدالعزیز ابن سعود کو سعودی عرب کی جدید تاریخ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عبدالعزیز کا تعلق جلا وطن حکمران خاندان سے تھا لیکن اس نے عرب کے مختلف قبائل کو ایک مرکز پر لانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ ابن سعود عبداللہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے حیران کن کام کیے۔ یاد رہے کہ امیر عبدالعزیز نے ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ سعودی عرب کی موجودہ حکومت کے بانی۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد ۱۹۱۴ء میں ابن سعود نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۱۹۲۶ء میں شریف مکہ سے حکومت چھین کر حجاز پر بھی قابض ہو گئے۔ عوام الناس کے دلوں میں اس کا بہت احترام تھا اس لیے عوام نے امیر عبدالعزیز کا ساتھ دیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شریف مکہ حسین نے حکومت سے دستبردار ہو کر اپنے بیٹے علی کو شاہ حجاز بنا دیا۔ علی، اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور وہ عبدالعزیز ابن سعود کا راستہ نہ روک سکا اور اسے اپنا تخت چھوڑنا پڑا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۴ء کو شاہِ حجاز عبدالعزیز ابن سعود نے ایک تقریب میں مکمل اختیار سنبھال کر "المکتہ العربیہ السعودیہ" کا نام استعمال کرتے ہوئے تمام اختیارات پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۰ء میں سعودی عرب سے تیل نکل آیا۔ اس نعمت خداوندی کی وجہ سے سعودی عرب دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہونے لگا۔ خادمِ حرمین شریفین کی حیثیت سے امیر عبدالعزیز نے بہت شہرت حاصل کی۔ انھوں نے قریبی عرب ریاستوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا سعودی عرب کی ترقی کے لیے شبانہ روز کام کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال موتمر عالمی اسلامی کانفرنس میں شریک

ہوئے۔ انھیں تنظیم کا نائب صدر چنا گیا۔ امیر عبدالعزیز ابن سعود مشرق وسطیٰ کا مضبوط ترین حاکم ثابت ہوا۔ وہ ۱۹۵۳ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شاہ فیصل کی شہادت کے بعد خالد بن عبدالعزیز برسرِ اقتدار رہے اور ان کی وفات کے بعد پھر شاہ فہد عبدالعزیز سربراہ مملکت بنے۔ علامہ محمد اقبال فرماتے ہیں:

اے فواد اے فیصل اے ابن سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود
(کلیاتِ فارسی، ص۶۸۵)

ooo

ابنِ سینا، بوعلی سینا

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ وسعت مطالعہ کی وجہ سے شخصیات شناسی میں کمال رکھتے تھے۔کوئی شعبہ زندگی ان کی قلم کی دسترس باہر نہیں تھا۔انھوں نے ہر اس شخص کو موضوع تحسین بنایا جس نے انسان اور انسانیت کی خدمت کی۔ایسی شخصیات میں ایک عظیم مسلمان سائنس دان بوعلی سینا بھی شامل ہیں۔ان کا پورا نام شیخ بوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا ہے۔ابن سینا ان مسلمان حکماء میں شامل ہیں جن سے اہل مغرب نے اکتساب فیض کیا۔ابن سینا اگست ۹۸۰ء بمطابق صفر ۳۷۰ ہجری میں بخارا کے قریب خرمستان نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ابن سینا کے والد یہاں کے گورنر تھے۔ابن سینا عالمی شہرت یافتہ طبیب، سائنس دان، محقق، ماہر حیاتیات اور دانش ور تھے۔انھوں نے دس سال کی عمر میں قرآن کریم پڑھ لیا۔فارسی اور عربی میں بھی مہارت حاصل کر لی ان کے والد گرامی علم وفن کے دلدادہ تھے اس لیے انھوں نے ماہر ریاضی محمود مساح کو بطور اتالیق رکھا۔عجب بات ہے کہ یہ سبز ی فروش تھا۔ابن سینا نے عالم اسماعیل سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔فلسفہ اور طبیعیات کا ایک مشہور محقق عالم ابوعبداللہ ناطلی ایک دن بخارا آیا بوعلی سینا کے والد نے اسے اپنے گھر ٹھہرایا۔ابن سینا نے فلسفہ منطق، اقلیدس کی تعلیم حاصل کی اور پھر راتوں کی ریاضت کے بعد فاضل طبیب بن گئے۔کم عمری میں ہی ابن سینا نے خلیفہ نوح بن منصور کا علاج کر کے شہرت دوام حاصل کر لی۔خلیفہ نے ابن سینا کو شاہی لائبریری سے استفادہ کی اجازت دے دی۔

ابوعلی سینا نے اکیس برس کی عمر میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طب، ادویات، سرجری، فلسفہ، فلکیات، اسلامیات، علم ہندسہ، علم الکلام، اور سائنس پر کم از کم سو کتب لکھیں۔ان کی کئی کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

یہ ابتداء ہی سے بڑا ذہین وفطین نوجوان تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے تمام علوم سیکھ لیے لیکن اس کا رجحان حکمت اور منطق کی طرف تھا۔ جب محمود غزنوی نے خوارزم کو فتح کر لیا تو اس کی خواہش تھی کہ ابن سینا دربار محمود سے وابستہ ہو جائے لیکن ابن سینا نے اسے قبول نہ کیا اور گورگان چلے گئے۔ یہاں انھوں نے ''قانون'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو آج بھی طب کی بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ہمدان کے حکمران نے انھیں اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ وہ عام طریقہ علاج کے علاوہ نفسیاتی طریقہ سے علاج کرتے تھے۔ بوعلی سینا کا ایک اہم سائنسی کارنامہ روشنی کی رفتار کی دریافت ہے۔ انھوں نے علم طبیعات میں حرکت، قوت، خلاء روشنی اور حرارت جیسے اہم مضامین پر گہرے تحقیقی کام کیے ہیں اور دنیا کے سامنے اپنا نیا نظریہ پیش کیا ہے انھوں نے تجربے اور تحقیق سے ثابت کیا کہ روشنی میں ایسے روشن ذرات ہیں جو نور افشاں جسم سے نکلتے ہیں۔ بوعلی سینا نے روشنی کے مسئلہ میں ابن الہیثم کے نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے روشنی کے مسئلہ میں وہ ثابت کرتا ہے کہ روشنی کے ذرات نور افشاں جسم سے نکلتے ہیں اس لیے روشنی کی ایک واضح رفتار ہوتی ہے۔ لہٰذا بوعلی سینا پہلا سائنس دان ہے جس نے روشنی کی رفتار کو ثابت کیا ہے۔ بوعلی سینا کو علم ریاضی سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ وہ ایسے طریقے جانتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی وہ صحت کے ساتھ ناپ لیتا اس لیے کہا جاتا ہے کہ ورنیر جیسے نازک ترین پیمانے کا موجد بوعلی سینا تھا۔ عظیم مسلمان سائنس دان نے کیمیا گری میں بھی کمال حاصل کیا۔ کئی علوم پر انھیں امام تصور کرتے ہیں۔ عمر کا آخری حصہ یادِ الٰہی میں گزارا۔ تلاوت قرآن حکیم ان کا معمول بن گیا اپنے تمام اثاثہ جات اللہ کی راہ میں تقسیم کر دئے۔ ۵۸ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ء کو وفات پائی اور ہمدان میں آسودہ خاک ہیں۔

ابن سینا بر بیاضے دل نہد
رگ زندیا حبِ خواب آوروہد (کلیات فارسی، ص ۷۴۰)

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی (کلیات اردو، ص ۲۳۸)

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا! (کلیات اردو، ص ۲۶۹)

○○○

ابوبکر محمد ابن زکریا رازی

انسانی صحت کا راز اللہ کی ذات نے فطرت کے عناصر میں مضمر رکھا ہے۔ ان رموز کو راز داری سے عیاں کرنے میں رازی کی اپنی شناخت ہے۔ مولانا رومی، مولانا جامی کی طرح ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ابوبکر محمد ابن زکریا رازی کے بہت معترف تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے ہر اس شخص کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے جس نے انسان اور انسانیت کی خدمت کی۔ میں سمجھتا ہوں دکھی انسانی کی خدمت میں حضرت رازی آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔

محمد بن زکریا رازی عظیم طبیب، عالی شہرت یافتہ محقق، مفکّر اور نامور سائنس دان تھے۔ رازی کو علم طب کا امام قرار دیا جاتا ہے۔ بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو ماحول میں رچ بس جاتی ہیں۔

وہ ایران کے شہر ''رے'' میں ۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ اسی ''رے'' کی نسبت سے آپ رازی کہلائے۔ عود بجانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ رازی غریب خاندان کے فرد تھے۔ آپ نے معمولی تعلیم حاصل کی۔ رازی نے ابتدائی زندگی انتہائی آزادانہ گزاری۔ جیسے جیسے عمر بڑھنے لگی ان کے ہاں سنجیدگی آتی گئی یہاں تک کہ آپ کی شادی ہوئی تو آپ کو فکرِ معاش ہوئی۔ رازی سونا بنانے کی تگ و دو کرنے لگے طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کو گھر میں لے آتے اور آگ کی بھٹیوں میں جلاتے جس کی وجہ سے گھر میں دھواں پھیل جاتا اسی وجہ سے ان کی آنکھیں بھی خراب رہنے لگیں۔ آنکھوں کا علاج کروانے لگے تو طبیب نے پانچ سو اشرفیاں مانگ لیں۔ رازی نے علاج کروایا اسی طبیب نے رازی کو سمجھایا کہ ایسے ہی بے مطلب سونا بنانے کی کوششیں نہ کرو بلکہ کوئی ہنر سیکھ لو وہی سونا ہوگا۔ سونا بھی ہنر سے بنتا ہے۔ رازی کی سمجھ میں بات آئی اور انھوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بغداد کی راہ

لی۔ بغداد میں آپ علی بن سہل کے حلقۂ درس میں پہنچ گئے۔ بغداد میں بہت سے سرکاری ہسپتال تھے اور علی بن سہل ان کا نگران تھا۔ رازی کو علم کا بے حد شوق تھا وہ بہت جلد تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بعد رازی اپنے استاد کے ہمراہ مریضوں کا معائنہ اور علاج معالجے میں مصروف ہو گئے۔ رازی نے بہت جلد فن طب میں خوب نام پیدا کر لیا۔ بغداد کے بعد وہ اپنے علاقے ''رے'' کے سرکاری ہسپتال میں تعینات ہو گئے۔ علاج اور معالجے کی غرض سے دور دراز سے مریض آتے اور شفایاب ہو کر جاتے تو رازی کی شہرت کا باعث بنتے۔ رازی نے سب سے پہلے طبی امداد یعنی First Aid کا طریقہ جاری کیا۔ چیچک پر رازی نے خوب تحقیق کی اور ایک کتاب چیچک کے حوالے سے لکھی۔ یہ کتاب سیکڑوں برس یورپ کے میڈیکل کالجوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ رازی نے دواؤں کا وزن معلوم کرنے کے لیے ''میزان طبی'' ایجاد کیا۔ الکحل کا موجد رازی ہے جس سے طب کی دنیا نے بے پناہ فوائد اٹھائے۔ عمل جراحی میں بروئے کار لایا جانے والا آلہ نشتر بھی رازی نے بنایا۔

طب میں ان کو خاص مقام حاصل تھا۔ اس کے علاوہ کیمیا، طبیعیات اور فلسفہ پر بھی انھوں نے کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابیں ۱۴۱ کے قریب ہیں۔ ۹۲۵ء میں وفات ہوئی۔ اقبال امام رازی کے خیالات سے متفق نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رازی جبریت کے قائل تھے۔ اس کے برعکس اقبال قدریت کے قائل تھے لیکن اس کے باوجود وہ رازی کی عالمانہ فضیلت کے معترف تھے رازی معروف کتاب ''الحاوی'' ہے اس کتاب نے رازی کو شہرتِ دوام بخشی۔ اس کتاب کی پچیس جلدیں ہیں۔ اس کتاب میں تمام بیماریوں اور ان کے علاج معالجے کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب ''المنصوری'' ہے۔ رازی نے گردے اور مثانے میں پتھری کے علاج معالجے کے بارے میں بھی کتاب لکھی۔ رازی کی لاتعداد کتب کا ترجمہ یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے اور یورپ کے میڈیکل کالجوں میں رازی کو بطور خاص پڑھایا جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں لندن میں ایک بین الاقوامی طبی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا عنوان ''رازی اور فن طب'' تھا۔ ۱۹۳۰ء میں رازی کی ہزار سالہ برسی فرانس کے شہر پیرس میں بڑی شان و شوکت سے منائی گئی جس میں عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹروں، سائنس دانوں نے شرکت کی اور رازی کے فکر و فن پر مقالات پڑھے۔ جابر بن حیان کے بعد اسلامی دنیا میں آپ دوسرے بڑے کیمیادان متصور کیے جاتے ہیں۔

ذوقِ جعفرؒ کاوشِ رازیؒ نماند
آبروئے ملت تازی نماند (کلیات فارسی، ص ۱۲۵)

ز رازی معنی قرآن چہ پرسی
ضمیرِ ما بآیاتش دلیل است (کلیات فارسی، ص ۲۱۲)

بہر زرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد
بزور بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را (کلیات فارسی، ص ۴۹۶)

دراں عالم کہ جزو از کل فزون است
قیاسِ رازیؔ و طوسی جنون است (کلیات فارسی، ص ۵۴۸)

چوں سرمۂ رازیؔ را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر (کلیات فارسی، ص ۶۳۰)

عقل و دل را مستی از یک جام مے
اختلاط ذکر و فکر و رومؔ و رےؔ (کلیات فارسی، ص ۸۳۶)

ز رازی حکمت قرآں بیاموز
چراغے از چراغ او بر افروز (کلیات فارسی، ص ۹۵۱)

دو صد بو حامد و رازیؔ نیر زد
بنا دانے کہ چشمش راہ بین است (کلیات فارسی، ص ۱۰۱۹)

ooo

احمد شاہ ابدالی

تاریخ اسلام کے کم عمر فاتح ،صاحب ذوق ، دانش ور ، بہادر ،ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ،رحم دل ،منتظم ،دور اندیش ،قبیلہ ابدال سے تعلق رکھنے والے احمد شاہ درانی ابدالی ۱۷۲۳ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد زمان خان ہرات کے حکمران تھے۔احمد شاہ ابدالی کا ابھی بچپن تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ان کی جگہ ان کے بھائی ذوالفقار کو ہرات کا نیا حکمران بنایا گیا۔۱۷۴۷ ءمیں نادر شاہ افغانی کا قتل ہوا اور اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔افغانستان کے بزرگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے حضرت صابر شاہ علاقہ کے بزرگ تھے انھوں نے افغانستان کی قیادت کے لیے پچیس سالہ نوجوان احمد شاہ ابدالی کو کمانڈر مقرر کیا۔احمد شاہ نے بکھرے ہوئے افغانیوں کو ایک پرچم تلے جمع کیا۔سلطنت اوکس سے اومان تک اور تبت کی شاہراہوں سے بحیرۂ عرب تک احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے نشانات نظر آنے لگے۔احمد شاہ ابدالی کی پانی پت کی تیسری لڑائی میں فتح نے ہندوراج کا خاتمہ کر دیا۔اُس نے نو معزز افراد پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل بنائی۔ذوالفقار ہرات نے بھی نادر شاہ کا مقابلہ کیا لیکن ابدالی سرداروں کی سازشوں کی وجہ سے شکست سے دو چار ہوا۔ ذوالفقار اپنے بھائی سمیت قندھار میں چھپ گیا۔والی قندھار نے دونوں کو گرفتار کر کے ایران کے راستے جلاوطن کر دیا۔ذوالفقار نے وہیں وفات پائی۔احمد شاہ ابدالی کی شخصیت کا ایک پہلو شاعرانہ بھی ہے۔وہ پشتو زبان کا اچھا شاعر اور عربی زبان کا صاحب تحریر تھا۔کابل اکیڈمی نے احمد شاہ ابدالی کی عربی اور پشتو شاعری کو دیوان کی شکل دی۔یہ صاحب دیوان شاعر کم عمری میں سپہ سالار بنا۔جس نے نادر شاہ کے قتل کے بعد پورے ابدالی خاندان کی حفاظت کی۔ساٹھ ہزار مجاہدین کے تعاون سے

پانچ لاکھ مرہٹوں کو شکست دے کر برعظیم پاک و ہند میں از سرِ نو مسلم ریاست قائم کی۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں دو لاکھ مرہٹے قتل ہوئے۔ وہ سچا مسلمان تھا جس نے اسلام کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ حیران کن بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احمد شاہ ابدالی کو صبر و تحمل کے ساتھ ساتھ توانا جسم عطا کیا۔ لوگ ایک بار حیران ہو گئے جب وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ۱۳۵ میل کا فاصلہ دو دنوں میں طے کر گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے ۲۲ ہزار جنگی قیدیوں کو ساز و سامان دے کر آزاد کیا۔ وہ ۱۷۷۳ء میں طبعی موت مرا اور افغانستان کے علاوہ تمام اسلامی دنیا کو افسردہ کر گیا۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے احمد شاہ ابدالی کو بہادری کے استعارے کے طور پر اردو اور فارسی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں احمد شاہ ابدالی کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ طویل نظموں سے مختصر اشعار نذر قارئین ہیں:

مرد ابدالی وجودش آیتے
داد افغاں را اساس ملتے

(کلیات فارسی، ص ۷۶۰)

نظم: ابدالی

آں جواں کو سلطنت ہا آفرید
باز در کوہ و قفارِ خود رمید
آتشے در کو ہ سارش برفروخت
خوش عیار آمد بروں یا پاک سوخت

(کلیات فارسی، ص ۷۶۴)

نظم: ابدالی

در نہادِ ماتب و تاب ازدل است
خاک را بیداری و خواب ازدل است
سہل را جستن دریں دیرِ کہن
ایں دلیل آنکہ جاں رفت از بدن

(کلیات فارسی، ص ۷۶۷)

نظم: برمزار حضرت احمد شاہ بابا موسس ملت افغانیہ

تربتِ آں خسرو روشن ضمیر
از ضمیرش ملتے صورت پذیر
فاش گو با پور نادر فاش گوے
باطن خود را بہ ظاہر فاش گوے

(کلیات فارسی، ص ۸۷۵۔۸۷۶)

از تو اے سرمایہ فتح و ظفر
تختِ احمد شاہ را شانے دگر

(کلیات فارسی، ص ۸۷۷)

ooo

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر مغلیہ خاندان کا معروف شہنشاہ جس کا اصل نام محی الدین تھا جب کہ لقب اورنگ زیب۔ اس کے والد شاہ جہاں نے اسے عالمگیر کا خطاب دیا۔ ۲۴ را کتوبر ۱۶۱۸ء کو مالوہ کی سرحد پر پیدا ہوا۔ اس کی والدہ ارجمند بانو بیگم تھیں جو ممتاز محل کے نام سے مشہور تھیں۔ اورنگ زیب کی عمر دو برس تھی کہ شاہ جہاں نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کردی اور بیوی بچوں کو لے کر چار سال تک بنگال اور تلنگانہ میں قیام پذیر رہا۔ آخر جہانگیر کے کہنے پر اپنے بیٹوں داراشکوہ اور اورنگ زیب کو دربار میں بھیج کر معافی مانگ لی۔ جہانگیر نے دونوں بچوں کو ملکہ نور جہاں کی نگرانی میں بھیج دیا۔

اورنگ زیب کو سید محمد، میر ہاشمی اور ملا صالح ایسے جدید علماء کی شاگردی کا موقع ملا۔ مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب عالمگیر پہلا بادشاہ ہے جس نے قران شریف حفظ کیا اور فارسی مضمون نویسی میں نام پیدا کیا۔ اس کے علاوہ گھڑسواری، تیراندازی اور فنون سپہ گری میں بھی کمال حاصل کیا۔ سترہ برس کی عمر میں (۱۶۳۶ء) دکن کا صوبیدار مقرر رہا۔ اس دوران اس نے کئی بغاوتوں کی سر کوبی کی اور کئی علاقے فتح کیے۔ شاہ جہاں کی بیماری کے دوران داراشکوہ نے تمام اقتدارِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دارا کی اس جلد بازی سے شاہ جہاں کی موت کی افواہوں نے بھی سر اٹھایا ملک میں ابتری پھیل گئی۔ شاہ شجاع نے بنگال میں اپنی بادشاہت قائم کرلی اور آگرے پر فوج کشی کے ارادے سے روانہ ہوا بنارس کے قریب دارا اور شجاع کی فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں دارا کو فتح اور شجاع کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے مراد سے مل کر دارا کے مقابلے کی ٹھانی۔ اجین کے

قریب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا جس میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔ساموگڑھ کے قریب پھر لڑائی ہوئی جس میں اورنگ زیب کو دوبارہ کامیابی ہوئی۔

اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی فضول رسمیں ختم کیں فحاشی کا سدباب کیا اور خوبصورت مقبروں کی تعمیر و آرائش ممنوع قرار دی۔قوال، نجومی، اور شاعر دربار سے ختم کر دیئے۔شراب افیون، اور بھنگ بند کر دی۔۔درشن جھروکا کی رسم ختم کر دی۔بادشاہ کو سلام کرنے کا اسلامی طریقہ رائج کیا۔سجدہ کرنا اور ہاتھ اٹھانا موقوف ہوا۔سکوں پر کلمہ لکھنے کا دستور بھی ختم کر دیا گیا۔اشیاء خورد نوش پر ہر قسم کا ٹیکس ہٹا دیا گیا۔

عالمگیر نے ۱۶۶۶ء میں راجا جے سنگھ اور دلیر خاں کو شیوا جی مرہٹہ کے خلاف بھیجا۔انھوں نے بہت سے قلعے فتح کیے۔شیوا جی اور اس کا بیٹا آگرے میں نظر بند ہوئے۔شیوا جی فرار ہو کر پھر دکن پہنچ گیا۔۱۶۸۰ء میں شیوا جی مر گیا تو اس کا بیٹا سنبھال جی گرفتار ہو کر مارا گیا۔اس کے بیٹا سہو دہلی میں نظر بند ہوا۔دکن کا مطالعہ کر کے عالمگیر اس نتیجے پر پہنچا کہ بیجاپور اور گولکنڈا کی ریاستوں سے مرہٹوں کو مدد ملتی ہے۔اس نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈا کی ریاستیں ختم کر دیں۔ اس کے بعد مرہٹوں کے تعاقب میں ہندوستان کے انتہائی جنوبی حصے بھی فتح کر لیے مغلیہ سلطنت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔

عالمگیر احمد نگر میں بیمار ہوا اور ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء کو نوے برس کی عمر میں فوت ہوا۔وصیت کے مطابق اسے خلد آباد میں دفن کیا گیا جس کا نام بعد میں اورنگ آباد رکھا گیا۔اورنگ زیب بڑا متقی ، پرہیز گار، مدبر اور اعلیٰ درجے کا منتظم تھا۔خزانے سے ذاتی خرچ کے لیے ایک پائی بھی نہ لی۔قرآن مجید لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر گزارا کرتا تھا۔سلجھا ہوا ادیب تھا۔اس کے خطوط رقعات عالمگیر کے نام سے مرتب ہوئے۔اس کی تصنیف ''فتاویٰ عالمگیری'' فقہ اسلامی میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔مشہور شاعرہ زیب النساء مخفی اس کی دختر تھی۔بیٹا محمد معظم باپ کی سلطنت کا وارث ہوا۔اورنگ زیب عالمگیر اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔اس کی عاجزی و انکساری نے بھی اس کی شہرت کے گراف کو بلند کیا۔خزانے سے ذاتی اخراجات نہ کرتا تھا بلکہ قرآن پاک کی خطاطی کر کے یا پھر ٹوپیاں بنا کر گزر اوقات کرتا۔

(نظم: حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ)

شاہِ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبار دودمانِ گورگاں

(کلیات فارسی، ص۹۸)

حق گزید از ہند عالمگیر را
آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را

(کلیات فارسی، ص۹۸)

بوئے انساں دادش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر رازد بر کمر

(کلیات فارسی، ص۹۹)

ooo

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد بن زیاد دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس نوجوان نے جرأت و بہادری کی وہ داستان رقم کی جو آج کے مسلمان جرنیلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

طارق بربری نسل سے تعلق رکھنے والا افریقی باشندہ تھا۔فوجی خدمات پر مامور تھا۔اندلس پر لشکر کشی کرنے والے مجاہد زیادہ تر بربری تھے اس لیے سپہ سالاری کے لیے طارق سات ہزار مجاہدوں کا لشکر لے کر اندلس روانہ ہوا ان میں سو عرب اور باقی بربر تھے۔

طارق بن زیاد، دراصل موسیٰ بن نصیر کا آزاد کردہ غلام تھا اور موسیٰ نے ہی اسے حرب و ضرب کی تربیت دی تھی۔وہ جنگی منصوبہ بندی میں بڑا ماہر تھا اور غیر معمولی طور پر ذہین، دوربین اور مستعد جرنیل تھا۔موسیٰ بن نصیر خلیفہ ولید کے عہد میں افریقہ (شمالی و مغربی افریقہ جسے مغرب اقصیٰ کہتے ہیں) کا گورنر بنا اور اندلس سے ایک جماعت اس کے پاس راڈرک شاہ ہسپانیہ کے ظلم وستم کی فریاد لے کر آئی۔تو موسیٰ بن نصیر نے ہسپانیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے نائب طارق بن زیاد کو ۹۲ھ ۱۹ جولائی ۷۱۱ء میں تقریباً بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ وہاں بھیجا۔طارق بن زیاد حملہ آور فوج کا سالار اعظم مقرر ہوا۔اس پہاڑی پر اترتے ہی طارق نے کشتیاں جلانے کا حکم دے دیا تاکہ کسی مجاہد کو واپسی کا خیال تک نہ رہے اور وہ عزیمت کا پیکر بن کر ہسپانیہ میں اپنے لیے جگہ پیدا کریں۔جبل الطارق کے گورنر نے مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ہزیمت اٹھانا پڑی اس نے اپنے بادشاہ راڈرک کو اطلاع دی کہ ہمارے ملک پر ایک جنبی قوم نے حملہ کر دیا ہے جو بہادری میں اپنی مثال آپ ہیں بہت

جنگ جو ہیں مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ آئے کہاں سے ہیں زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے ٹپکے ہیں۔ راڈرک ان دنوں شمالی علاقوں کے دورہ پر تھا اچانک حملے کی خبر سن کر ایک لشکر جرار لے کر جنوب کا رخ کیا۔ طارق کو شاہ سپین کی تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے موسیٰ سے مزید امداد طلب کی اس نے پانچ ہزار مزید سپاہ بھیج کر بارہ ہزار کی تعداد پوری کر دی۔ یہ وہ تعداد ہے جسے مسلمان بڑی سے بڑی لڑائی جیتنے کے لیے کافی سمجھتے رہے ہیں۔

جنگ کے آغاز سے قبل طارق بن زیاد نے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اے مسلمانوں میدانِ جنگ سے بھاگنے کی اب کوئی صورت نہیں، تمہارے آگے دشمن کا وسیع ملک ہے اور پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اللہ تعالیٰ کی قسم! صرف ثابت قدمی، پامردی اور استقلال ہی میں تمہاری بھلائی ہے یہی وہ فتح مند فوج ہے جو دشمن سے مغلوب نہیں ہو سکتی اگر یہ دونوں باتیں تم میں موجود ہیں تو ہرگز تعداد کی قلت سے تمہیں نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بزدلی اور کاہلی، سستی، نامردی اختلاف اور غرور کے ساتھ تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ۱۲ ہزار کی قلیل فوج نے ظالم راڈرک کی ایک لاکھ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسے عبرت ناک شکست دی۔

طارق نے اپنے لشکر کے سامنے ایک شجاعت آفرین اور زندگی بخش تقریر کرنے کے بعد بارگاہ خداوندی میں فتح وظفر کے لیے دعا مانگی۔ ڈاکٹر علامہ اقبالؒ نے طارق کے دلی جذبات کی ترجمانی اپنے اشعار میں کی ہے۔ طارق کی ولولہ انگیز قیادت سے مجاہدین کے جذبۂ ایمانی کو تقویت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے ظالم اور طاقتور راڈرک کو شکست فاش ہوئی اور طارق بن زیاد فتح یاب ہوا۔ اس کامیاب حملہ نے ہسپانیہ کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔ اندلس میں طارق بن زیاد کا قیام تین سال چار ماہ رہا اور موسیٰ کا دو سال چار مہینے رہا۔ ولید کے بعد سلیمان مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اس کے دل میں موسیٰ بن نصیر کے بارے میں جو بغض وعناد تھا سب سامنے آنے لگا اس نے موسیٰ کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور بعد ازاں اندلس پر حملے کے خواب دیکھنے لگا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوا کہ '' طارق کو اندلس میں ایسی مقبولیت حاصل ہے کہ اگر وہ قبلہ کا رخ چھوڑ کر کسی اور سمت بھی نماز کا حکم دے گا تو لوگ امتثالِ امر کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' سلیمان نے طارق کی اندلس میں مقبولیت کا حال کر سن اپنا ارادہ بدل ڈالا۔

طارق بن زیاد

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
بیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

(کلیاتِ اردو، ص ۳۹۷)

ooo

شیر شاہ سوری

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال تاریخ اسلام کے بہادر سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کرنا اپنے لیے سعادت تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے مسلمان بہادر جرنیلوں کو عصر حاضر کے لیے باعث تقلید تصور کیا ہے۔ شیر شاہ سوری بہادری کی علامت رہے۔ چک ۳۹ شمالی سرگودھا کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ شیر شاہ سوری اس چک کے قریب (موجودہ بائی پاس) سے گزر کر بھیرہ تک پہنچے۔ اس سفر کے بعد مذکورہ راستے کو ''جرنیلی سڑک'' بھی کہا جاتا رہا۔ علامہ اقبال نے فرید خان ولد حسن خان سہرام العروف شیر شاہ سوری کے نقش قدم کو کامیابی کا استعارہ قرار دیا۔ شیر شاہ سوری کی فتوحات بیان کرنے کے لیے تو متعدد کتابیں ترتیب دی جا چکی ہیں۔ اقبال کی تقلید کرتے ہوئے محبانِ اقبال کے لیے شیر شاہ سوری کا مختصر تعارف بہت ضروری ہے۔

شیر شاہ سوری کے خاندان کو جمال خان والئی جون پور نے خاص طور پر جاگیر عطا کر رکھی تھی۔ شیر شاہ سوری ۱۴۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ وہ اپنی سوتیلی ماں سے تنگ آ کر جون پور آ گئے جو ان دنوں علم و ادب میں خاصی شہرت رکھتا تھا اور اسے ''شیرازِ ہند'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جونپور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے گلستاں، بوستان اور سکندر نامہ ایسی کتب پڑھ لیں۔ افغانوں کے ہاں تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہ دی جاتی تھی اسی لیے شیر شاہ سوری بھی زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ وہ بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے ان کی قابلیت اور ذہانت کے چرچے والئی جونپور جمال خان تک پہنچے اور جمال خان کو جب یہ علم ہوا کہ یہ حسن خان سہرام کے صاحبزادے ہیں اور والد سے ناراض ہو کر جونپور میں رہ رہے ہیں تو انھوں نے باپ اور بیٹے کے درمیان ناراضی کو ختم کرایا اور

دونوں میں صلح ہوگئی۔شیر شاہ سوری کے والد نے جاگیر کا نظام وانصرام شیر شاہ سوری کے حوالے کیا۔ شیر شاہ سوری نے نہایت محنت اور لگن سے جاگیر کی آمدنی میں بے پناہ اضافہ کیا۔شیر شاہ نے تقریباً بیس سال جاگیر کا انتظام بہ احسن طریقے سے نبھایا۔ ہر طرف خوشحالی ہوگئی تو اس کی سوتیلی ماں نے دوبارہ اسے تنگ کرنا شروع کیا تو وہ ایک بار پھر ماں اور باپ سے ناراض ہو کر گھر کو خیر باد کہہ گئے۔

شیر شاہ سوری نے بہادر خان والئی بہار کی ملازمت اختیار کر لی تا کہ اس کی مدد سے وہ سہسرام کی جاگیر واپس حاصل کر سکے۔ روایت میں ہے کہ ایک دن والئی بہار کے ساتھ شکار کھیل رہے تھے کہ ایک شیر سے شیر شاہ سوری کا مقابلہ ہوگیا شیر شاہ سوری نے ایک ہی واری میں شیر کا کام تمام کر دیا۔ والئی بہار نے اس بہادری پر اسے شیر خان کا خطاب دیا۔لوہانی اور افغان سرداروں کو شیر شاہ سوری کا عروج ایک آنکھ نہ بھایا انھوں نے والئی بہار کو ان کے خلاف کر دیا۔شیر شاہ سوری آگرہ چلے گئے اور بابر کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ بابر نے جب بہار میں افغانوں کے خلاف فوجی کارروائی کی تو شیر خان نے اس کی بڑی مدد کی۔بابر نے خوش ہو کر ۱۵۲۸ء میں ان کی جاگیریں واپس کر دیں۔ شیر شاہ سوری واپس سہسرام چلے گئے اور بہار کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔حاکم نے اپنے بیٹے جلال الدین کا اتالیق مقرر کیا۔حاکم کے مرنے کے بعد حاکم کی بیوہ نے جلال الدین کو جانشین مقرر کیا اور شیر شاہ سوری کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔شیر شاہ نے بڑی قابلیت سے نظم ونسق بہتر بنایا۔اسی اثناء جلال خان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور جلال خان جو پہلے ہی شیر خان سے خوفزدہ تھا بنگال کی طرف بھاگ گیا اور شیر خان بہار کا واحد حکمران بن گیا۔۱۵۳۰ء شیر خان نے چنار کے سابق حاکم تاج خان کی مالدار بیوہ سے شادی کر لی اور اس طرح اس کی مالی پوزیشن بھی بہتر ہوگئی۔شیر شاہ سوری نے بنگال فتح کیا اور بہترین عسکری حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغلوں کو عبرتناک شکست دے کر اپنی فتح کا پرچم لہرایا۔شیر شاہ سوری نے پے در پے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست فاش دے کر ہندوستان کا واحد شہنشاہ منوایا۔شیر شاہ سوری نے سلطنت کے دور دراز علاقوں میں شاہراؤں سے ملایا۔انھوں نے ہر طرف سڑکوں کا جال بچھایا جس کی وجہ سے انہیں Lion Fox بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔

شیر شاہ سوری ۶۸ سال کی عمر میں بادشاہ بنے اور صرف پانچ سال میں اپنا نام تاریخ میں رقم کرنے میں کامیاب ہوئے۔شیر شاہ سوری منصف مزاج، رحم دل، فیاض اور محنتی حکمران تھے وہ

نہایت سادہ مزاج اور تمام اخلاقی برائیوں سے پاک رہا۔ شیر شاہ سوری ۱۵۴۵ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے اور انہیں سہسرام میں مدفون ہوا۔

خیز و کار ایبک و سوری نگر
و انما چشمے اگر داری جگر
(کلیات اردو، ص ۵۸۵)

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے
کہ امتیاز قبائل تمام تر خواری
(کلیات فارسی، ص ۶۳۹)

○○○

اتاترک مصطفیٰ کمال

ڈاکٹر علامہ اقبال سلطنت عثمانیہ کے عروج کا تذکرہ مختلف مقامات پر کر چکے ہیں۔عثمانیہ عہد میں مسلمانوں نے پوری دنیا پر حکمرانی کی۔ دنیا کو عدالت ، شجاعت اور جہانگیری کے انداز سکھائے۔اقبال کی بہت سی طویل نظمیں مسلمانوں کے جاہ وحشمت کی عکاسی کرتی ہیں۔تحریک خلافت کے دوران بھی اقبال امت مسلمہ کے اتحاد اور ترکی میں خلافت کے استحکام کی دعوت دیتے رہے۔پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے بعد انگریزوں نے ترکی میں خلافت کے خاتمہ کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔ترکی میں مسلمانوں کی ڈگماتی کشتی کو اتاترک مصطفیٰ کمال نے بڑے کمال سے سہارا دیا۔

اتاترک مصطفیٰ کمال نے ۱۸۸۱ء کو سالونیکا کے متوسط خاندان میں جنم لیا۔ابھی وہ سات برس کے تھے کہ انھیں داغ یتیمی ملا۔ مصطفیٰ کمال سالونیکا اور مناستیر کے فوجی سکولوں میں زیرِ تعلیم رہے اور ۱۹۰۵ء میں وہاں سے سٹاف کیپٹن بن کر نکلے۔طالب علمی کے زمانہ میں وہ بہترین مقرر کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔انھوں نے خلیفہ عبدالحمید کے اقتدار کے خلاف سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا بھی کیا۔جیل سے رہائی کے بعد فوج میں ملازمت اختیار کی۔اس دوران خفیہ تنظیم مجلس اتحاد و ترقی سے ان کا رابطہ استوار ہوا وہ نوجوان ترک رہنماؤں کی مدد سے ترکی کی از سرِ نو تعمیر و ترقی کے لیے کام کرنے لگے۔۱۹۰۸ء میں انھوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جنگ اطالیہ اور جنگ بلقان میں مختلف محاذوں پر فوجی خدمات انجام دیں انھوں نے اپنی بہادری، شجاعت اور ذہانت سے خوب شہرت پائی۔پہلی جنگِ عظیم میں انھوں نے بھرپور انداز میں حصہ لیا ان کی درخواست پر انھیں جنگی خدمات سپرد کی گئیں۔۱۹۱۵ء میں

انھیں جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۱۹۱۶ء میں روسی فوج کو شکست دے کر ترکی مقبوضہ علاقہ آزاد کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو ساتویں فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو معاہدۂ امن پر دستخط ہو گئے۔ جس کے بعد ساتویں فوج توڑ دی گئی اور مصطفیٰ کمال واپس استنبول طلب کر لیے گئے۔ اس وقت خلیفہ وحید الدین سریر آرائے صاحب اقتدار تھے۔ انھوں نے مصطفیٰ کمال کو فوج کا انسپکٹر جنرل تعینات کر دیا مصطفیٰ کمال نے تحریک مقاومت ایسی تنظیم قائم کی جو مادر وطن کے تحفظ کے لیے سرگرمِ عمل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں اتاترک انگورہ میں ترکی کی پہلی اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۱ میں ان کی قیادت میں ترکوں نے یونانیوں کے خلاف جنگ چھیڑی، جنھوں نے ایشیائے کوچک کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر یونانی فوج ترکی سرحدوں سے باہر نکال دی گئی۔ انگریزوں کے درمیان براہ راست جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، لیکن کمال اتاترک نے اپنی فراست سے یہ خطرہ ختم کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ترکیہ کو جمہوریہ قرار دے دیا اور کمال اتاترک اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی دور رس اصلاحات نافذ کیں اور ترکی بڑی تیزی سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہوا۔ ۱۹۳۴ میں قوم کی طرف سے انہیں اتاترک (بابائے ترک) کا لقب دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک ۱۹۳۸ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔

نہ مصطفیٰ ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
(کلیات اردو، ص ۶۰۴)

نظم: خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا

امتے بود کہ ما از اثر حکمتِ او
واقف از سرِ نہا نخانہ تقدیر شدیم
اصل ما یک شرر باختہ رنگے بودست
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم

نکتۂ عشق فرو شست زدل پیرِ حرم
در جہاں خوار باندازۂ تقصیر شدیم

بادِ صحرا ست کہ با فطرت مادر سازد
از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم

آہ آں غلغلہ کر گنبد افلاک گذشت
نالہ گردید چو پا بند بم وزیر شدیم

اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیر و کماں ، کشتۂ نخچیر شدیم

(کلیات فارسی، ص ۳۰۸)

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود
گفت نقشِ کہنہ را باید زدود

(کلیات فارسی، ص ۶۵۴)

OOO

غلام قادر روہیلہ

ڈاکٹر علامہ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے برعظیم پاک و ہند کی تاریخی شخصیات کو کسی نہ کسی حوالے سے متعارف ضرور کروایا۔ مغلوں کی تاریخ پر اقبال کی خصوصی نظر رہی۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اقبال نے باصلاحیت افراد کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا تذکرہ بھی کیا جو ظلم و جبر کی تصویر بنے رہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نجیب الدولہ نے جنوبی ایشیاء میں مرہٹوں کی یلغار روکنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان کا بادشاہ بنا۔ نجیب الدولہ کی دعوت پر اس نے ۱۷۶۷ء میں ہندوستان پر کئی حملے کیے جن میں سب سے مشہور حملہ ۱۷۶۱ء میں ہوا۔ اس حملے میں اس نے مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری لڑائی میں عبرت ناک شکست دی۔ غلام قادر روہیلہ، نواب نجیب الدولہ روہیلہ کا پوتا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے ظلم و جبر کو ختم کیا اور انھیں شکست دے کر ان کی طاقت کے گھمنڈ کو خاک میں ملایا لیکن وہ واپس چلا گیا اور نجیب الدولہ کو مغل حکومت کا وزیر اعظم مقرر کر گیا لیکن جب نجف علی خاں وزیر اعظم بنا تو اس نے روہیلوں پر حملہ کر کے ان کو شکست دی اور ان پر بڑے مظالم ڈھائے۔ ظلم کی عمر طویل نہیں ہوتی تاریخ نے یہ بات پھر ثابت کر دی کیوں کہ نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے کمسنی میں تمام مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس نے ان مظالم کا انتقام لینے کے لیے خود کو تیار رکھا۔ مسلسل محنت، ریاضت، تجربہ اور قوت کے بل بوتے پر نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے اپنے خاندان کا بدلہ لینے کے لیے دہلی پر قبضہ کر کے مغل بادشاہ شاہ عالم کی آنکھیں نکال دیں۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو اس نے حرم کی شہزادیوں کو جمع کر کے ناچنے کا حکم دیا۔

مغلوں کے وہ دربار جہاں طوائفیں رقص کیا کرتی تھیں آج زندہ رہ جانے والی شہزادیاں غلام قادر روہیلہ کے سامنے رقص کناں تھیں۔عورت کے ساتھ بے حرمتی کا یہ انداز شریفانہ نہیں تھا۔اقبال نے اپنی نظم ''غلام قادر روہیلہ میں لکھا ہے۔

رہیلہ کس قدر ظالم جفا جو ، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی
شہنشاہی حرم کی ناز نینانِ سمن برسے
بنایا آہ سامانِ طرب بیدرد نے ان کو
نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر وماہ و اختر سے
لرزتے تھے دلِ نازک قدم مجبور جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یوں ہی کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اس کی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغفر سے
کمر سے اٹھ کے تیغِ جانستاں آتش فشاں کھولی
سبق آموزِ تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

(کلیاتِ اُردو، ص ۲۱۷)

ooo

جلال الدین محمد اکبر

جلال الدین محمد اکبر سلطنت مغلیہ کے دوسرے فرماں روا ہوئے۔ ہمایوں کے صاحبزادے۔ ہمایوں نے جلاوطنی کے زمانے میں ایک ایرانی عورت حمیدہ بانو سے شادی کی اکبر اس کے بطن سے ۱۵۴۲ء میں امرکوٹ کے مقام پر دنیائے رنگ و بو میں آئے۔ ہمایوں کی وفات ۱۵۵۶ء کے وقت اکبر کی عمر تقریباً چودہ سال تھی اور وہ اس وقت اپنے اتالیق بیرم خان کے ساتھ کوہِ شوالک میں سکندر سوری کے تعاقب میں مصروف تھا باپ کی وفات کی خبر اسے کلانور ضلع گورداسپور (مشرق پنجاب) میں ملی۔ بیرم خان نے وہیں اینٹوں کا ایک چبوترا بنوا کر اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور خود اس کا سرپرست بنا۔ تخت نشین ہوتے ہی چہار جانب سے دشمنوں کے گھیرے میں آ گئے ہیموں بقال کو پانی کی دوسری لڑائی ۱۵۵۶ء میں شکست دی۔ مشرق میں عادل شاہ سوری کو کھدیڑا پھر اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دینی شروع کی۔ ۱۵۵۶ء میں دہلی، آگرہ، پنجاب گوالیار، اجمیر اور پھر جون پور، بیرم خان نے فتح کیے۔ ۱۵۶۲ء میں مالوہ، ۱۵۶۴ء گونڈوانہ، ۱۵۶۸ء چتوڑ، ۱۵۶۹ء میں رنتھمبور اور کالنجر، ۱۵۷۲ء میں گجرات، ۱۵۷۶ میں بنگال، ۱۵۸۵ء میں کابل، کشمیر اور سندھ، ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ، ۱۵۹۵ء میں قندھار کا علاقہ پھر، احمد نگر، اسیر گڑھ اور دکن کے دوسرے علاقے فتح ہوئے اور اکبر کی سلطنت بنگال سے افغانستان تک اور کشمیر سے دکن میں دریائے گوداوری تک پھیل گئی۔

اکبر بے حد ذہین و فطین تھے۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے عالموں کی صحبت نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ جلال الدین محمد اکبر نے اس چیز کا ادراک حاصل کر لیا تھا کہ اقلیت کسی اکثریت پر اس کی مرضی کے بغیر زیادہ عرصے تک حکومت نہیں کر سکتی۔ اس نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کی خاطر

انہیں زیادہ سے زیادہ مراعات دیں اور ان کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کیے۔ اس نے دینِ الٰہی کی بنیاد رکھی یہ انتہا پسندانہ اقدام تھا۔ نیا دین، دینِ الٰہی دراصل اسلام، برہمن، عیسائیت اور زرتشت، بدھ مت کا ملغوبہ تھا۔ اس دینِ الٰہی کو علماء نے سخت ناپسند کیا اور اکبر کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ اکبر کے دربار میں علم وفن کے ماہر اساتذہ موجود ہوتے تھے۔ دانشور اور اکابر شخصیات موجود تھیں۔ ان سب کے مشوروں اور تجاویز کی روشنی میں اکبر نے پچاس سے زائد برس حکومت کی۔ علماء کی اکثریت نے اکبر کو ملحد اور بے دین گرانا ہے۔ اکبر نے ہندوؤں کی حمایت حاصل کر کے فتوحات کے ذریعے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دی اور افغانستان سے لے کر خلیج بنگال، اور ہمالیہ سے لے کر دریائے گوداوری تک کے علاقے کو زیرِ نگین کر لیا تھا۔ اکبر نے فنِ مصوری کو عروج تک پہنچایا۔ ایران سے کئی مصور آئے جن سے ہندوستانی صناعوں نے مصوری کی تکمیل کی اور رفتہ رفتہ یہاں بھی فنِ مصوری اس عروج پر پہنچ گیا کہ ایران ہندوستان سے بہت پیچھے رہ گیا۔ موسیقی میں تان سین بہت مشہور تھا جو اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے ادبیات کی سرپرستی کرتے ہوئے سنسکرت، عربی، ترکی، یونانی سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کروائیں سنسکرت سے جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں رامائن، مہابھارت، بھاگوت، گیتا، اتھروید، اور ریاضی کی ایک کتاب ''لیلاوتی'' مشہور ہیں۔ ہندی کے دو بہترین شاعر سورداس اور تلسی داس اکبر کے ہم عصر تھے۔ بیرم خاں کا لڑکا عبدالرحیم خان خاناں خود ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ملک الشعرا کا عہدہ بھی غالباً اکبر کے زمانے سے شروع ہوا۔ جس پر پہلے غزالی اور پھر فیضی مامور ہوا جو ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں گنا جاتا ہے۔ اس عہدہ پر جو شخص مامور ہوتا تھا، اس کا کافی وقت مدحیہ قصائد اور بادشاہ، بادشاہزادوں کے کارنامے نظم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ علامہ ابوالفضل مصنف آئینِ اکبری اور اکبر نامہ مشہور ہیں۔

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرت دار ادمید
(کلیاتِ فارسی، ص ۹۸)

ooo

سر آغا خان سوم

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور سر آغا خان سوم ایک ہی سن یعنی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ سر سلطان محمد شاہ المعروف آغا خان سوم نے مالی اعتبار سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک رابطے کی زنجیر تھے۔ اسماعیلی فرقے کے اماموں کو "آغا خان" کہا جاتا ہے۔ آغا خانی فرقے کے یہ افراد براہ راست حضرت فاطمہؓ اور حضور نبی اکرم ﷺ سے نسبت رکھتے ہی۔ سر آغا خان سوم کی والدہ ایران کے وزیر اعظم نظام الدولہ کی صاحبزادی تھیں۔ آغا خان ابھی آٹھ برس کے تھے کہ ان کے والد آغا علی شاہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بچپن میں ہی امامت کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں۔ والدہ نے اعلیٰ اساتذہ کا اہتمام کیا اور سلطان محمد شاہ کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا سلطان محمد شاہ عربی، فارسی علوم وفنون اور زبانوں سے بھی آگاہ ہو گئے۔ انھوں نے فلسفہ، دینیات منطق اور علم الکلام میں بھی مہارت حاصل کی۔ اکیس بائیس سال کی عمر میں انھوں نے علوم وفنون، تاریخ وفلسفہ، اسلام، قرآنی تعلیمات میں اس قدر دسترس حاصل کی کہ لوگ ان کی امامت پر ناز کرنے لگے۔ فلاحی ورفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں یورپ جانے کا اتفاق ہوا وہاں انھوں نے ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کی۔ یورپ سے واپسی پر ان کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لارڈ کرزن نے انہیں امپریل لجسلیٹو کونسل کے ممبر کے طور پر منتخب کر لیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سرسید احمد خان نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۰۲ء میں اس کے دہلی میں کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت سر آغا خاں نے کی۔ ۱۹۰۴ء میں بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت سر آغا خاں نے کی اور مسلمانوں کے لیے جدید

علوم وفنون حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔لارڈ کرزن کے بعد لارڈ منٹو جب ہندوستان کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے تو وہ بھی سر آغا خان کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔لارڈ منٹو مسلمانوں کے مطالبات سے بے خبر تھے اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک وفد کی صورت میں ان سے ملاقات کی جائے یوں پینتیس مسلمانوں کا وفد سر آغا خاں کی سربراہی میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملاقات کے لیے شملہ پہنچا۔اس ملاقات میں سر آغا خاں نے نہایت عمدگی سے مسلمانوں کے مطالبات سے وائسرائے کو آگاہ کیا وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے بڑے ہمدردانہ انداز میں کہا تھا کہ ''میں ذاتی طور پر آپ لوگوں کے تمام مطالبات کا احترام کرتا ہوں اور انہیں اہم بھی سمجھتا ہوں آپ لوگ دیکھیں گے کہ عنقریب ہندوستان کے حالات میں تبدیلی واقع ہونے والی ہے اس لیے حالات سے کی تغیر پذیری سے صرف نظر کرنا بہت بڑی نادانی ہوگی اور میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ حیثیت کا تعین ضروری ہے۔'' سر آغا خان نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں چندہ تک جمع کیا اور بہت جلد تیس لاکھ روپے جمع کر کے مسلم کالج علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی بنانے کے لیے پیش کیے۔ سر آغا خان ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔۱۹۱۱ء کو جب اٹلی نے ترکی کے ایک علاقے طرابلس پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں پر قتل وغارت شروع ہوئی تو دنیا بھر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔گول میز کانفرنسوں میں بھی ان کا کردار بڑا جاندار رہا ان کی اولین کوشش ہوتی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو سکے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

وفد ہندُستان سے کرتے ہیں سر آغا خان طلب
کیا یہ چورن ہے پے ہضمِ فلسطین و عراق؟

(کلیات اردو، ص ۲۹۰)

ooo

سلطان قطب الدین ایبک

انارکلی لاہور کی رنگینیوں اور پُر رونق بہاروں کے بالکل قریب نہایت خستہ حالت مزار میں ایک سلطان وقت آسودہ خاک ہے۔لوگ ہسپتال تک جاتے ہوئے اس محسنِ مسلمانان برعظیم کے لیے دعائے مغفرت تک کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔سلطان قطب الدین ایبک نے برعظیم پاک و ہند میں اسلامی فتح ونصرت کا پرچم بلند کیا۔ایبک کا تعلق ترکی نسل سے تھااس کی زندگی نشیب و فراز میں گزری۔ایک سوداگراس کو ترکستان سے خرید کر نیشاپور لے آیااور قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے ہاتھ فروخت کردیا۔اس سے سلطان شہاب الدین غوری نے خریدا تھا۔اس کی شکل وصورت اچھی نہ تھی۔اس کی ایک چھنگلی بھی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے لوگ اس کو ایبک شل (خستہ انگشت) کہتے تھے۔قطب الدین بے پناہ خوبیوں کا مالک تھا اس نے رفتہ رفتہ اپنی خدا داد صلاحیتوں سے سلطان شہاب الدین غوری کا دل موہ لیا۔سلطان نے اسے کئی محاذوں پر اپنے ساتھ رکھا۔شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۲ء میں دہلی اور اجمیر فتح کر کے اسے ان کا گورنر بنا دیا۔

سلطان شہاب الدین نے قنوج پر حملہ کیا تو قطب الدین ایبک نے بھرپور انداز میں سلطان کا ساتھ دیا اس فتح کے بعد سلطان شہاب الدین نے اسے اپنا فرزند بنا کر فرمان فرزندی اور سفید ہاتھی سے سرفراز کیا۔قطب الدین ایبک کا اقبال بلند سے بلند ہوتا چلا گیا۔ایک فتح کے بعد دوسری فتح اس کے نصیب میں لکھی جاتی رہی۔

قطب الدین کی گورنری کا زمانہ فتوحات میں گزرا تھا تخت پر بیٹھ کر اس نے امور سلطنت پر خصوصی توجہ دی۔اس کا بیشتر وقت نوزائیدہ اسلامی سلطنت میں امن وامان قائم رکھنے میں گزرا۔

علم پرور تھا وہ علماء کی دل سے قدر کرتا اپنی فیاضی اور قدردانی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔

ایبک نے گجرات، راجپوتانہ، دوانہ، گنگ وجمن، بہار اور بنگال پر اپنی فتح کے پرچم لہرائے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سلطان کا غلام ہی سمجھتا رہا لیکن جب غوری مارا گیا تو ایبک نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۲۱۰ء میں چوگان (پولو) کھیلتے ہوئے راہی ملک بقا ہوا۔ اس کا مزار انار کلی لاہور میں ہے۔ دہلی میں مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار اسی نے بنوائے تھے۔ قطب مینار کو بعد میں سلطان التمش نے مکمل کیا۔ انار کلی بازار کے ایک کوچے ایبک روڈ میں دفن ہے۔ صدر ایوب خان نے اپنے عہد میں اس عظیم جرنیل سپہ سالار اور گورنر کا شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

فارسی

خیز و کارِ ایبک و سوری نگر
وانما چشمے اگر داری جگر

(کلیات فارسی، ص ۵۸۵)

اُردو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو!

(کلیات اردو، ص ۳۶۶)

OOO

ٹیپو سلطانؒ

موسم آبر آلود ہے، بجلی کی کڑک اور چمک میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دے رہی ہے کہ مجھے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کا وہ دن تڑپا رہا ہے کہ جب شیر ہند، سلطان اعظم، مجاہد بے باک، غیور اسلام نے موسلا دھار بارش اور رعد کی گرج چمک میں شیر کی طرح موت کو ہمسفر کیا۔ سلطان فتح علی ٹیپو ہماری تاریخ کا وہ روشن و درخشاں ماہتاب ہے جسے اپنوں کی سازشوں نے شکست کی دہلیز تک پہنچایا۔

ٹیپو سلطان ۲۱ دسمبر ۱۷۵۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ سلطان حیدر علی ایک جری اور بہادر بادشاہ تھا۔ بچپن ہی سے ٹیپو سلطان کی تربیت اور تعلیم کا خصوصی انتظام کیا گیا اور اندرون و بیرون ملک سے اس کے لیے بہترین اساتذہ بلوائے گئے۔ ذہانت ٹیپو سلطان کو خداداد ملی تھی لہٰذا وہ علم و بصیرت کی منازل تیزی سے طے کرنے لگا۔ سلطان حیدر علی کو کئی اندرونی باغیوں کے ساتھ ساتھ فرنگیوں کے حملوں اور ان کی بڑھتی ہوئی فتوحات کا ڈر تھا۔ لہٰذا اس نے ٹیپو سلطان کو سلطنت کے معاملہ میں خاصا زیرک بنا دیا۔ چنانچہ اپنے والد کی وفات کے بعد ۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو اقتدار سنبھالتے ہی ٹیپو سلطان کو بے شمار بیرونی خطرات کا سامنا تھا۔ ایک طرف نظام حیدر آباد اور مرہٹے تو دوسری جانب انگریزوں کے حملوں نے اس کے تفکرات میں اضافہ کر دیا تھا۔

ٹیپو سلطان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ ایک معروف بہادر نوجوان معظم علی جو مختلف سلاطین ہند کی افواج میں لڑ چکا تھا، حیدر علی کے پاس آیا چنانچہ حیدر علی نے اسے اپنی جری فوج کے بہترین عہدہ پر فائز کر دیا۔ ٹیپو سلطان نے ایک مرتبہ معظم علی کو جنگ پلاسی کی معلومات حاصل کرنے کے لیے بلایا۔ معظم علی نے یہی خیال کیا کہ ٹیپو سلطان دس بارہ سال کی عمر کا

کم عمر لڑکا ہے جو چند چیدہ چیدہ باتیں پوچھے گا مگر ٹیپو سلطان نے نقشہ کے مطابق ایک ایک پہلو کے حوالے سے معلومات حاصل کیں تو معظم علی دنگ رہ گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ضرور کوئی کارہائے نمایاں انجام دے گا۔ لہٰذا برسر اقتدار آتے ہی اس نے میسور اور سرنگا پٹم کے اندرونی و بیرونی حالات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اسے بیک وقت کئی محاذوں پر سازشوں، دشمنوں اور باغیوں سے لڑنا تھا۔ سلطان ٹیپو کی حکمت عملی بہت زبردست تھی۔ وہ اپنے ملک کو انگریز حملہ آوروں اور باغیوں ایسے ناسور سے پاک دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ لہٰذا ٹیپو سلطان نے وطن اور اہل وطن کے لیے آخری سانس تک جدوجہد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ٹیپو سلطان بے خطر ان لٹیروں اور مفاد پرستوں کے دستوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بدنام زمانہ ''سب سڈی ایری سسٹم'' کو بھی سلطان فتح علی ٹیپو نے ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سسٹم کو ماننا انگریزوں کو اپنے ملک پر کھلے عام حکمرانی کرنے کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ٹیپو سلطان کی سیاسی بصیرت لاجواب تھی۔ ٹیپو سلطان نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے نمٹنے کے لیے بہترین حکمتِ عملی اپنائی مگر اس کے وزیر میر صادق اور ریاست کے دیوان پورنیا نے انگریزوں سے بالا ہی بالا گٹھ جوڑ کر لی۔ ادھر انگریزوں نے سرنگا پٹم اور میسور کے ایسے زمینداروں جن کی زمینیں، سلطان ٹیپو نے عوام میں برابر تقسیم کر دی تھیں، کو بھی ساتھ ملا لیا اور مرہٹوں سے بھی معاہدے کر لیے۔ میر صادق نے جنگی مہم کے تمام راز انگریز حکمرانوں کو بتا دیئے اور پورنیا نے عین میدانِ جنگ میں لڑائی کے وقت فوجوں کو تنخواہوں کے بہانے واپس بلا لیا اب میدانِ جنگ میں ٹیپو سلطان اور اس کے چند جانثار ساتھی رہ گئے مگر ٹیپو سلطان جوشِ شہادت کے بل پر آگے بڑھتا گیا اور دشمن پر وار کرتا رہا۔ اس کے جانباز سپاہی کٹ کٹ کر گرنے لگے مگر ٹیپو سلطان دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیر کی طرح سینہ سپر ہو گیا۔

شمعِ آزادی کا بے تاب پروانہ شیر کی طرح گرجدار آواز و بے باک لہجہ کے ساتھ زندہ رہا اور وقت شہادت بھی برق کی گرج کے ساتھ جاں راہی برحق کے سپرد کر دی۔ اس کے دشمن بھی حقیقت کہے بنا نہ رہ سکے کہ

He lived a lions's life.

He died a lion's death.

آزادی ہند کا واحد علمبردار، بے باک نوا کا سپاہی، خود مختار ہند کا ماہتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوا اور ہندوستان ایک کڑے اور طویل عرصہ کے لیے غلامی ومحکومی کے دبیز اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ٹیپو سلطان نے ایک مشہور جملہ کہا تھا ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے'' اور اس نے ثابت کر دیا کہ جیو تو سر اٹھا کر اور مرو تو گردن جھکی نہ ہو۔

نظم: سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز، گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!
باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

(کلیاتِ اردو: ص۵۳۴-۵۳۵)

○○○

سلطان محمود غزنویؒ

سلطان ادب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلم فاتحین کو خراج عقیدت پیش کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کا نام آتے ہی ''سومنات کا مندر'' ایک استعارہ کی صورت سامنے آتا ہے۔ مسلم شہداء اور غازیوں کے لیے اقبال کا قلم ہمہ وقت مصروفِ عمل رہا۔ سلطان محمود غزنوی کا شمار بھی ان جری بہادروں میں ہوتا ہے جن کا تذکرہ علامہ اقبال کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی زندگی مسلمان نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ان کی زندگی کے شب و روز کا احاطہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی ۹۷۱ء کو اپنے والد سبکتگین کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ ۲۷ سال کی عمر میں ۹۹۸ء میں، غزنی کے تحت پر بیٹھے۔ اس وقت سلطنت غزنی میں افغانستان، خراسان، سیستان اور مشرقی ایران کے علاقہ جات شامل تھے۔ سلطان محمود غزنوی بہادری اور شجاعت میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ مہم جو بھی تھے۔ انھوں نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کیے۔ پہلا حملہ ۱۰۰۱ء میں کیا اور چند سرحدی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ راجا جے پال کو پشاور کے قریب شکست دی۔ ۱۰۰۵ء میں ملتان کو فتح کر لیا۔ اسی سال جے پال کے بیٹے آنند پال کو شکست دی۔ اس نے حاکم ملتان کی مدد کر کے عہد شکنی کی تھی۔ ۱۰۰۹ء میں نارائن پور کے راجہ کو مطیع کیا۔ ۱۰۱۲ء میں تھانیسر پر قبضہ کر لیا۔ دو مرتبہ کشمیر پر بھی چڑھائی کی۔

۱۰۱۸ء میں سلطان دریائے جمنا تک جا پہنچے۔ اس کے بعد قنوج پر چڑھائی کی۔ ۱۰۲۱ء میں لاہور پر حملہ کر کے راجا بھیم سین کو عبرت ناک شکست دی اور پنجاب کو سلطنت غزنی میں شامل کر کے یہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ ۱۰۲۱ء۔ ۱۰۲۲ء میں سلطان نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور کالنجر جاتے ہوئے

گوالیار کے راجا کو مطیع کیا۔ کالنجر کے راجا نے باجگزار بننا منظور کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی کی ان تمام مہمات میں سب سے بڑی اور سولہویں مہم کاٹھیاواڑ کے ایک مقام سومنات کی تسخیر (۶ جنوری ۱۰۲۶ء) ہے۔ یہاں ایک عالی شان مندر تھا جس میں بے شمار دولت جمع تھی۔ یہ ساری دولت محمود غزنی لے گئے۔ انھوں نے سترھواں اور آخری حملہ ان جاٹوں کے خلاف کیا جنھوں نے سومنات سے واپسی پر اس کی فوجوں کو تنگ کیا تھا۔ سلطان کی ساری زندگی جنگ و جدل میں بسر ہوئی اور جب وہ فوت ہوئے تو ان کی سلطنت بحیرہ خزر اور عراق سے دریائے گنگا تک اور بحیرہ ارال اور ماوراء النہر سے بحیرۂ عرب، سندھ اور راجپوتانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا (کلیات اردو، ص ۱۲۹)

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز (کلیات اردو، ص ۱۶۵)

درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز (کلیات اردو، ص ۱۷۶)

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری (کلیات اردو، ص ۲۶۱)

نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ!
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی! (کلیات اردو، ص ۳۷۴)

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات (کلیات اردو، ص ۴۰۴)

فرد فال محمود سے در گزر
خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر (کلیات اردو، ص ۴۲۰)

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی (کلیاتِ اردو، ص۴۳۸)

حاصل اس کا شکوہ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی (کلیاتِ اردو، ص۵۵۱)

چشم فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو
کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقام محمود (کلیاتِ اردو، ص۵۶۷)

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمی احرار (کلیاتِ اردو، ص۵۸۷)

ooo

خلیفہ ہارون الرشیدؒ

ہارون الرشید کا عہد حکومت تاریخ اسلامی کا ایک زریں باب ہے۔ ہارون الرشید دولت عہد عباسی حکومت کا ایک سنہری دور تھا۔ ان کے دورِ اقتدار میں دولت عباسیہ نے علمی، ادبی، تمدنی، سیاسی غرض ہر حیثیت سے ترقی و کامیابی کے پرچم بلند کیے۔ انھوں نے تیس سال اور اڑھائی ماہ خلافت کی۔ ان کے دورِ حکومت کو تہذیب وتمدنِ اسلامی کی وسعت، خوش حالی اور زرنگاری کی کثرت کے اعتبار سے عہدِ عروس کہا جاتا ہے۔

ہارون الرشید ۷۶۳ عیسوی جب کہ ۱۴۷ ہجری کو عباسی خلیفہ مہدی کے ہاں ''رے'' کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے دادا خلیفہ منصور کو جب ان کی ولادت کی خبر عراق میں ملی تو انھوں نے اس کو نیک شگون قرار دیا کیونکہ وہ ان دنوں نیا دارالخلافہ بغداد بنوا کر اس میں منتقل ہونے والے تھے۔ کیونکہ پوتے کی ولادت اور بغداد کے دارالخلافہ کی تعمیر ایک ہی دن پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ تین برس ''رے'' میں گزارنے کے بعد مہدی جب بغداد آئے تو ان کا استقبال خود خلیفہ منصور نے کیا۔ دادا نے ہارون کے بارے میں کہا کہ میرا بیٹا ان شاء اللہ صاحبِ اقتدار و اختیار بنے گا کیوں کہ میں ابھی سے اس میں اس طرح کے آثار دیکھ رہا ہوں۔

ہارون الرشید کی خوش قسمتی کہ انھیں زہد و تقویٰ اور شعبہ قرأت میں خوب نام رکھنے والے علی بن حمزہ کسائی سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ علی بن حمزہ لغت، ادب اور نحو میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فضل بن محمد غی سے بھی بہت کچھ سیکھنے کا موقع میسر آیا۔ انھی اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ خلیفہ ہارون الرشید کی شخصیت پیار، محبّت اور خلوص کا مرقع بن گئی۔ ان کے والد مہدی نے

انھیں ورزش اور فنون سپاہ گری سے بھی آشنا کروایا۔

ہارون الرشید کی شادی ۷۸۱ کو بنو ہاشم کی ایک ممتاز خاتون زبیدہ بنت جعفر سے ہوئی۔

ہارون الرشید نے ۲۳ برس کی عمر میں ۷۸۶ء کو عنان اقتدار سنبھالا۔

ابو مسلم، ابو سلمہ اور دیگر حامیوں کی مدد سے عراق پر ابوالعباس سفاح نے ۱۳۲ ہجری کو خلافت کا اعلان کیا گیا۔ محمد بن علی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امام ابراہیم جانشین ہوئے انھیں خلیفہ مروان ثانی نے پہلے قید کر لیا پھر انہیں قتل کروا دیا گیا۔ ابراہیم نے گرفتاری سے قبل اپنے بھائی ابو العباس کو وصی مقرر کیا۔ ابوالعباس نے آبائی مسکن قصبہ حمیمہ کو چھوڑ کر کوفہ رہائش رکھی۔ ابوالعباس نے اپنی خلافت کے استحکام کے لیے بڑی خون ریزی کی۔ اس نے بنوامیہ کو تہ تیغ کر ڈالا۔ ابوالعباس کے جوشِ انتقام سے مردوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ امیر معاویہ، یزید، عبدالملک اور دیگر اموی خلفاء کی قبریں اکھڑوا کران کی ہڈیاں چور چور کر دیں۔ ہشام کی لاش سالم نکلی اور کوڑے مروا کر سولی پر لٹکا ڈیا پھر نذر آتش کر دیا اسی خونریزی کی وجہ سے وہ ''سفاح'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ ۱۳۶ ہجری میں سفاح نے انتقال کیا ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی ابو جعفر منصور اور اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کو بالترتیب ولی عہد مقرر کیا۔ ابو جعفر منصور کا عہد ۱۳۶ ہجری تا ۱۵۸ ہجری تک ہے۔ خلیفہ منصور کی وفات کے بعد ۱۵۸ ہجری میں مہدی خلیفہ مقرر ہوئے۔ محرم ۱۶۹ ہجری میں مہدی نے وفات پائی۔ مرنے سے قبل مہدی نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ الہادی اور ہارون الرشید کو ولی عہد مقرر کیا۔ موسیٰ الہادی ۱۶۹ ہجری میں خلیفہ بنا جو ۱۷۰ میں انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد ہارون الرشید ۱۷۰ ہجری بمطابق ۷۸۶ عیسوی میں مسندِ خلافت پر براجمان ہوئے

ہارون الرشید کو مہدی نے اپنے دورِ حکومت میں مشرقی مملکت کا گورنر مقرر کیا اور ۱۶۵ ہجری میں ایک لشکر جرار کے ساتھ قسطنطنیہ کی مہم پر بھیجا جس میں وہ فتح یاب و کامران ہو کر لوٹا۔

مہدی کے بعد ہادی خلیفہ بنا تو اس نے ہارون الرشید کی ولی عہدی کو ختم کرتے ہوئے اپنے بیٹے جعفر کو جانشین نامزد کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہارون الرشید کے دور میں علویوں کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اپنایا گیا۔ مگر ہارون الرشید نے کسی قسم کی شورش اور بغاوت کو بھی قبول نہ کیا۔ ہارون الرشید نے سلطنت کے مروجہ نظم و نسق کو بہت بہتر کیا کئی نئی اصلاحات کیں۔ کئی شعبوں کو از سرِ نو ترتیب دے کر ان میں موجود خامیوں کو دور کیا۔ ہارون کو رعایا کی بہبود کا بہت خیال رہتا وہ اکثر گلیوں، کوچوں

میں بھیس بدل کر نکل جاتے تاکہ لوگوں کے حالات سے باخبر رہ سکیں۔محتاجوں اور ناداروں کا پتہ لگا کر ان کے وظیفے مقرر کیے گئے۔ان کی انصاف پسندی کی شہرت بہت دور دور تک پھیل گئی۔ان کے عہد میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن شہر سمجھا جانے لگا۔شہر کی سر بفلک عمارتوں اور عالی شان محلات کو دیکھ کر سیاح ششدر رہ جاتے۔قصر خلافت کی عمارات فن تعمیر کی عمدہ مثالیں تھی۔امراء و وزراء، اور تاجروں کے مکانات بھی بہت عالی شان اور نقاشی اور خوبصورتی کے لحاظ سے کسی سے کم نہ تھے۔مال و دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ صوبائی اخراجات وضع کرنے کے بعد بھی بیت المال میں ہر سال چالیس کروڑ درہم کی رقم موجود ہوتی۔

انھوں نے بدعنوان افسران کو تبدیل کر کے ان کی جگہ امانت دار افسران کو لگایا۔تمام غیر شرعی محاصل فی الفور بند کروا دیے۔مشہور عالم اور فقیہ قاضی ابو یوسف سے خراج کے قوانین کے متعلق ایک رسالہ بھی تحریر کروایا جو ”کتاب الخراج“ کے نام سے مقبول ہوا جو آج بھی فقہائے کرام کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید ۳ جمادی الثانی ۱۹۳ ہجری کو انتقال کر گئے ان کی وفات کے بعد اپنے صاحبزادے صالح نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

قائد اسلامیان ہاروں رشید
آنکہ نقفور آب تیغ او چشید

(کلیاتِ فارسی، ص ۱۵۹)

○○○

امیر امان اللہ خان، بادشاہ افغانستان

امیر امان اللہ خان درددل رکھنے والے ایسے والئی افغانستان تھے جو انگریزوں کے خلاف برسر جنگ رہے انھوں نے ہر محاذ پر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا یہاں تک کہ انگریز ان کے آگے بے بس ہو گئے تھے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے ان کی بہادری اور جرأت و شجاعت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ امیر امان اللہ خان کے والد گرامی سردار حبیب اللہ خان والئی افغانستان تھے ان کی وفات کے بعد امیر امان اللہ خان نے افغانستان کا تاج اپنے سر پر سجایا۔

امیر امان اللہ خان افغانستان کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے تو انھوں نے انگریز حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انھوں نے ہر جگہ پر ان کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو بھی اس برطانوی حکومت کے خلاف اکسایا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے امیر امان اللہ خان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ایک معاہدے کے تحت افغانستان کی مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد امیر امان اللہ خان نے ایران اور روس کے ساتھ بھی معاہدۂ دوستی کیا جس کے بعد ایک دستور اساسی کا اعلان کیا گیا۔

امیر امان اللہ خان افغانستان کو بہت جلد ترقی یافتہ ممالک کی صف میں دیکھنے کے تمنائی تھے ان کی خواہش تھی کہ افغانستان اقتصادی و معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں کی سطح پر اٹھ جائے اسی مقصد کے تحت انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ہندوستان، مصر اور یورپ کے طویل دورے کیے۔ ان ممالک کے ساتھ کئی طرح کے معاشی، اقتصادی معاہدے کیے اور دنیا بھر میں افغانستان کو متعارف کروانے میں ہر طرح سے کوشش کی۔ اور کئی طرح کی اصلاحات نافذ کر دیں۔

۱۹۲۸ء میں بعض مغربی ممالک کے اکسانے پر ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند ہو گیا

انھوں نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے اقتدار کی باگ ڈور اپنے بھائی کے حوالے کر کے روم تشریف لے گئے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے ان کی اس ناکامی پر کچھ اس طرح کا اظہار خیال کیا:

''معلوم ہوتا ہے کہ امیر امان اللہ خان کی ناکامی کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ انھوں نے اصلاحات نافذ کرنے میں عجلت اور فوج کی طرف توجہ کرنے میں غفلت سے کام لیا اور دنیا کے ملاؤں کے نظریئے کے خلاف حقیقی ترقی میں گہری دلچسپی لی اس سے بلاشبہ افغانستان کے چند علماء ناراض ہو گئے لیکن اس بات کی بھی اطلاع موصول ہوئی کہ وہی حضرت صاحب شورِ بازار جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ اس شورش کے سرغنہ ہیں، انھوں نے اصلاحات کے اعلان پر خود بھی دستخط کیے تھے اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون سے اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ جن کی وجہ سے حضرت صاحب مذکور نے اپنی رائے بدل کر اصلاحات کی مخالفت شروع کر دی۔''

۲۵ نومبر ۱۹۳۱ء کو روم پہنچ کر علامہ محمد اقبال نے امیر امان اللہ خان سے ملاقات کی اور یہ ملاقات تین گھنٹے پر محیط تھی۔ امیر امان اللہ نے بتایا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جو سامان حرب انھوں نے دشمنِ اسلام کے لیے خریدا تھا اب وہ افغانوں کے خلاف استعمال ہو۔ وہ خونریزی کے سخت خلاف تھے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اقتدار خود ہی منتقل کر کے راہِ فراغ حاصل کی اور پھر کبھی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ وہ مستقل طور پر یورپ میں سکونت اختیار کر گئے۔ سوئٹزرلینڈ میں ۲۵/اپریل ۱۹۶۰ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

امیر امان اللہ خان بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ اقبال ان کی سوانح عمری لکھنے کے خواہش مند تھے لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ بہر حال انھوں نے اپنے کلام میں امیر امان اللہ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ اقبال کی ایک طویل نظم ''پیش کش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان فرمانروائے دولت مستقلہ افغانستان'' کا پہلا بند پیشِ خدمت ہے۔

اے امیر کامگار اے شہرِ یار
نوجوان و مثل پیراں پختہ کار
چشم تو از پردگی ہا محرم است
دل میانِ سینہ ات جام جم است

عزم تو پاینده چوں کہسار تو
حزم تو آساں کند دشوار تو
ہمتِ تو چوں خیال من بلند
ملتِ صدپارہ را شیرازہ بند
ہدیہ از شاہنشہاں داری بسے
لعل و یاقوتِ گراں داری بسے
اے امیر ، ابن امیر ، ابن امیر
ہدیۂ از بے نوا ے ھم پذیر

(کلیات فارسی،ص۱۸۵۔۱۸۶)

OOO

پرویز، خسرو

ایران کا مشہور بادشاہ ۵۹۰ء میں پیدا ہوا اور ۶۲۸ء میں فوت ہوا۔ ساسانی سلطنت کا فارسی بادشاہ خسرو اول کا پوتا۔ بازنطینی شہنشاہ موریشیئس نے اسے تخت حاصل کرنے میں مدد دی اور اظہار تشکّر کے طور پر اس نے بازنطینی سلطنت کے بہت سے علاقے واپس کر دیئے جو خسرو اول نے فتح کیے تھے۔ ۶۰۲ء میں موریشیئس کی معزولی اور قتل پر خسرو بازنطین کے خلاف ہو گیا اور اپنا بقیہ سارا عہد اس کے خلاف جنگ کرتے ہوئے گزارا۔ اس نے واپس کیے ہوئے علاقے دوبارہ فتح کیے اور شام و فلسطین سمیت بیشتر جنوب مغربی ایشیاء پر حملہ کیا۔ فارسی افواج ۶۱۶ء میں مصر پر کامیابی سے حملہ آور ہوئیں اور ایک سال بعد کالسیدون (بالمقابل قسطنطنیہ) پر چڑھائی کر دی۔ فارس میں خسرو کے خلاف سازشیں اور شورشیں ہونے لگیں اور بازنطینی شہنشاہ ہیراکلیس (ہرقل) نے اس داخلی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۶۲۳ کی مہم کے دوران فارسی حکمران کو شکست دی۔

شکست کے بعد خسرو معزول اور اپنے بیٹے Kavadh دوم کے ہاتھوں قتل ہوا۔

ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم (کلیات فارسی، ص۱۹)

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی (کلیات فارسی، ص۶۳)

شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد (کلیات فارسی، ص۱۰۴)

من شکوہ خسروی اور ادھم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے اونہم (کلیاتِ فارسی، ص ۱۸۷)

در عشق و ہوس ناکی دانی کہ تفاوت چیست
آں تیشۂ فرہادے ، ایں حیلۂ پرویزے (کلیاتِ فارسی، ص ۳۳۱)

بہر زمانہ بہ اسلوب تازہ می گویند
حکایت غم فرہاد و عشرتِ پرویز (کلیاتِ فارسی، ص ۳۳۹)

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت (کلیاتِ فارسی، ص ۳۶۱)

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود راز خسرو و باز گیر (کلیاتِ فارسی، ص ۳۶۷)

اگرچہ تیشۂ من کوہ راز پا آورد
ہنوز گردشِ گردوں بکام پرویز است (کلیاتِ فارسی، ص ۳۶۷)

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو با شد کوہکن ہست (کلیاتِ فارسی، ص ۳۸۰)

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشۂ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است (کلیاتِ فارسی، ص ۴۰۴)

فقر بخشی ؟ باشکوہِ خسرو پرویز بخش
یا عطا فرما خرد با فطرت روح الامیں (کلیاتِ فارسی، ص ۴۱۷)

بنو اے خود گم اتی سخن تو ، مرقدِ تو
بہ زمیں نہ باز رفتی کہ تو از زمیں نہ بودی (کلیاتِ فارسی، ص ۳۷۳)

بدستم خامۂ دادی کہ نقشِ خسروی بندد
رقم کش ایں چنینم کردہ لوح جبینے دہ (کلیات فارسی، ص۴۲۲)

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ (کلیات فارسی، ص۴۷۵)

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیلِ خسروی است
مسندِ کیقبا درا در تہِ بوریا طلب (کلیات فارسی، ص۵۰۷)

چوں پر کاہ کہ در رہگذر باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو (کلیات فارسی، ص۵۲۲۔۵۸۴)

شکوہِ خسروی این است این است
ہمیں ملک است و توام بدین است (کلیات فارسی، ص۵۴۲)

خسرو پے پیشِ فقیرے خرقہ پوش
مرد کوہستانی ہیزم بدوش (کلیات فارسی، ص۵۷۸)

بکام خود دگر آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملک پرویز (کلیات فارسی، ص۹۵۷)

بگو از من بہ پرویزان ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ درد ست (کلیات فارسی، ص۱۰۱۵)

اُردو

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ (کلیاتِ اردو: ص۲۰۹)

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی! (کلیاتِ اردو: ص۳۰۳)

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز (کلیاتِ اردو: ص۳۰۸)

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی، بے سلطنتِ پرویز! (کلیاتِ اردو: ص۳۱۸)

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی! (کلیاتِ اردو: ص۳۳۲)

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد! (کلیاتِ اردو: ص۳۶۲)

اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز! (کلیاتِ اردو: ص۵۱۶)

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز! (کلیاتِ اردو: ص۵۹۰)

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز! (کلیاتِ اردو: ص۶۱۰)

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر! (کلیاتِ اردو: ص۶۵۰)

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات (کلیاتِ اردو: ص۶۹۰)

○○○

نورالدین محمد جہانگیر

مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا بیٹا۔ جہانگیر ۳۱ اگست ۱۵۶۹ء کو فتح پور سیکری کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا نام شہزادہ سلیم رکھا گیا۔ باپ شہنشاہ اکبر نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ تاہم حصول اقتدار کی بے تابی میں اس نے ۱۵۹۹ء میں بغاوت کر دی جب اکبر دکن میں مصروف تھا۔ اکبر نے اپنے بستر مرگ پر جہانگیر کی جانشینی کی توثیق کی۔ جہانگیر نے اپنے والد کی روایات برقرار رکھتے ہوئے میواڑ ے کے خلاف جنگ کی جو ۱۶۱۴ء میں فیاضانہ شرائط پر ختم ہوئی۔ احمد نگر کے خلاف مہمات بھی جاری رہیں۔ ۱۶۱۷اور ۱۶۲۱ میں شہزادہ خرم (مستقبل کا شاہ جہاں) نے بدیہی طور فاتحانہ امن معاہدے کئے۔ اپنے باپ کی طرح جہانگیر بھی کٹر سنی مسلمان نہیں تھا مثلاً اس نے عیسائیوں کو مسلم علماء کے ساتھ سرِ عام مناظرہ کرنے اور لوگوں کو اپنے پیروکار بنانے کی اجازت دی ۱۶۱۱ء کے بعد جہانگیر نے اپنی فارسی بیوی مہر النساء (نور جہاں)، سسر اعتماد الدولہ اور سالے آصف خان کا اثر قبول کیا۔ نیز اس نے شہزادہ خرم کے ساتھ مل کر ۱۶۲۲ تک سیاست پر غلبہ پائے رکھا۔ جہانگیر کے آخری سال نور جہاں اور شہزادہ خرم کے درمیان لڑائی سے عبارت رہے۔ شہزادے نے ۱۶۲۲ء اور ۱۶۲۵ء میں کھلے عام سرکشی اختیار کی۔ ۱۶۲۶ء میں کچھ عرصہ کے لیے جہانگیر نور جہاں گروپ کے ایک اور حریف مہابت خان کے زیر اثر آیا۔ جہانگیر کشمیر سے آتے ہوئے گجرات کے قریب فوت ہوا (۱۸/اکتوبر ۱۶۲۷ء) اور لاہور کے شمال میں دریائے راوی کے کنارے دفن ہوا۔ جہانگیر ایک منصف مزاج بادشاہ تھا اسی بنا پر اس دور کی انصاف پسندی کو عدل جہانگیری سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی خودنوشت سوانح حیات ''تزک جہانگیری'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر

کے مذہبی اعتقادات کے خلاف آواز بلند کی جس پر جہانگیر نے آپ کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا لیکن حضرت مجدد نے شہنشاہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا بعد میں جہانگیر نے آپ کو رہا کر دیا اور آپ کا معتقد ہو گیا۔ جہانگیر ایک اچھا بادشاہ ہی نہ تھا، ادب و شعر میں بھی خاصی دسترس رکھتا تھا اور نور جہاں سے اس کی شاعرانہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ جہانگیر شراب کا رسیا، اور حشیش کا عادی تھا۔ جہانگیر نے مغلہ ہندوستان میں فارسی ثقافت کو بڑھاوا دیا۔ وہ فطرت کا شائق، انسانی کردار کا باریک بین ادراک رکھنے والا اور آرٹسٹک ذوق کا حامل تھا اس نے فن مصوری کی بے مثال سرپرستی کی۔

بیا کہ پردہ ز داغ جگر براند ازیم
کہ آفتاب جہانگیر شد ز عریانی (کلیات فارسی، ص۳۰۶)

اصلِ مایک شررِ باختہ رنگے بودست
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم (کلیات فارسی، ص۳۰۸)

آنکس کہ بسر دار دسو اے جہانگیری
تسکین جنونش کن بانشتر چنگیزی (کلیات فارسی، ص۴۰۰)

نگردد زندگانی ختہ از کارِ جہانگیری
جہانے درگرہ بستم جہانے دیگرے پیش است (کلیات فارسی، ص۴۳۶)

بے درد جہانگیری آں قرب میسر نیست
گلشن بگر یباں کش اے و بو بگلاب اندر (کلیات فارسی، ص۶۳۱)

اُردو

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ! (کلیات اردو، ص۳۵۹)

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار (کلیات اردو، ص۴۵۱)

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری!
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری! (کلیات اردو، ص۴۵۲)

سلطان محمد فاتح

سلطان محمد فاتح ابن سلطان مراد ابن سلطان محمد اول ابن سلطان بایزید یلدرم ابن سلطان مراد اول ابن سلطان اورخان ابن ابوالملوک غازی عثمان خان بانی سلطنت ترکان عثمان ۲۶ رجب ۸۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سلطان مراد ثانی نے شروع ہی سے بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی۔ ان کی تدریس کے لیے جید علماء اور فضلاء کو کثیر تنخواہوں پر مقرر کیا۔ سلطان محمد بہت ذہین وفطین تھے علم وفن کے حصول میں بڑی دلچسپی لیتے۔ اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ انھوں نے فارسی، عربی، یونانی اور لاطینی زبانیں بھی سیکھیں۔ مذہب کے ساتھ یونانی فلسفے، مشرقی تہذیب وثقافت اور تاریخ کے موضوعات پر بھی اپنا مطالعہ جاری رکھا۔

فنونِ لطیفہ میں شعروشاعری کی طرف ان کا رجحان فطری تھا وہ آغاز سے ہی اور اساتذہ کی رہنمائی میں سخن فہمی اور شعرگوئی کے اعلیٰ ذوق کے مالک بن گئے وہ ترکی کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کا ایک دیوان آج بھی موجود ہے۔ سامانِ حرب سے دلچسپی بھی انہیں زمانہ طالب علمی سے تھی۔ جنگی ایجادات اور فوجی اصول وقواعد سمجھنے اور سیکھنے میں دلچسپی لیتے۔ ان کے والد آل عثمان ایک ممتاز فرماں رواہونے کے علاوہ ایک ممتاز مجاہد اور دور اندیش جرنیل بھی تھے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلطان محمد کو اپنے باپ سے شجاعت، عالی حوصلگی اور بلند خیالی ورثہ میں ملی تھی نیز سیاسی امور میں مہارت ایک بڑی سلطنت کی سربراہی اور جنگی منصوبہ بندی میں تربیت وتجربہ بھی انھوں نے اپنے والد سے حاصل کیے تھے۔

سلطان مراد ثانی، علاؤالدین کی وفات کے صدمے سے گوشہ نشین ہوئے تو عنان اقتدار

سلطان محمد کے سپرد کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ والد کے انتقال اور تخت نشینی سے پہلے ہی ایک بڑی سلطنت کے نظم و نسق کو نہایت عمدگی سے چلانے کا ہنر آ گیا تھا۔ عظیم تاریخی شہر قسطنطنیہ جو مشرق و مغرب کے سنگم پر آبنائے باسفورس کی مشہور خلیج شاخ زریں (گولڈن ہارن) کے کنارے آباد ہے آج کل اسے استنبول کہتے ہیں کو سلطان محمد نے ۱۴۵۳ء میں فتح کیا۔ سلطان محمد فاتح پچاس ہزار سوار، بیس ہزار پیادے اور بھاری توپیں لے کر ۱۶ اپریل ۱۴۵۳ کو قسطنطنیہ کے سامنے پہنچ گیا اور شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ فصیلوں کو منہدم کرنے کے تمام طریقے جو اس وقت رائج تھے ان سے ہٹ کر سلطان محمد فاتح نے طریقہ استعمال کیا اور یوں کامیابی ان کا مقدر بنی۔ دس ہزار سواروں کے ساتھ اندر گئے اور نماز ظہر شہر میں ادا کی اور قسطنطنیہ کی فصیل پر ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ یوں عیسائیت کی جگہ اسلام کا مایہ ناز مرکز بن گیا اور پانچ سو سال تک اسے خلافت کی تخت گاہ ہونے کا شرف حاصل رہا۔

سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی زندگی بہت سادہ تھی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت علمی و ادبی کتابیں پڑھنے اور فنون جنگ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں گزارا کرتے تھے۔ سیر و سیاحت بھی شوق تھا جب وقت ملتا سیر کے لیے نکل جاتے۔ عیش و آرام کی زندگی سے ہمیشہ دور رہتے۔ تنہائی پسند تھے۔ ان کی اولین خواہش ہوتی کی ہر طرف علم و ادب کے چشمے بہہ رہے ہوں جہاں تیغ آزمائی ہو رہی ہو اور تلواروں کی جھنکاروں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور لڑنے والوں کے پر جوش نعروں سے میدان جنگ گونج رہا ہو۔ سلطان محمد فاتح کا دور ایک مثالی دور تھا۔ یہ عہد ایک طرف فتوحات کے لیے مشہور تو دوسری طرف علم و ادب کی ترقی اور تہذیب و ثقافت کے عروج کا زمانہ تھا سلطان محمد فاتح ۳ مئی ۱۴۸۱ء اکیاون برس کی عمر میں بکوزہ انتقال کر گئے۔

مثلِ فاتح آں امیرِ صف شکن
سکہ زدھم با قلیمِ سخن

(کلیات فارسی: ص ۸۷۵)

ooo

مغربی مؤرخین، سائنس دان
فلاسفر اور شاعر

افلاطون

افلاطون ایتھنز کے ایک معزز خاندان میں میں ۴۲۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔نو جوانی میں اس کی ملاقات سقراط سے ہوئی جواس کا دوست اور راہبر بن گیا ۳۹۹ قبل مسیح میں ستر برس کی عمر میں سقراط پر بے دینی اور ایتھنز کی نوجوان نسل کو ورغلانے کے جرم میں سزائے موت ہوگئی۔ سقراط کی موت کے بعد افلاطون ایتھنز سے چلا گیا۔ پھر دس سے بارہ برس وہ مسلسل سفر میں رہا ۳۸۷ قبل مسیح کے قریب وہ ایتھنز واپس آیا اور ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جسے ''اکادمی'' کا نام دیا۔ یہ اکادمی نوسوسال تک قائم رہی۔اس کا مشہور شاگرد ارسطو تھا جو سترہ برس کی عمر میں اکادمی میں داخل ہوا۔افلاطون ۸۰ برس کی عمر میں ۳۴۷ میں فوت ہوا۔اس نے تقریباً چھتیس کتب لکھیں۔افلاطون، ارسطو کا استاد اور سقراط کا شاگرد رشید تھا۔افلاطون بنیادی طور پر شاعر تھا لیکن اس نے ڈرامے بھی لکھے اور سب سے زیادہ توجہ فلسفہ کو دی۔اس کی شہرت دوام دینے والی کتاب ''مکالمات افلاطون'' ہے۔اس میں شامل تمام مکالمات ہی عمدہ اور معیاری ہیں لیکن ان میں سے ''جمہوریہ'' (ری پبلک) کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے اس میں افلاطون نے ایک مثالی ریاست کا جامع تصور پیش کیا ہے۔اس کے مکالمات میں براہِ راست شاعری پر کوئی نہیں لکھا لیکن ان کے مختلف مکالمات کی جزئیات کو اکٹھا کیا جائے تو بحیثیت مجموعی اس نے شاعری کے حوالے سے جو تعریف کی ہے وہ کچھ یوں ہے......

> ''کیونکہ شاعر ایک روشنی اور پرواز کرنے والی پاک چیز ہے۔وہ اس وقت تک تخلیق نہیں کرتا جب تک الہامی قوت اس پر غالب نہ آجائے اور وہ اپنے حواس زائل نہ کردے اور عقل یکسر غائب نہ ہوجائے۔جب تک وہ اس عالم جذب میں نہیں آجاتا وہ بے قوت

رہتا ہے اور اپنے الہام ربانی کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔ وہ بڑے شاندار الفاظ ہوتے ہیں جن میں شاعر انسان کے عمل کو پیش کرتے ہیں لیکن یہ الفاظ اصول فن کی مدد سے ان کے اندر پیدا نہیں ہوتے۔ صرف شاعری کی دیوی ان میں الہامی قوت کا صور پھونکتی ہے۔ اس عالم جذب میں ان میں سے کوئی کیف آور، پر جوش بھجن لکھتا ہے۔ کوئی حمد یہ گیت لکھتا ہے، کوئی کورس تخلیق کرتا ہے۔ کوئی، ایک لکھتا ہے اور کوئی ''آئی امبک'' شعر لکھتا ہے۔ جو ایک صنف میں اچھا ہوتا ہے وہ دوسری صنف پر قدرت نہیں رکھتا کیونکہ شاعر فن کی مدد سے نہیں بلکہ آسمانی قوت سے نغمہ سرا ہوتا ہے۔''

افلاطون کی مثالی ریاست میں شاعر کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ شاعروں سے سخت نالاں ہے اس کا کہنا ہے کہ شاعر مثالی جمہوریہ میں خلل پیدا کریں گے۔ کیونکہ شاعر اچھا شہری بننا نہیں سکھاتے وہ اچھے اخلاق کا درس بھی نہیں دیتے۔ افلاطون کے نظریات کو آج بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ارسطو نے بھی اپنی کتاب ''بوطیقا'' میں افلاطون کے نظریات پر بحث شامل کی ہے۔ افلاطون کو شعروادب کے میدان میں کی جانے والی تنقید میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ افلاطون آج بھی اپنے نظریات کی وجہ سے زیرِ بحث ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفندانِ قدیم (کلیات فارسی، ص ۳۲)

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمت او بود را نابود گفت (کلیات فارسی، ص ۳۳)

عشق افلاطونِ علتہاے عقل
بہ شود از نشترش سوداے عقل (کلیات فارسی، ص ۶۹)

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم (کلیات فارسی، ص ۲۳۰)

تکیہ بر عقل جہاں بین فلاطوں نکنم
در کنارم دلکے شوخ و نظر بازق ہست (کلیات فارسی، ص ۴۰۸)

بر عقل فلک پیما تر کانہ شبیخوں بہ
یک ذرہ درد دل از علم فلاطوں بہ (کلیات فارسی، ص ۴۱۵)

ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستی شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکر افلاطوں! (کلیات اردو۔ص ۳۱۹)

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف! (کلیات اردو۔ص ۳۷۰)

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں (کلیات اردو۔ص ۵۱۱)

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں! (کلیات اردو۔ص ۵۵۶)

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک (کلیات اردو۔ص ۵۸۵)

ooo

اقلیدس

اقلیدس Euclid ۳۰۰ قبل مسیح، سکندریہ میں پیدا ہوا۔ یونان کا ریاضی دان جسے بابائے ریاضیات کہا جاتا ہے۔ جیومیٹری پر اس کی تصنیف کچھ عرصہ تک سکولوں کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کی تصنیف مبادی (Elements) مساحت یا علم ہندسہ کی قدیم ترین کتاب ہے، اس میں سترہ مقالات یا فصلیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر شروع کی چار فصلوں اور فصل ششم کا مطالعہ کیا جاتا ہے پہلی چار فصلوں میں علم ہندسہ سطحیہ کی تعریفات، مثلث متوازی، متوازی الاضلاع، ہندسی الجبراء، ہندسہ دوائر، کثیر الزاویا کا بیان ہے۔ فصلِ ششم میں ان نظریات اور اصولوں کو ہندسہ پر عائد کیا گیا ہے۔ اولیات بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ کہتے ہیں کہ بطلیموس کی زندگی کے بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ کہتے ہیں کہ بطلیموس اول کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم ایتھنز میں پائی۔ ریاضی کی تعلیم اکیڈمی میں حاصل کی، علمی سرگرمیوں کا مقام اسکندریہ تھا۔ ہندسہ اور اقلیدس کا مہر، اس موضوع پر اس کی تصانیف بڑی وقیع سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی مشہور کتاب Element تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جیومیٹری پر اس کی کتاب دنیا کی پہلی کتاب مانی جاتی ہے۔ Republic ایک اور اہم کتاب ہے۔

جہانِ طوسی و اقلیدس است ایں
پےء عقل زمیں فرسا بس است ایں
(کلیات فارسی، ص ۵۴۶)

OOO

حکیم آئن سٹائن

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال وسعتِ مطالعہ کی وجہ سے کائنات کے علوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ سائنس کے حوالے سے بھی ان کا مطالعہ کم نہیں تھا۔ ان کے متعدد اشعار میں برق، شعاعیں خورشید، بجلی، ایٹم، کیمیا، کائنات، چاند، سورج، کہکشائیں کے استعارے ملتے ہیں۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈ نے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اقبال نے انسان کو چاند پر جاتے تو نہ دیکھا لیکن ان کے کلام میں خلائی تسخیر کا تصور ملتا ہے۔ ایٹم کے حوالے سے اقبال کا ایک فکر انگیز شعر ملاحظہ ہو:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس تناظر میں اقبال کا سائنس دانوں سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے جن سائنس دانوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ان میں آئن سٹائن بھی شامل ہے۔

آئن سٹائن ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ آئن سٹائن شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال سے دو سال چھوٹا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم میونخ میں حاصل کی۔ پھر زیورخ میں عازمِ سفر ہوا۔ آئن سٹائن نے نیوٹن کے تصورِ کائنات کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ قوت مادہ اور

زمان ومکان ایک واحد حقیقت کا حصہ ہیں۔اس نے کئی ایک سائنسی تجربے کیے۔امریکی سائنس دان البرٹ مائیکل سن مادہ اور ایتھر کی اضافی حرکت کے متعلق تجربے کیے۔ان تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، دنیا کو جوہری توانائی سے آگاہی دینے والا سائنس دان آئن سٹائن ہے۔نیوٹن کے نظریہ کائنات کے خلاف جب آئن سٹائن نے ۱۹۰۵ء اپنا خاص نظریہ ''اضافیت'' تحریری صورت میں سامنے آیا تو علامہ اقبال نے اس کا مطالعہ کیا۔آئن سٹائن نے کہا کہ دیکھنے والے کی حرکت خواہ کچھ بھی ہو روشنی تمام اطراف میں مساوی رفتار سے سفر کرتی ہے کوئی واحد نکتہ حرکت کا صفر نہیں قرار پاسکتا کیونکہ حرکت دیکھنے والے پر منحصر ہے۔اس کے علاوہ زماں بھی اضافی ہے اور اس کا دارومدار بھی دیکھنے والے پر ہے۔اس نظریہ کی وجہ سے آئن سٹائن کو بہت شہرت ملی۔اسے زیورخ اور پراگ میں تدریسی ذمہ داریوں کی پیش کش ہوئیں۔وہ ۱۹۱۳ء میں برلن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر رہا۔اس نے اپنی علمی تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا اپنے ذہنی ارتقاء کی وجہ سے اس نے ۱۹۱۹ء میں کششِ ثقل کے دائرے پر اپنے نظریے کا اطلاق کیا۔محققین کا کہنا ہے کہ آئن سٹائن نے کچھ فلکیاتی نتائج حاصل کیے جو کہ نیوٹن کی نسبت زیادہ بہتر تھے۔آئن سٹائن نے طبیعیات کے حوالے سے بہت کام کیا اور شہرت دوام حاصل کی۔۱۹۲۱ء کو آئن سٹائن شعبہ طبیعیات کا نوبل پرائز دیا گیا۔۱۹۳۳ء میں جب جرمنی پر ہٹلر کی حکمرانی تھی تو اس نے یہودیوں کے خلاف طاقت کا استعمال کیا آئن سٹائن چونکہ یہودی تھا اس لیے اسے جرمنی چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے امریکہ آنا پڑا۔وہ پرسٹن یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتا رہا۔اس نے سائنس کے علاوہ ادب، ثقافت اور سیاست میں بھی دلچسپی لی۔آج امریکہ اپنی جوہری توانائی پر فخر کرتا ہے درحقیقت یہ کارنامہ آئن سٹائن کا ہے۔نظریہ اضافیت کی مقبولیت کی وجہ سے علامہ اقبال اس کے نظریہ سے متاثر ہوئے۔علامہ اقبال اپنے فارسی شعری مجموعہ ''پیامِ مشرق'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''تہذیب وتمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ ہیں آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔''

ایک اور سائنس دان جیمز جین نے بھی کائنات کی پُراسراریت کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی جس میں اس نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے منصب کو رد کیا۔اس قسم کے

سائنس دانوں کو اقبال خاطر میں نہ لائے۔ آئن سٹائن نے امریکی جوہری توانائی کو دنیا بھر کے لیے مثال بنا دیا۔ سائنسی دوڑ میں امریکہ کو آئن سٹائن کی وجہ سے دنیا بھر میں برتری حاصل ہے یہ عظیم سائنس دان زندگی کے آخری لمحات تک محوِ جستجو رہا۔ ذہن پر زیادہ بوجھ ڈھالنے کی وجہ سے اس کے دماغ کی شیریانیں پھٹ گئیں اور وہ ۱۹۵۵ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں بھی آئن اسٹائن کی فکر کو خراجِ عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جلوہَ می خواست مانندِ کلیم ناصبور
تاضمیرِ مستنیر اوکشود اسرار نور
از فراز آسماں تا چشم آدم یک نفس
زود پروانے کہ پرواز ش نیا ید در شعور
خلوتِ او در زغال تیرہ فام اندر مغاک
جلوتش سوزد درختے را چوخس بالائے طور
بے تغیر در طلسم چون و چند و بیش و کم
برتراز پست و بلند و دیر و زود و نزد و دور
در نہادش تا روشید و سوز و ساز و مرگ و زیست
اہرمن سوز او وز سازِ او جبریل و حور
من چہ گویم از مقام آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زردشتے ز نسلِ موسیٰ و ہارون ظہور
(کلیاتِ فارسی۔ص۳۶۹)

OOO

کاونٹ لیوٹالسٹائی

عالمی شہرت یافتہ دانش ور، صاحبِ ثروت، منفرد حکمران ٹالسٹائی آج روس کے تمام حکمرانوں سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ۴۲ بڑے کمروں پر مشتمل ایک عظیم محل میں پیدا ہوا۔ ۹ ستمبر ۱۸۲۸ء کے روس کے صوبہ ''تولا'' میں آنکھ کھولنے والا ٹالسٹائی ناز و نعم میں پروان چڑھا۔ خاندان دولت مند تھا اس لیے اس کی ابتدائی زندگی عیش و نشاط میں گزری۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۷ء تک کازان یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اس نے کچھ عرصہ فوجی تربیت میں گزارا اس دوران اس نے شاعری کی اور ناول لکھے۔ ٹالسٹائی نے فوج سے استعفیٰ دے دیا۔ ادبی اور ثقافتی تقریبات میں شرکت کی۔ اٹلی اور جرمنی کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی شادی سوفی بہرس سے ہوئی۔ ٹالسٹائی ایک تخلیق کار تھا اس کے دو ناول بہت مقبول ہوئے۔ ''اینا کیرے نینا''، ''وار اینڈ پیس''۔ اینا کیرے نینا کا مواد اسے ازدواجی زندگی سے حاصل ہوا جب کہ ''وار اینڈ پیس'' کا مفہوم اس نے نپولین کی مہم سے حاصل کیا۔ اس نے اپنی زندگی کا ورق بدلا اور محل چھوڑ کر جنگل کا رخ کیا۔ اس نے خود کو ایک عام کسان کے روپ میں ڈھال لیا اپنی متاعِ عزیز غریبوں میں تقسیم کر دی۔ جب وہ مرا تو اس کے پاس روس کا چھوٹا سکہ ''روبل'' تک نہ تھا۔ آج ٹالسٹائی اپنی خوبیوں کی وجہ سے زندہ ہے۔

ٹالسٹائی ظلم و جبر اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرتا رہا۔ اس ضمن میں اس کی کتاب ''شہزادہ مخلیو داف کی سرگزشت'' بھی منظر عام پر آئی۔ ٹالسٹائی روس کے مظلوم کسانوں کی آواز بنا۔ اس نے اپنی زندگی انجیل کے مطابق گزاری۔ اس نے غریبوں سے محبت کی۔ غربت کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کی۔ وہ امن کا داعی تھا۔ عدم تشدد کے فلسفہ کی تشہیر کرتا رہا۔ زندگی کا آخری حصہ کسانوں کے ساتھ گزارا ان کی آواز بنا۔ وہ اقبال اس شعر کی تشریح کرتا رہا۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تُو ، کھیتی بھی تُو ، باراں بھی تُو حاصل بھی تُو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا ہے تُو غارت گرِ باطل بھی تُو

ٹالسٹائی کسمپرسی کی حالت میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو روس کے ایک ریلوے اسٹیشن پر نمونیا کی حالت میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

نظم: ٹالسٹائی

بارکش اہرمن لشکری شہر یار
از پے نانِ جویں تیغ ستم بر کشید
زشت بہ چشمپس نکوست مغز نہ داند ز پوست
مردک بیگانہ دوست سینہ خویشاں درید
داروئے بیہوشی است تاج ،کلیسا ، وطن
جانِ خدا داد را خواجہ بجائے خرید

(کلیات فارسی، ص ۳۶۶)

نظم: رویائے حکیم طالسطائی

درمیانِ کوہسار ہفت مرگ
وادئ بے طائر و بے شاخ و برگ
مرگ تو اہل جہاں را زندگی است
باش ! تابینی کہ انجام تو چیست

(کلیات فارسی، ص ۶۳۹ ـ ۶۴۰)

شعر: ٹالسٹائی

عقلِ دوز و آفرید فلسفۂ خود پرست
درسِ رضامی دہی بندۂ مزدور را؟

(کلیات فارسی، ص ۳۶۷)

نیکولائی لینن

انقلاب روس کا بانی نیکولائی لینن عالمی سیاست کا ایک بہت بڑا حوالہ ہے۔ جس نے نامساعد حالات سے گزر کر روس کو دنیا کی طاقت ور ریاست بنایا۔ لینن ۲۲ / اپریل ۱۸۷۰ء کو سمبرسک میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک سکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ لینن نے ابتدائی تعلیم والد کی سرپرستی میں حاصل کی۔ لینن جب کازان یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو طالب علم لیڈر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ سخت گیر سرگرمیوں کی بنا پر اسے سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں اس کی جلاوطنی ختم ہوئی۔ لینن کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ اس نے کارل مارکس کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ آہستہ آہستہ وہ سوشل ڈیموکریٹک جماعت کا سربراہ بن گیا۔ لینن انقلابی ذہن کا حامل تھا۔ ۱۸۹۴ء تک وکالت کرتا رہا۔ شاید منفی سرگرمیوں کی بنا پر اسے ۱۹۰۰ء تک ایک بار پھر جلاوطن کیا گیا۔ پابندِ سلاسل رہا۔ جلاوطنی میں ایک کتاب ''روس میں سرمایہ داری کا ارتقاء'' تحریر کی۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک انقلابی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان میں جنگ ہوئی۔ لینن نے تین اصولوں کا پرچار کیا۔ عوام عارضی طور پر سیاسی آزادی حاصل کریں، مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کی جماعتوں میں انقلابی قوت پیدا کی جائے۔ عوام پر ظلم کرنے والوں کے خلاف قوت استعمال کی جائے۔ اس نے جلاوطنی میں ''روسی کمیونسٹ پارٹی''، یعنی بال شیوک کے لیے کام کیا۔ جب فروری ۱۹۱۷ء میں روس میں بغاوت ہوئی تو لینن کی ہموار کردہ فکری کاوشیں ثمرور ثابت ہوئیں۔ بال شیوک پارٹی نے اقتدار حاصل کر لیا۔ لینن سوویت یونین کا صدر مقرر ہوا۔ نئی حکومت ماسکو میں کام کرنے لگی۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو لینن انتقال کر گیا۔ لینن کی انقلابی کوششوں سے ادب، ثقافت اور سیاست بہت سے اثرات مرتب ہوئے۔ اُردو افسانہ، تنقید، اور تحقیق پر بھی گہرا اثر ہوا۔ ترقی پسند تحریک کو زارِ روس کی وجہ سے نئی راہیں تلاش

کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال چوں کہ عزم نو، صبح نو، جہان نو، اور طرز نو فکر رکھتے تھے۔ اس لیے وہ نیکولائی لینن کے فکر و فلسفہ سے متاثر تھے۔

نظم: لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیرانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندۂ فلزات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم ، یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

(''بال جبریل'' کلیات اردو۔ص ۳۹۸۔۴۰۰)

سر ٹامس آرنلڈ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال پر جن لوگوں نے احسانات کیے ان کا تذکرہ ان کی نثر اور شاعری میں موجود ہے۔ اقبال کو اقبال بنانے میں جہاں ان کے والدین اور مولوی میر حسن کا کلیدی کردار ہے وہاں انھیں شعور کی دولت سے مالا مال کرنے والوں میں ایک عظیم استاد سر ٹامس آرنلڈ بھی سر فہرست ہیں۔ اقبال کی شخصی عظمت کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے پوری زندگی احسان فراموشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اساتذہ کرام کے احترام کرنے کے ضمن میں ان کا ظرف بہت وسیع نظر آتا ہے۔ پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ ایک کہنہ مشق استاد تھے۔ فلسفہ ان کا مرغوب مضمون تھا۔ اقبال کی خوش قسمتی سمجھیے یا پروفیسر آرنلڈ کے لیے اعزاز کہ اقبال کو ان کی شاگردی میں آنا پڑا۔ علامہ اقبال اپنے استاد کی تعریف و توصیف میں ہمیشہ رطب اللسان رہتے۔ ''پیامِ مشرق'' ہو یا ''بانگِ درا'' آرنلڈ کا تذکرہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اقبال نے ان کے تذکرے کو یہیں تک ہی محدود نہیں کیا بل کہ بہت سے خطوط میں بھی آرنلڈ اقبال کی نوک قلم پر رہے۔ یہ عظیم الشان اور عالمی شہرت یافتہ استاد ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء کو ڈیون پورٹ (لندن) میں پیدا ہوئے۔ آرنلڈ نے ابتدائی تعلیم لندن میں ہی حاصل کی پھر سٹی آف لندن سکول میں داخلہ لیا۔ ۱۸۸۲ء کو کیمرج چلے گئے اور مشرقی علوم اور ایشیائی زبانوں کے حوالے سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں سر سید احمد خان کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے اور انھیں ایم اے او کالج کے اسٹاف میں شامل کیا گیا۔ آرنلڈ دس سال تک علی گڑھ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ پڑھانے لگے۔ ۱۸۹۸ء میں جب علامہ محمد اقبال نے فلسفہ ایم اے کی غرض سے گورنمنٹ کالج لاہور داخلہ لیا تو ان کی ملاقات سر آرنلڈ سے ہوئی۔ آرنلڈ نے اقبال

کے ہاں مخفی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا انھی کی تجویز پر اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج اور جرمنی گئے۔

پروفیسر آرنلڈ کے لندن واپس چلے جانے سے اقبال بے حد افسردہ ہوئے اور انھوں نے اپنے قابل استاد کے فراق میں ایک معروف نظم ''نالہ فراق''، لکھی جس میں ان کی قابلیت اور ان کی تعلیمی خدمات کو سراہا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال جب لندن گئے تو وہ اپنے عظیم استاد سے بھی ملتے رہے اور بہت عالمانہ مباحث میں حصہ لیتے رہے۔ سر آرنلڈ خود شاعر نہ تھے لیکن وہ اعلیٰ شعری ذوق رکھتے تھے انھوں نے علامہ محمد اقبال کو بھی شاعری جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ سر عبدالقادر نے بھی بانگِ درا کے دیباچہ میں سر آرنلڈ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لندن میں قیام کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ اقبال شاعری کو ترک کرنے والے تھے مگر ان کے استاد آرنلڈ نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ تم اپنی شاعری جاری رکھو۔ اقبال نے اپنے استاد کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھتے ہوئے شاعری جاری رکھی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی بڑی زبانوں میں اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں۔ شاید ہی کسی شاعر کو اتنی عزت و احترام نصیب ہوا ہو۔

۱۹۲۰ء میں آرنلڈ انڈیا آفس لائبریری کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لندن یونیورسٹی میں مشرقی زبان کے شعبہ میں عربی کے استاد رہے۔ ۱۹۳۰ء میں سر آرنلڈ نے قاہرہ اور استنبول کے اسفار کیے اور وہاں توسیعی لیکچر دیے۔ لندن واپسی پر وہ عارضہ ہضم میں مبتلا ہوئے اور ۹ جون ۱۹۳۰ء کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے وفات پائی۔ ان کی بہت سی تصانیف مقبول ہوئیں لیکن جو شہرت اور عزت انھیں ''پریچنگ آف اسلام'' کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آئی۔ انھوں نے اسلام پر اعتراضات کرنے والوں کو مدلل اور بڑے ٹھوس حقائق کے ساتھ جوابات دے کر اسلام کا دفاع کیا۔ آرنلڈ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اقبالیاتی ادب میں وہ ہمیشہ زندہ و سلامت رہیں گے۔

نظم ...... نالۂ فراق

(آرنلڈ کی یاد میں)

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقین

ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں
تازہ آغوش و داغش داغ حیرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است

کشتۂ غرلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یاد ایام سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہر تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے درو دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے
ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آہ کیا جانے کوئی میں سے کیا ہونے کو تھا
ابر رحمت دامن از گلزارمن برچید ورفت
اند کے برغنچہ ہائے آرزو بارید ورفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
شور لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاک مجنوں راغبار خاطرِ صحرا کند

کھول دیگا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدہ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقدیر
تاب گویائی نہیں رکھتا، دہن تصویر کا

ooo

آگسٹس کومٹ

عیسائی فلسفی، انھیں انگریزی سینٹ آگسٹین اور لاطینی زبان میں آریلیئس آگسٹینس کومٹ کہا اور لکھا جاتا ہے۔ وہ شمالی افریقہ میں پیدا ہوئے ان کی والدہ عیسائی اور والد کافر تھا۔ انھوں نے لاطینی ادب کی تعلیم حاصل کی اور پھر روم اور کارتھیج میں فن بلاغت اور میلان میں مانیچی فلسفہ پڑھاتے رہے۔ انھیں میلان کے بشپ سینٹ امبروز سے دوستی کے طفیل نوفلاطونیت میں دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوگئے۔ سینٹ امبروز نے انھیں ۳۸۷ کو ایسٹر کے موقع پر بپتسما دیا اور پھر وہ افریقہ واپس چلے آئے جہاں انھوں نے خلوت اختیار کر کے مذہبی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انھیں ۳۹۱ میں پادری اور اس کے چار برس بعد ہپو کا بشپ بنا دیا گیا اگرچہ وہ اپنے علاقے سے بہت کم باہر جاتے تھے لیکن ان کا اثر ان کے مکتوبات کی وجہ سے بہت جلد ساری عیسائی دنیا میں پھیل گیا ان میں ۲۵۰ خطوط اب بھی موجود ہیں۔ اپنے وعظوں کی طرح ان مکتوبات میں بھی آگسٹس اپنے دور میں مروّج مانوی، پلیجی اور دوناتی عقیدوں کے مقابلے میں عیسائیت کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان مکتوبات میں ہمیں ان کا نظریہ تقدیر اور رحمت ایزدی بھی نمویاتا دکھائی دیتا ہے جو بعد ازاں رومن کیتھولک مسلک اور جان کیلون، مارٹن لوتھر اور جینسن پسندوں کی تعلیمات میں بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ اگسٹس اپنی خودنوشت سوانح عمری ''اعترافات'' کے لیے بھی بہت جانے جاتے ہیں۔ اس تحریر میں انھوں نے اپنے عیسائیت قبول کرنے کا حال بیان کیا ہے اور اس سے پہلے کی زندگی پر تاسف و ملال کا اظہار کیا ہے جس کے دوران وہ بعض حسیناؤں کے دام زلف میں بھی گرفتار رہے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف ''شہرِ یزداں'' ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ عیسائیت

کس طرح ایک نئے سماجی نظام کا ماڈل فراہم کرسکتی ہے بعد میں انھوں ایک کتاب ''تردیدات'' بھی لکھی جس میں انھوں نے قبل کے اپنے بعض نظریات میں تبدیلی و ترمیم کی اگسٹس ۴۳۰ھ میں ہپو پر کیٹروں کے حملے میں مارے گئے لیکن ان کا نام اور کام عیسائیت کی دینیاتی نشو ونما میں آج بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

نظم: محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ مردِ مزدور حکیم

''بنی آدمی اعضائے یک دیگر اند''
ہماں نخل را شاخ و برگ و براند
دماغ ار خردز است از فطرت است
اگر پاز میں ساست، از فطرت است
یکے کار فرما ، یکے کار ساز
نیا ید ز محمود کارِ ایاز
نہ بینی کہ از قسمت کارِ زیست
سراپا چمن می شود خارِ زیست

(کلیات فارسی، ص ۳۷۴)

○○○

المانی / نٹشے

المانی ۔ جرمنی کا رہنے والا مراد نٹشے ۔۔۔ نٹشے ۱۹۰۰ کو پروشیا، جرمنی میں پیدا ہوئے ۔ معروف شاعر، فلسفی اور ماہر لسانیات کے حوالے سے انیسویں صدی میں عالمی شہرت پر خوب شہرت پائی ۔ ان کا شمار سب سے زیادہ با اثر اور اشتعال انگیز مفکّرین میں ہوتا تھا ۔ ان کے والد لوتھری منسٹر بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئے ۔ نٹشے کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کی ۔ ان کی نانی، دو خالائیں اور ایک بہن بھی تھی ۔ ان کے دادا نے بھی پروٹسٹنٹ ازم کے دفاع میں کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ ایک غیر سرکاری سکول میں داخلہ لیا ۔ ۱۸۶۴ء میں گریجوایشن کرنے کے بعد وہ الٰہیات اور کلاسیکی علم اللسان کا مطالعہ کرنے کی غرض سے بون یونی ورسٹی چلے گئے جہاں وہ کچھ زیادہ نہ سیکھ پائے ۔ پھر موسیقی کی طرف راغب ہوئے اور کئی دھنیں ترتیب دیں ۔ ۱۸۶۵ء میں وہ لیپنترگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے انھوں نے اکتوبر ۱۹۶۷ء میں آرٹلری رجمنٹ کی کیولری کمپنی میں ملازمت شروع کی ۔ مارچ ۱۸۶۸ء میں چھاتی پر شدید چوٹ کی وجہ سے چھٹی پر واپس لیپنرگ آ گئے ۔ انھوں نے ارتھر شوپنہار کے فلسفہ کو سمجھنا شروع کیا اور اوپیرا کے عظیم موسیقار رچرڈ ویگز سے ملا ۔ ۱۸۶۹ء میں Basel میں کلاسیکی علم اللسان کی پروفیسر شپ کی اسامی نٹشے کو مل گئی ۔ ۱۸۷۰ میں ان کی صحت خراب رہنے لگی ۔ ان کی پہلی کتاب The Birth of Tragedy from the Spitit of Music (۱۸۷۲ء) ۔ اس کتاب کو آج بھی جمالیات کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے ۔ ۱۸۷۹ء میں ان کی دوسری کتاب "Human All-Too- Human" منظر عام پر آئی ۔ خرابی صحت کے باعث وہ ملازمت زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکے اور درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر دیا ۔ ۱۸۸۹ء درمیانی

عرصہ میں سخت بیمار اور نیم نابینا اور تنہا ہو کر رہ گئے۔ نٹشے کا عظیم ادبی کارنامہ ''زرتشت نے کہا'' ۱۸۸۳ء میں منظرعام پر آیا پھر اس کے چار حصے مزید ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کو کوئی زیادہ مقبولیت نہ مل سکی۔ ۱۹۰۰ء میں وفات پائی وفات کے بعد اس کی بہن ایلزبتھ نے فارسٹر سے شادی کی اور ۱۸۸۹ء میں شوہر کی خودکشی کے بعد وہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ نٹشے کو فارسٹر کے نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی اس نے نٹشے کی تحریروں میں کئی طرح کے ترامیم واضافے کر کے ناقدین کو مسائل میں ڈالے رکھا۔

ان کی کتاب ''زرتشت نے کہا'' کے حوالے سے سگمنڈ فرائیڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ماضی اور مستقبل کے کسی بھی انسان کی نسبت نٹشے اپنی ذات کی کہیں زیادہ گہری تفہیم رکھتا تھا۔ ناول نگاروں میں ٹامس مان، ہرمن ہیس، آندرے مالراکس، آندرے ژیداور جان گارڈنز نے اس سے تحریک پائی۔ شاعروں میں سے برناڈشا، سٹیفن جارج اور ولیم بٹلر اس کے مداح تھے۔

نٹشے کو اخلاقیات اور مذہب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ بیس صدی کی فلسفہ، الٰہیات اور نفسیات کا نٹشے کے بغیر تصور کرنا بھی محال ہے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے بھی نٹشے کو اپنی شاعری میں زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی (کلیات اردو۔ص ۲۷۱)

دیکھ چکا المانی ، شورشِ اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں (کلیات اردو۔ص ۳۹۱)

○○○

بائرن گورڈن

بائرن جارج گورڈن ۱۷۸۸ء کو لندن میں پیدا ہوا۔ بائرن انگریزی زبان و ادب کا معروف رومانوی شاعری ہے وہ اپنے دور میں نہایت مشہور اور دلوں پر راج کرنے والا شاعر تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ اور حسینائیں گھنٹوں انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ بائرن کا والد کیپٹن جان خاصے دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بائرن کی ماں اسے اپنے ساتھ سکاٹ لینڈ لے گئی۔ بائرن کا باپ خاندانی دولت کو عیش و عشرت میں اڑاتا رہا ۱۷۹۱ء میں فوت ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں بائرن پبلک سکول Harrow میں داخل ہوا جہاں اسے لڑکے چھیڑتے کیونکہ بائرن کے پاؤں پولیو کے شکار ہو گئے تھے اور اسے چلنے میں دقت ہوتی تھی اس کے باوجود وہ سکول میں بہت مقبول رہا۔ وہ سکول کی چھٹیاں نوٹنگھم کے قریب ساؤتھ ویل گزارتا اور وہاں اپنی بڑی کزن میری چاورتھ کے ساتھ محبت کرنے لگا حالانکہ اس کی منگنی کہیں اور ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں بائرن ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخل ہوا تو وہاں ایک لڑکے ایڈلسٹن کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ بائرن کی کچھ ابتدائی نظموں میں اس لڑکے کا تذکرہ میں ملتا ہے۔ اس کی نظموں کے پہلے مجموعہ ''Hours of Idleness'' (۱۸۰۷ء) میں یہ نظمیں بھی شامل تھیں۔ ۱۸۰۸ء کا سال لندن میں نفسانی مسرتوں سے حظ اٹھاتے ہوئے گزرا جو اس کی صحت کے لیے خطرہ بن گئیں۔ ۱۸۰۹ء میں ٹرینٹی کالج کے ایک دوست جان کیم باب ہاؤس کے ساتھ مل کر بائرن نے پرتگال، سپین، البانیہ، یونان اور قسطنطنیہ کا ایک طویل اور زندگی کو بدل دینے والا سفر شروع کیا۔ بحیرہ عرب کے مناظر، وہاں کے لوگوں اور ان کے اندازِ حیات نے اس کا دل موہ لیا۔ ۱۸۱۱ء میں بائرن کو ایڈلسٹن کی موت کی خبر نے اسے بہت پریشان کر دیا۔ بائرن گورڈن

کو شہرت دوام بخشنے والی کتاب Childe Harold's Pilgrimage ہے۔ لیڈی کیرولین لیمب کے ساتھ بھی روابط رکھے۔ لیڈی آکسفورڈ کے ساتھ بھی تعلقات قائم ہوئے اس نے اس کی انقلابی سیاسی رجحانات کی خوب پذیرائی کی۔ ۱۸۱۵ء میں بائرن گورڈن ایک خاتون انا بیلا کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ یہ شادی اس لیے قائم نہ رہ سکی کہ بائرن کے معاشقوں کے بارے میں انا بیلا جاننے لگی تھی وہ ایک سال بعد ہی اسے چھوڑ گئی۔ بائرن پر کئی طرح کے سیکنڈل سامنے آنے لگے جن سے دل برداشتہ ہوکر وہ انگلینڈ سے سوئٹزرلینڈ چلا گیا اس کے بعد وہ کبھی انگلینڈ نہ گیا۔ سوئٹزرلینڈ جنیوا جھیل کے کنارے اس کی ملاقات پی بی شیلے اور اس کی بیوی میری وولسٹون کرافٹ سے ہوئی۔ میری کی سوتیلی بہن کلیئر کلیئرمونٹ کے ساتھ بھی اس کا معاشقہ چلا۔ اس معاشقے کے دوران وہ ''Childe Harold's Pilgrimage'' کا تیسرا کینٹو مکمل اور ''Manfred'' شروع کرنے کے قابل بھی ہوا۔ ۱۸۱۶ء کے موسم خزاں میں بائرن باب ہاؤس کے ہمراہ وینس گیا جہاں اس کی ذات میں چھپا ہوا ایک رومانوی شاعر ظاہر ہوا اور اس نے جنسی بے راہ روی کا راستہ اختیار کیا اور خواتین اپنے دام محبت میں گرفتار کیا۔ بائرن خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس تھا اس کی ایک گھٹیا عادت یہ بھی تھی کہ اس نے اپنی محبوباؤں کی فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ بائرن اسی دوران Don Juan لکھنا شروع کیا۔

۱۸۱۹ء میں ایک بیس سالہ کاؤنٹس ٹریسا کی شادی ایک ۶۰ سالہ مرد سے ہونے والی تھی کہ بائرن نے اس شادی کو رکوا کر ٹریسا سے محبت کرنے لگا اور وہ دونوں راوینا میں رہنے لگے۔ اس دوران اس نے پی بی شیلے کی صحبت اختیار کر لی۔ ۱۸۲۳ء کو لندن گریک کمیٹی کی طرف سے یونان چلا گیا جہاں یونان اور ترکوں کی جنگ جاری تھی۔ وہ آیونیائی جزیرے سیفالونیا پہنچا۔ ترکوں کے خلاف یونانی حملہ ہونے سے پہلے ہی بائرن بخار میں مبتلا ہوا اور ۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو فوت ہو گیا۔

انگریزی ادب کا یہ لیجنڈ آج بھی اپنی بے مثالی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے۔

علامہ محمد اقبال نے بھی بائرن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک نظم لکھی جو ملاحظہ ہو:

نظم: بائرن

مثالِ لالہ و گل شعلہ از زمیں روید
اگر بہ خاکِ گلستاں ترا وِد از جانش

نبود در خورِ طبعش ہوائے سرد فرنگ
تپید پیک محبت ، زسوز پیغامش

خیال اوچہ پر یخانۂ بنا کر داست
شباب غش کندا ز جلوۂ لب بامش

گذاشت طائرِ معنی نشیمنِ خود را
کہ ساز گار تر افتاد حلقۂ دامش

(کلیات فارسی، ص ۳۷۰)

ooo

بیکن،فرانس

بیکن فرانس انگلش فلسفی اور ممتاز ادیب تھے۔ بیکن ۱۵۶۱ءکولندن میں پارک ہاؤس کے مقام پر پیدا ہوئے۔اور ٹرینٹی کالج،کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پائی ۱۵۸۴ءمیں ہاؤس آف کامنز کے لیے منتخب ہوئے اور ۱۶۱۴ءتک خدمات انجام دیتے رہے۔بیکن نے ملکہ ایلزبتھ کومشاورتی خطوط لکھے مگر ان کے مشوروں پر کبھی عمل درآمد نہ ہوا۔۱۵۹۳ءمیں وہ شاہی سبسڈی کے لیے ایک بل کی مخالفت کرنے کے باعث ملکہ کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں سے مکمل طور پر خارج کر دیا گیا۔تاہم،۱۶۰۳ء میں جب جیمز اول برسر اقتدار آیا تو فرانس بیکن کی عزت کچھ بحال ہوئی۔بیکن نے انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے اتحاد کی سکیمیں پیش کیں اور رومن کیتھولکس سے نمٹنے کے لیے اقدامات تجویز کیے۔ ان کی شبانہ روز محنتوں میں انہیں ۲۳ جنوری ۱۶۰۴ءکو نائٹ کا خطاب ملا۔اس کے بعد اسے سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کی یونین کے لیے کمشنر بنا دیا گیا اور ۱۶۰۴ء میں پنشن حاصل کی۔اس کی کتاب ''Advancement of Learning'' ۱۶۰۴میں شائع ہوئی اور بادشاہ کو پیش کی گئی۔دوسال بعد وہ Solicitor (مختار قانونی) جنرل بنا۔جیمز اول کے تحت پہلی پارلیمنٹ کے آخری اجلاس (فروری ۱۶۱۱ء) میں تاج اور ہاؤس آف کامنز کے درمیان اختلافات تشویش ناک صورت اختیار کر گئے اور بیکن نے ثالث کا کردار ادا کیا حالانکہ وہ جیمز کے وزیر اعظم رابرٹ سیسل کے بارے میں بدگمان تھا۔ ۱۶۱۳ءمیں بیکن فرانس کو اٹارنی جنرل تعینات کر دیا گیا۔۱۶۱۶ءمیں بیکن پرائیوی کونسلر بنا اور ۱۶۱۸ء میں لارڈ چانسلر تعینات ہوا۔۱۶۲۰ءمیں اس کی ''Organum Novum'' شائع ہوئی اور 26 جنوری ۱۶۲۱ءکو اسے وسکاونٹ سینٹ البانز بنا دیا گیا۔اسی سال پارلیمنٹ نے اس پر رشوت لینے کا الزام

لگایا۔ بیکن نے اقبال کرلیا۔ اسے جرمانہ ہوا اور پارلیمنٹ اور دربار سے نکال دیا گیا۔ سزا بھگتنے کے بعد Gorhambury کے مقام پر اپنی خاندانی جاگیر پر رہنے لگا۔ ۱۶۲۱ء میں بادشاہ نے اسے معافی دی مگر پارلیمنٹ یا دربار میں واپس آنے سے روک دیا۔ تب بیکن نے دوبارہ لکھنا شروع کیا ''ہسٹری آف ہنری vII'' اور ''دی ایڈوانسمنٹ آف لرننگ'' (ترجمہ) مکمل کی۔ مارچ ۱۶۲۲ء میں اس نے قوانین کا ایک ضابطہ تشکیل دینے کی پیش کش کی مگر جیمز اول اور چارلس اول نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ۹/اپریل ۱۶۲۶ کو مر گیا بیکن کی تصانیف کے تین زمرے ہیں۔ فلسفیانہ، خالصتاً ادبی اور پروفیشنل، بہترین فلسفیانہ تحریریں، ''دی ایڈوانسمنٹ آف لرننگ'' (۱۶۰۵ء) اور The Interpretation of Nature Indications Respecting (۱۶۲۰ء) ہیں بیکن کا فلسفہ اس یقین پر زور دیتا ہے کہ لوگ فطرت کے خادم اور مفسر ہیں کہ اتھارٹی صداقت کا ماخذ نہیں، کہ علم تجربے کا ماحصل ہے۔ بیکن فرانسس ۱۶۲۶ء کو فانی ہو گیا۔

زمانے با ارسطو آشنا باش
دمے باساز بیکن ہم نوا باش
(کلیات فارسی، ص ۵۴۸)

ooo

پٹوفی، سانڈر

پٹوفی سانڈر ۱۸۲۳ء کو پیسٹ کاؤنٹی میں Kiskoros کے مقام پر پیدا ہوا۔ اصل نام سانڈور پیٹرورکس۔ ہنگریائی شاعر کے طور پر معروف ہوئے۔ پہلے اداکار کی حیثیت سے اور پھر سپاہی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ پہلی نظم ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی اور پھر ۱۸۴۴ء میں شاعری کے ایک مجموعے کے ذریعے بطور شاعر شہرت ملی۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے ہنگریائی انقلابی نصب العین اپنایا، متعدد عوامی جنگی نظمیں لکھیں جن میں ''Rise Magyar'' (۱۸۴۸ء) بھی شامل تھی۔ جو ہنگری کا قومی ترانہ بنی۔ وہ لڑائی کے دوران مارا گیا۔ محبت اور وطن پرستی کے موضوعات پر مبنی اس کی شاعری نے ہنگریائی ادب میں ایک نئے انداز کا آغاز کیا۔ ہنگری میں کسان کی زندگی کے متعلق اس کی طویل داستان ''Janos the Hero'' (۱۸۴۵ء) کو بہترین شمار کیا جاتا ہے۔

نظم: پٹوفی

نفسے دریں گلستاں ز عروس گل سرودی
بہ دلے غمے فزودی، زدلے غمے ربودی
تو بخون خویش بستی کف لالہ را نگارے
تو بآہ صبحگاہے دل غنچہ را کشودی
بنو اے خود گم استی سخن تو، مرقدِ تو
بہ زمیں نہ بازرفتی کہ تو از زمیں نہ بودی

(کلیاتِ فارسی، ص ۳۷۳)

ہیگل، جارج ولہیلم فریڈرک

جرمن کے معروف فلسفی ہیگل سٹڈگارٹ میں ۱۷۷۰ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر میں اس نے دینیات، تاریخ، فلسفہ اور جرمن کلاسیکی ادب کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا۔ Tubingen کی یونیورسٹی سے وہ ایک لوتھری پادری بن کر نکلا۔ دستاویزات کے مطابق وہ ساری عمر لوتھری مذہب کا ہی پیروکار رہا لیکن اس کا نظام فکر اس کی نفی کرتا ہے۔ البتہ اس نے فلسفہ کی راہ اختیار کر لی۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اس نے رومانی فلسفی فریڈرک شیلنگ اور شاعر فریڈرک ہولڈرلن سے دوستی کی۔ ۱۷۹۳ء میں گریجوایشن کرنے پر اس کے سرٹیفکیٹ میں اعلیٰ اخلاقی رویے کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا تھا تاہم ساتھ ہی فلسفہ میں اس کے ناکافی علم کی نشاندہی بھی تھی۔ اسی چیز نے ہیگل کو ایک کامیاب فلسفی بننے پر اکسایا اور اس نے بہت جلد اپنے آپ کو دنیا کا ایک بڑا فلسفی بن کر دکھایا۔ ایسا فلسفی جس نے فلسفہ کو نئے سرے سے ایجاد کیا۔

۱۷۹۴ء تا ۱۸۰۰ء میں جینا کے ایک کالج میں فلسفہ کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۰۶ تا ۱۸۱۵ء نورمبرگ میں جیمنازیم کا ڈائریکٹر تعینات ہوا اس کے بعد ۱۸۱۶ء میں ہیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر مقرر ہوا۔ بعد ازاں جرمن فلسفی نطشے کی وفات کے بعد اس کی جگہ برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر مقرر کیا گیا ہیگل نے جینا میں اپنے مقام کے دوران سیلنگ کے اشتراک سے رسالہ در تنقید اور جدلیات پر متعدد مقالے اور کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۳۲ء میں چند طالب علموں نے مل کر اس کی تمام تصنیفات انیس جلدوں میں شائع کرائیں۔

جارج ولہیلم فریڈرک ہیگل نے ۱۸۰۱ء میں ''روح کی مظہریات'' ایسی کتاب لکھی۔ ہیگل

نے روح کے لیے Geist کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کا مطلب ذہن اور روح دونوں ہے۔ آج تک اسی وجہ الجھنیں بنی رہی ہیں کہ ہیگل نے اس لفظ سے روح مراد لیا ہے یا کہ ذہن؟

ہیگل ۱۸۱۸ء سے لے کر ۱۸۳۱ء تک ہیضہ کی وبا پھیلنے پر اپنی موت تک برلن یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہیگل نے اپنی زندگی میں خاص طور پر چار ایسی کتب لکھیں جنھوں نے اسے شہرتِ دوام بخشی ان میں ''مظہریات''، ''منطق''''انسائیکلو پیڈیا''اور''راستی کا فلسفہ'' شامل ہیں۔ ہیگل کے مسودات اور لیکچرز کے نوٹس میں موجود مواد فکری مسائل سے بھرپور ہے اس کے نقاد ہمیشہ باہم برسر پیکار رہے۔ اس کی تمام تحریریں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جن کے زیادہ تر حصے نے کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑا...... بالخصوص روح/ ذہن کے معاملے میں۔۔۔ برلن میں قیام کے دوران ہیگل کی شہرت بام عروج پر تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو سب سے بلند درجے پر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تکبر اور غرور کچھ حد تک اس کے فلسفے کا بھی حصہ ہے۔

ہیگل نے ۱۸۱۶ء میں شادی کی اور دو بچوں کا باپ بنا۔ اس کا ایک بیٹا کارل مؤرخ بنا۔ ہیگل نے جدلیت کا نظریہ پیش کیا، کہا جاتا ہے کہ اس کے فلسفے میں مغز فکر بہت کم ہے۔ جدلیاتی مادیت کے علاوہ اور بھی کئی حوالوں سے ہیگل نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ فلسفے پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ شروع میں برٹرینڈ رسل بھی ایک ہیگلی مفکر تھا۔ نام نہاد پرانے ہیگلی پروٹسٹنٹ ازم پر زور دینے کے لیے ہیگل کو استعمال کرتے تھے۔ نوجوان یا بائیں بازو کے ہیگلیوں (جن میں مارکس بھی شامل تھا) نے اس کے فلسفے کی مدد سے دنیا کو بدلنے کی کوشش کی۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے بھی اس کا ذکر اپنے شعروں میں کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی! (کلیات اردو، ص ۴۸۰)

جلوہ دہد باغ وراغ معنیٔ مستور را
عین حقیقت نگر حنظل و انگور را
فطرتِ اضداد خیز لذتِ پیکار دا
خواجہ و مزدور را آمر و مامور را (کلیات فارسی، ص ۳۶۷)

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی! (کلیاتِ فارسی، ص ۴۸۰)

نظم۔ جلال و ہیگل

می کشودم شبے بناخن فکر
عقدہ ہائے حکیم المانی
آنکہ اندیشہ اش برہنہ نمود
ابدی راز کسوت آنی
پیش عرض خیال اوگیتی
خجل آمد ز تنگ دامانی
چوں بدریائے او فرورفتم
کشتی عقل گشت طوفانی
خواب برمن دمید افسونے
چشم بستم زباقی و فانی
نگہِ شوق تیز تر گردید
چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجلی او
افق روم و شام نورانی
شعلہ اش درجہان تیرہ نہاد
بہ بیاباں چراغ رہبانی
معنی از حرف اوہمی روید
صفت لالہ ہائے نعمانی
گفت بامن، چہ خفتہ برخیز
بہ سرا بے سفینہ می رانی

"بہ خرد راہ عشق می پوئی
بہ چراغ آفتاب می جوئی"

(کلیات فارسی، ص ۳۷۲)

ہیگل

حکمتش معقول و با محسوس در خلوت نرفت
گرچہ بکر فکر او پیرایہ پوشد چوں عروس
طائر عقل فلک پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کز زور مستی خایہ گیرد بے خروس

(کلیات فارسی، ص ۳۷۵)

○○○

سپنوزا

سپنوزا یہ ایک دلندیزی فلسفی تھے ۱۶۲۳ میں پیدا ہوئے۔ سپنوزا سقراط سے بہت متاثر تھے۔ وہ آزادی ضمیر اور رائے کا بڑا حامی تھا، تاہم اقبال سپنوزا کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے سپنوزا کی کتاب ''اخلاق'' موجودہ فلسفہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سپنوزا کے آباؤاجداد یہودیوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور پرتگالی در مادکرن (1536)، جس وبیرین جزیرہ نما سے جبری تبادلوں اور اخراج کے نتیجے میں تھا کے تناظر میں ایمسٹرڈیم کے شہر میں آباد تھا کہ پرتگالی یہودیوں کی کمیونٹی کا ایک حصہ تھے۔ اٹریچ کی یونین کی طرف سے 1579 میں جاری کیا کہ برداشت کے حکم نامے کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کیا، کیتھولک پرتگالی بدلتا پہلے 1593 میں ایمسٹرڈیم پر سفر کیا اور فوری طور پر یہودیت کو ایک کنیسہ عطا کرنے کی اجازت 1598 میں دی گئی۔، اور 1615 میں یہودیوں کا داخلہ اور حکومت کے لیے ایک آرڈیننس منظور کیا گیا تھا کی تعمیر کرنا تھا۔ جلاوطنی کے ایک کمیونٹی کے طور پر، ایمسٹرڈیم کے پرتگالی یہودیوں کو اپنی شناخت پر فخر ہے۔

Spinoza کے والد Alentejo میں Beja قریب Vidigueira کے چھوٹے پُرتگالی شہر میں جبری تبدیلی کے بعد ایک صدی کے تقریباً پیدا ہوا تھا Spinoza کے والد میگوئل (مائیکل) اب بھی ایک بچہ تھا جب، Spinoza کے دادا، اسحاق ڈی Spinoza، لزبن سے کیا گیا تھا، فرانس میں نانت اپنے خاندان اُٹھایا۔ انہوں نے 1615 میں نکال دیا گیا اور راٹرڈیم میں منتقل کیا گیا، اسحاق وہ یہودیت کے پریکٹس کہاں دوبارہ شروع Spinoza کے والد اور چچا مینوئل پھر ایمسٹرڈیم میں منتقل کر دیا جہاں 1627 میں انتقال کر گئے Miguel . میں ایک کامیاب تاجر تھے اور عبادت خانہ کے اور

ایمسٹرڈیم کے یہودی اسکول کے ایک وارڈن بن گئے۔Spinoza کے والد مائیکل، 1654 میں انتقال کر گئے اس وقت سپنوزا کی عمر ۲۱ سال تھی۔

سپنوزا نے ایک ظاہری سادہ زندگی گزاری خوردبین اور دوربین لینس ڈیزائن اور کرسٹین Constantijn Huygens کے ساتھ تعاون کیا۔اس نے تدریسی فرائض کی ادائیگی میں زندگی بھر بہت سے انعامات واعزازات حاصل کیے۔۔وہ ایک پھیپھڑوں کی بیماری، تپ دق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ بالآخر 1677 میں 44 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔وہ چرچ میں عیسائی نائیوی کیک میں ہیگ میں دفن کیے گئے۔

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور وسرور ونور و وجود!

(کلیات اردو، ص ۵۳۰)

ooo

شوپنہاور، آرتھر

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا جرمنی سے قلبی تعلق رہا۔ انھوں نے نہ صرف میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کی بل کہ جرمن زبان میں سیکھ کر جرمن علوم وفنون سے واقفیت حاصل کی۔ اقبال کی شخصی عظمت سے متاثر ہوکر ان کے استاد ویگنا سٹ ان پر فریفتہ بھی ہوگئی۔ جرمن کے متعدد شاعروں ،ادیبوں اور دانش وروں کے تذکرے کے ساتھ ڈاکٹر علامہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے کے علاوہ اپنے اشعار میں بھی جرمن کے دانش وروں کا ذکر کیا ہے۔ آرتھر شوپنہار بھی ان شخصیات میں شامل ہیں جن کا اقبال کے ہاں ذکر موجود ہے۔

شوپنہار ۱۷۸۸ءکو ہائزخ کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کو بنکنگ اور ٹریڈنگ کے سلسلے میں انگلینڈ سے وہاں جانا پڑا تھا۔ شوپنہار کی والدہ ایک ناول نگار تھیں۔ ۱۸۰۶ء کے بعد وہ ایک سیلون چلانے لگی جہاں گوئٹے بھی کئی بار گیا۔ ۳۲۔۱۸۳۱ء میں جب اس کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا تو وہ ۲۴ جلدوں پر محیط تھا۔ شوپنہار ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۳۸ء میں اپنی وفات تک بھی اس سے نہ ملا۔ ۱۷۹۳ء میں Danzig کی بندرگاہ کا پروشیاؤں کے ساتھ الحاق ہوگیا اور ہائزخ کو ہیمبرگ ہجرت کر کے جانا پڑا۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کی اس کا بیٹا تجارت کا پیشہ اختیار کرے شوپنہار نے اسی غرض سے دوسال پیرس میں گزارے چند ماہ لندن کے قریب دمبلڈن میں بھی بسر کیے شوپنہار نے اپنے باپ کی وفات کے بعد ایک تاجر کے پاس اپرنٹس کی نوکری بڑی ایمانداری کے ساتھ جاری رکھی۔ بعد میں ان کی والدہ نے انہیں گوٹنجن یونیورسٹی میں داخل ہونے کو کہا جہاں انھوں نے پہلے طب کا مطالعہ کیا پھر فلسفہ کا مضمون اختیار کیا۔ شوپنہار نے برلن میں The Fourfold Root of the Principle of Sufficent Reason

۱۸۸۳ء پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ان کی کتاب The world as Will and Idea کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا تو اسے زیادہ پذیرائی نہ ملی البتہ اسے برلن میں اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی۔شوپنہار نے ۱۸۲۰ء میں ہیگل کے مقابلے پر لیکچر دینے شروع کیے۔۱۸۳۱ء میں ہیگل ہیضہ کی وبا میں مرگیا۔شوپنہار کی کہاوتی انداز کا مجموعہ Comments and Omission جو ۱۸۵۱ء میں منظر عام پر آیا تو اس نے انہیں شہرت دوام عطا کی۔گوئٹے نے شوپنہار کو ہندوستانی فلسفے اور پھر رومانوی نقاد ایف ڈبلیو Schlegel سے بھی متعارف کروایا۔اس نے اپنشدوں کا ایک ناکافی مگر مددگار ترجمہ بھی پڑھا۔ہندومت اور بدھ مت نے شوپنہار کے فلسفے کو بہت حد تک متاثر کیا کیونکہ وہ انفرادی ارادے کو ساری کائنات کے ارادے کا ایک جزو سمجھتا تھا۔بدھ مت کی طرح وہ بھی ایک ''ملحد'' تھا۔مزید کچھ بھی نہیں۔آرٹ اور موسیقی راحت دیتے ہیں، لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔شوپنہار دوسروں کے لیے ہمدردی کے جذبات سے عاری تھا۔لیکن یہ بات درست نہیں۔شوپنہار زندگی کے آخری عشرے میں خاصا مقبول ہو چکا تھا۔یاسر جواد نے لکھا ہے:

''کسی بھی شائستہ قنوطیت پسند کی طرح اس نے بھی ایک مزے کی زندگی گزاری، اچھا کھایا پیا، دوسروں کو خوش رکھا اور جنسی اشتہا کی تسکین کی۔اور یقیناً وہ بے قدری کی پریشانیوں اور احساسات کا بھی شکار تھا یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے کتوں کے سوا کسی سے بھی ٹوٹ کر محبت نہ کرسکا۔شوپنہار کا فلسفیانہ قضیہ کانٹ سے مستعار لیا ہوا ہے۔''

شوپنہار ۱۸۶۰ء کو انتقال کر گئے۔شوپنہار اپنے نظریات وتصورات کی وجہ سے آج بھی ہمارے تذکروں میں موجود ہیں۔اقبال نے بھی ان کے فلسفہ کی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔اقبال کا بڑا پن ہے کہ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کو عزت دی ہے۔

نظم: شوپن ہار و نیٹشا

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید
خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بد گفت فطرت چمن روزگار را
از درد خویش وہم زغم دیگراں تپید

داغے زخون بیگنہے لالہ راشمرو
اندر طلسم غنچہ فریب بہار دید
گفت اندریں سرا کہ بنا لیش فتادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ درو شامہانہ چید
نالید تابجو صلہ آں نوا طراز
خوں گشت نغمہ و زدو چشمش فرو چکید
سوز فغانِ او بہ دل ہدہدے گرفت
بانوک خویش خار زاندام او کشید
گفتش کہ سود خویش زجیب زیاں برآر
گل از شگاف سینہ زرناب آفرید
درماں ز درد ساز اگرخستہ تن شوی
خوگر بہ خار شوکہ سراپا چمن شوی

(کلیات فارسی،ص۳۶۴۔۳۶۵)

ooo

مسولینی

مسولینی ۱۸۸۳ء میں اٹلی میں پیدا ہوا۔اس کا باپ لوہار اور ماں درس وتدریس سے وابستہ تھی ۔۱۹ سال کی عمر میں وہ سوئیٹز رلینڈ چلا گیا۔ جہاں مسولینی نے بڑے نامساعد حالات کا سامنا کیا۔ بعد میں اسے ٹریڈ یونین میں جگہ مل گئی جس نے اسے انقلابی بنا دیا۔ کچھ مدت کے بعد وہ واپس اٹلی آ گیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ سوشلسٹ ہو گیا اور اس نے ایک اخبار کا اجراء بھی کیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں مسولینی نے ایک رضا کار کی حیثیت سے شرکت کی جس میں وہ زخمی ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں سیاہ پوش تحریک کا آغاز کیا۔ جنگ کے بعد اٹلی میں بڑی بدنظمی پھیل گئی۔ مسولینی نے فسطائی تحریک شروع کر کے بڑی مقبولیت حاصل کر لی ۔۱۹۲۲ء میں فسطائیوں نے روم کی طرف یلغار کی اور شاہ وکٹر ایمانیول نے مسولینی کو وزارت بنانے کے لیے کہا۔ ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا۔ لیگ آف نیشنز سے الگ ہو کر وہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ اتحادیوں کی فتح کے بعد جرمنوں نے مسولینی کو بچالیا۔ اور شمالی اٹلی میں اس کی برائے نام حکومت بنا دی۔ ۱۹۴۵ء میں اسے گولی مار دی گئی۔ مسولینی کی دعوت پر اقبال ۱۹۳۲ء میں اٹلی گئے ۔اور اس سے ملاقات کی جب اخبار نویسوں نے اقبال سے مسولینی کے متعلق دریافت کیا تو اقبال نے کہا بائبل کے بغیر لوتھر ہے۔

اقبال نے ہمیشہ دوسروں میں اچھائیاں تلاش کی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی خوبیوں کو نہایت عمدگی سے شعروں میں بیان کر کے ان کو ہدیہ عقیدت پیش کرنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اقبال نے احباب کی تعریف وتوصیف میں دل کھول کر لکھا ہے۔ مسولینی کے بارے میں بھی اقبال نے اپنے کلام میں تذکرہ کیا ہے۔

نظم: مسولینی

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب!
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب
رومتہ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشم پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب!
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ورکا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

(کلیات اردو، ص ۴۴۲۔۴۴۳)

نظم: مسولینی

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم

تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے، نہ راج
آل سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج!
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

(کلیات اردو، ص ۶۱۱-۶۱۲)

ooo

جولیس سیزر

جولیس سیزر قبل مسیح کا ایک رومی جرنیل اور سیاست دان تھا۔ روم کے ایک امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں ہی رومی سیاست میں سرگرمِ عمل ہو کر حصہ لینے لگا۔ روم کی عوامی جماعت کا صدر اور جماعت اشرافیہ کے صدر سلا کا حریف تھا۔ اس نے روم کے دو بڑے لیڈروں پاپمے اور کراسس میں صلح کرائی اور ۶۰ ق م میں ان کی اعانت سے روم کی پہلی مجلس ارباب ثلاثہ قائم کی۔ ۵۹ ق م میں گال (فرانس) کا قونصل منتخب ہوا اور ارد گرد کی ریاستوں کو شکست دے کر رومی سلطنت میں شامل کیا۔ ۵۴ ق م میں دریائے رائن عبور کر کے برطانیہ پر حملہ کیا۔ روم واپس آ کر پاپمے کے خلاف اعلان جنگ کیا اور جلد ہی پورے روم پر قابض ہو گیا۔ ۴۶ ق م میں روم کا امرِ مطلق بن گیا۔ اسی سال مصر جا کر قلوپطرہ کی مدد کی اور اسے روم لے آیا۔ ۱۵ فروری ۴۴ ق م کو سینیٹ نے اسے تاج شاہی پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جولیس سیزر مصر آیا تو قلوپطرہ مصر کا تاج وتخت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے سیزر کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے دام محبت میں پھنسایا اور ایک لڑکے کو جنم دیا۔ سیزر اسے مصر کی حکومت سونپ کر واپس چلا گیا۔ دو سال بعد قلوپطرہ بیٹے کو لے کر روم گئی لیکن اسی دوران ۱۵ مارچ ۴۴ ق م کو چند سازشیوں نے جن میں اس کا دوست بروٹس بھی شامل تھا، اسے سینیٹ کی عمارت میں قتل کر دیا۔ سیزر کے قتل کے بعد ۴۱ ق م میں اس کا دوست جنرل مارک انتونی مصر آیا تو قلوپطرہ نے اس سے شادی کر لی۔ سیزر نے اپنے عہد حکومت میں کئی مفید اصلاحات کیں۔ نیا کیلنڈر جاری کیا جو جولین کیلنڈر کے نام سے معروف ہے۔

توڑ اُس کا رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

(کلیات اردو، ص ۶۵۱)

لانگ فیلو ہنری ورڈز ورتھ

لانگ فیلو ہنری ورڈ زورتھ ۱۸۰۷ءکو پورٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ لانگ فیلو اپنے دور کا مقبول اور مشہور ترین شعراء میں شمار ہوتا تھا۔۱۸۲۵ء میں گریجوایشن کے بعد وہ یورپ گیا تاکہ تدریسی کیریئر کے لیے تیاری کرسکے۔ اس نے ۳۵۔۱۸۱۵ء کے دوران Bowdoin میں جدید زبانیں پڑھائیں اور پھر ہارورڈ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دینے لگا۔ ۱۸۵۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے سارا وقت لکھنے لکھانے میں صرف کیا۔ ۱۸۶۱ء میں دوسری بیوی کی حادثاتی موت نے اسے بہت دکھی کیا۔ مشہور سانیٹ ''The Cross of Snow'' (۱۸۷۹ء) اس کی یادگار ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا ایک مجسمہ ویسٹ منسٹر خانقاہ کے Poets Corner میں رکھا گیا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والا پہلا امریکی تھا۔

لانگ فیلو کو اپنی نظموں کے اولین مجموعہ Voices of the Night (۱۸۳۹ء) کی وجہ سے اسے بے پناہ شہرت ملی۔ اس مجموعہ میں شامل ایک نظم A Psalm of Life بھی شامل تھی۔ لانگ فیلو کو اس نظم کی وجہ سے بہت شہرت ملی۔ اس کے ایک معروف شعری مجموعہ ''Ballads'' (۱۸۴۱ء) تھا۔ اس نے دانتے کی طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' کا ایک منظوم ترجمہ بھی کیا۔ لانگ فیلو کا شمار امریکہ کے قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ لانگ فیلو ۱۸۸۲ء میں وفات پا گیا۔

علامہ محمد اقبال نے ہمیشہ دوسرے شعراء کی دل کھول کر پذیرائی کرتے ہیں۔ لانگ فیلو کے حوالے سے بھی انھوں نے ایک نظم ''پیامِ صبح'' لکھی ہے جو لانگ فیلو سے ہی ماخوذ ہے۔ لانگ فیلو بلند پایہ شاعر تھے جنھوں نے اقبال ایسے شاعر کو بھی متاثر کیا۔

پیامِ صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا
جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری
برہمن کو دیا پیغامِ خورشیدِ درخشاں
ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل تو مؤذن ہے گلستاں کا
دیا یہ حکم صحرا میں چلو اے قافلے والو
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارا دیکھ کر شہرِ خموشاں کا
ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی

(کلیاتِ اردو۔ص ۵۶)

○○○

جان لاک

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایک مفکّر کی طرح سوچتے اور مجاہد کی طرح عمل کرتے تھے۔ مشرق و مغرب کے سیاسی افکار پر ان کی گہری نظر تھی۔ روسو، ہابز، میکاولی، ہیگل، ارسطو، افلاطون اور ایسے ہی دانش وروں کے سیاسی افکار اقبال کے زیرِ مطالعہ رہے۔ علامہ اقبال نے ممتاز مفکّر جان لاک کے نظریات سے بھی فیض حاصل کیا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے کئی مقامات پر جان لاک کے نظریات کا تذکرہ کیا ہے۔ جان لاک کے سیاسی افکار مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جان لاک ۱۶۳۲ء کو سامرسیٹ کے گاؤں ورنگٹن میں پیدا ہوا۔ جان لاک نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں ۱۶۶۱ء سے ۱۶۶۴ء تک آکسفورڈ میں زبان وادب اور اخلاقی فلسفہ پر لیکچر دیتے رہے۔ ۱۶۶۷ء میں اس کی دوستی ایک انگلش ریاست کار انتھونی ایشلے کوپر سے ہوگئی اور وہ اس کا مشیر وطبیب بنا۔ ایشلے ایک جارحیت پسند اور دشمن دار سیاستدان تھا۔ وہ ایک آئینی بادشاہت، پروٹسٹنٹ جانشینی، مذہبی رواداری، پارلیمنٹ کی بالادستی اور برطانیہ کی اقتصادی توسیع کا پرزور حمایتی تھا۔ چونکہ لاک نے بھی یہی مقاصد اختیار کر رکھے تھے اس لیے دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ایشلے نے اسے اس گروپ کا سیکرٹری بھی بنایا جو امریکہ کے ساتھ تجارت کو فروغ دینے کے یے بنایا گیا تھا۔ لاک نے نئی کالونی کیرولینا کے لیے ایک آئین مرتب کرنے میں مدد دی۔ ۱۶۶۸ء میں وہ پانچ سال قبل قائم ہونے والی ''رائل سوسائٹی'' کا رکن بنا۔ ۱۶۷۵ء میں ایشلے کی دربار میں غیر مقبولیت کے بعد وہ فرانس گیا اور چار برس بعد واپس آیا لیکن رومن کیتھولک ازم اور انگلش دربار کی مخالفتوں کے باعث اسے وہاں حالات خراب معلوم ہوئے۔ ۱۶۸۳ء سے ۱۶۸۸ء تک کا عرصہ

اس نے ہالینڈ میں گزارا۔ ۱۶۸۸ء کے ''شاندار انقلاب'' اور پروٹسٹنٹ ازم کی کچھ حد تک بحالی کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر واپس انگلینڈ آیا۔ نئے بادشاہ ولیم سوم نے اسے ''بورڈ آف ٹریڈ'' میں نامزد کیا۔ ۱۷۰۰ء میں خراب صحت کی وجہ سے اس نے استعفیٰ دیا اور چار برس بعد دنیا سے رخصت ہوا۔

لاک کی زندگی کا آخری دور اپنی تصانیف کی اشاعت کرتے ہوئے گزرا۔ ''بردباری کے متعلق ایک خط'' (۱۶۸۹ء) بلا نام شائع ہوا۔ ۶۱۔۱۶۶۰ء میں بھی اس نے اس موضوع پر دو تحریریں لکھیں۔ اس کی مشہور تصنیف ''انسانی تفہیم کے بارے میں مقالہ'' دسمبر ۱۶۸۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ جان لاک کی کتابوں اور زندگی دونوں میں وہ عقل و دانش نظر آتی ہے۔ جو اس کی شہرت کا باعث بنی۔ سیاسی فلسفہ پر لاک کی اہم ترین تصنیف کا عنوان ''حکومت کے بارے میں دو مقالے'' ہے۔ لاک نے سر رابرٹ فلمر کی Patriarcha کو مسترد کر دیا۔ رابرٹ فلمر نے یہ کتاب سترہویں صدی کے وسط میں لکھی تھی اور اس میں بادشاہوں کے الوہی حق کا دفاع کیا تھا۔ لاک کی نظر میں حکومت ایک امانت ہے، اور عوامی فلاح کو محفوظ بنانے میں ناکام ہونے والا حکمران ان میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ حکمران کی حاکمیت مطلق کے بجائے مشروط ہے۔ سول معاشرے میں داخل ہونے پر فرد کے تمام حقوق چھن نہیں جاتے بلکہ وہ صرف اپنے ساتھ انسان کے بارے میں فیصلہ کرنے اور انہیں سزا دینے کے واحد حق سے ہی دست بردار ہو کر اسے عوام کے سپرد کر دیتا ہے۔ علم کی اعلیٰ طاقتوں پر لاک کا ایمان اسے بجا طور پر عہد روشن خیال کا اولین فلسفی بناتا ہے۔ وسیع تر مفہوم میں اس نے ایک ایسی فکری روایت قائم کی جو تین صدیوں پر محیط ہے۔ جان لاک ۱۷۰۴ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

ساغرش را سحر از بادۂ خورشید افروخت
ورنہ در محفل گل لالہ تہی جام آمد
(کلیات فارسی۔ ص ۳۸۱)

ooo

کارل مارکس

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی (رامنش پرشیا) کے شہر ٹریویس میں پیدا ہوا اس کا باپ ایک یہودی وکیل تھا جو ۱۸۲۸ء میں مارٹن لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر پروٹسٹنٹ بن چکا تھا کارل مارکس کا خاندان ایک خوش حال اور مہذب خاندان تھا اور انقلاب کے اثرات اس خاندان میں دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ ٹریویس سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد مارکس پہلے بورن اور برلن میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جہاں اس نے فقہ، تاریخ اور فلسفلے کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۴۱ء میں فارغ التحصیل ہو کر اس نے اپی کیورس کے فلسفے پر اپنا مقالہ ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا۔

کارل مارکس جرمن فلسفی اور انقلابی سوشلزم کی بنیاد رکھنے میں فریڈرک اینگلس کا شریک بانی اور انسانی تاریخ کے نہایت متاثر کن مفکّرین میں سے ایک تھا۔ ہیگل کے فلسفہ میں بائیں بازو کے رجحان نے مارکس کے روحانی ارتقاء پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں مارس نے ہیگل کے فلسفہ سے نہایت انقلابی اور الحاد پرستانہ نتائج اخذ کیے۔ ۱۸۴۲ میں کولون سے چھپنے والے اخبار Rheinisch Zeitung کے لیے اپنا پہلا مصمون لکھنے کے فوراً بعد وہ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے اپنے مضامین میں معاصر سیاسی وسماجی حالات پر تنقید کی اور حکام کی مخاصمت مول لی۔ ۱۸۴۳ میں مارکس کو ایڈیٹر کا عہدہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اور جلد ہی اخبار کو پابندیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ تب مارکس پیرس گیا۔ وہاں فلسفے، تاریخ اور سیاسی سائنس کا مزید مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اس نے کمیونسٹ نظریات اپنا لیے۔ ۱۸۴۴ء میں جب فریڈرک اینگلس پیرس آیا تو دونوں کو پتا چلا وہ وہ انقلابی مسائل کی نوعیت کے متعلّق انفرادی طور پر ایک ہی جیسے نتائج تک پہنچے تھے۔ انھوں نے مل کر

ایک منظم انداز میں کمیونزم کے نظری اصولوں کی تشریح واشاعت کے سلسلہ میں بین الاقوامی بین مزدور تحریک تشکیل دینے کی سعی کی۔ ۱۸۴۵ء میں کارل مارکس کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں پیرس چھوڑنے کا حکم ملا۔ وہ برسلز میں مقیم ہوا اور متعدد شہروں میں نقلابی گروپس کے نیٹ ورکس ''کمیونسٹ کارسپانڈنس کمیٹیز'' کی تنظیم سازی میں حصہ لینے لگا۔ ۱۸۴۷ء میں ان کمیٹیوں کو ملا کر کمیونسٹ لیگ کی صورت دی گئی اور مارکس و اینگلس کو اس کے اصولوں پر مبنی دستاویز تشکیل دینے کا کام سونپا گیا ان کا پیش کردہ پروگرام دنیا بھر میں ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' کے نام سے معروف ہوا ہے۔ مارکس نے نے مینی فیسٹو میں نتیجہ اخذ کیا کہ سرمایہ دار طبقے کو زوال آئے گا اور بین الاقوامی طبقاتی انقلاب اسے ختم کر کے ایک غیر طبقاتی معاشرہ تشکیل دے گا۔ مینی فیسٹو نے بعد کے تمام کمیونسٹ ادب اور بالعموم انقلابی فکر پر عمیق اثرات مرتب کیے۔ اپنی عملی سرگرمیوں اور تھیوریٹکل تحقیقات کے دوران مارکس کا براہ راست ٹکراؤ ہیگلی فلسفے سے ہوا کیونکہ وہ مصالحتی رجحانات، رجعت پسندانہ سیاسی نکتہ نظر رکھتا تھا۔

پیرس میں انقلابی سرگرمیوں اور سیاسی معیشت، یوٹوپیائی سوشلزم اور تاریخ کے مطالعہ نے بھی اسے متاثر کیا۔ اس نے یہ نکتہ نظر ۱۸۴۴ء میں شائع ہونے والے دو مضامین میں کیا۔ ان مضامین میں مارکس نے پہلی بار پرولتاریہ کے تاریخی کردار کو منکشف کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سماجی انقلاب ناگزیر ہے اور مزدور طبقے کی تحریک کو سائنسی نظریۂ دنیا کے ساتھ متحد کرنا ضروری ہے۔ Critique of Gotha Programme (۱۸۷۵ء) میں مارکس نے سائنسی کیمونزم کے نظریے کو مزید آگے بڑھایا اس کی دلچسپی کا اصل موضوع سیاسی معیشت تھا اور اس نے ساری زندگی اپنے بنیادی کام ''سرمایہ'' میں لگا دی جس کی پہلی ۱۸۶۷ء، دوسری ۱۸۸۵ء اور تیسری ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔ سیاسی معیشت کی تخلیق نے کیمونزم کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں۔ ''سرمایہ'' کی فلسفیانہ اہمیت بے مثال ہے۔ اس کے دیگر ادھورے منصوبوں کا تعلق ریاضی اور تکنیکی ترقی کے مختلف تاریخی پہلوؤں سے تھا کارل مارکس اپنی زندگی میں زیادہ اثر انگیز ثابت نہ ہوا۔ موت کے بعد اس کا اثر مزدور تحریک کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ اس کے خیالات اور نظریات مارکسزم یا سائنسی سوشلزم کہلانے لگے۔ سرمایہ داری معیشت کے بارے میں اس کا تجزیہ اور تاریخی مادیت، طبقاتی جدوجہد اور قدر زائد کے حوالے سے اس کے نظریات جدید سوشلسٹ نظریے کی اساس بن گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لینن نے ان تصورات کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے بعد عملی صورت دی۔ بالشوازم اور تھرڈ انٹرنیشنل

نے اپنی تھیوری اور حکمت عملی میں انہی کو بنیاد بنایا۔۱۸۸۳ء میں کارل مارکس انتقال کرگیا۔اس کے نظریات نے دنیا بھر کے فلاسفروں کو توجہ حاصل کی۔اقبال بھی چونکہ سرمایہ داری کے خلاف ہیں اردو شاعری میں سب سے پہلے انھوں نے مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی۔مارکس کی وہ بڑی حمایت کرتے ہیں۔اقبال ساقی نامے میں انتہائی مسرت کے ساتھ عوام الناس کو یہ کہہ کر مبارک باد دی۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

علامہ محمد اقبال نے کارل مارکس کے حوالے سے یوں تو بہت اشعار کہے لیکن ایک نظم بطور خاص پیش ہے:

نظم: کارل مارکس کی آواز

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش!
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش!

(کلیات اردو،ص۵۹۹)

ooo

ولیم شیکسپیئر

ڈراما نگاری میں آج تک ولیم شیکسپیئر کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔انگریزی ڈرامہ نگاروں میں اسے سب پر برتری حاصل ہے۔اس کے ڈراموں کے سینکڑوں ایڈیشن دنیا کی بڑی زبانوں میں تراجم ہوکر شائع ہو چکے ہیں۔ محققین نے اس کے پلاٹس، کرداروں، موضوعات اور زبان پر ہزاروں کتب لکھی ہیں۔اس کے بہت سے ڈرامے کسی بھی اور مصنف کے ڈراموں کی نسبت زیادہ مرتبہ پیش کیے گئے۔۲۶ اپریل ۱۵۶۴ء وک ٹرینٹی چرچ واروک شائر، انگلینڈ میں پیدا ہوا۔اس کا باپ جان شیکسپیئر ایک نمایاں بزنس مین تھا جو ۱۵۶۸ء میں سٹریٹفورڈ کا میئر بنا۔اس کی ماں میری ایک امیر کبیر جاگیردار کی بیٹی تھی۔شیکسپیئر کے سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق علم نہیں اس کا ہم عصر بین جانسن اتنا ہی بتاتا ہے کہ وہ تھوڑی سی لاطینی اور اس سے بھی کم یونانی جانتا تھا۔وہ یونیورسٹی نہ گیا۔ نوجوان شیکسپیئر سے متعلق دو قصے بتاتے ہیں کہ وہ اپنی حیات میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔پھر بھی حیرت ہے کہ اس کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق رنگا رنگ کی خیال آرائیاں ہوئیں۔بلکہ بعض لوگوں کی تو یہ رائے ہے کہ شیکسپیئر محض فرضی شخصیت ہے۔ڈرامے دراصل بیکن کے لکھے ہوئے ہیں لیکن تحریری شہادتوں سے اتنا تو ثابت ہو چکا ہے کہ شیکسپیئر ۲۳ اپریل ۱۵۶۴ء کے قریب سٹریفورڈ میں پیدا ہوا۔غالباً وہ تھوڑی مدت کے لیے سٹریٹ فورڈ کے گرئمر سکول میں پڑھتا رہا اس یک بعد ایک قصاب کی دکان پر کام کرنے لگا۔اس زمانے میں سرٹامس لوسی کی اراضی میں اس نے کچھ خلافِ قانون حرکتیں کیں اور شاید اسی وجہ سے وہ لندن چلا گیا۔وہاں پہنچ کر اس نے پہلے پہل کیا شغل اختیار کیا یہ کوئی نہیں جانتا۔بعد میں ادکار اور ڈرامہ نگار بن گیا۔۱۵۹۴ء تک وہ اس کمپنی

کا ایک ممتاز رکن تھا جس نے ملکہ الزبتھ کے دربار میں کھیل دکھائے، لیکن شیکسپیئر میں ایکٹر بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ البتہ ڈرامہ لکھنے میں کمال رکھتا تھا وہ پرانے قصوں کو نئے سرے سے لکھتا، ان میں دلچسپ کرداروں کا اضافہ کرتا اور دانائی کی باتوں کو ایسی نفیس اور شاعرانہ زبان میں لکھتا جو اسی کا حصہ ہے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اس کی شادی این ہیتھوے سے ہوئی۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ ۱۶۱۶ء میں اپنی سالگرہ کے دن وفات پائی۔ ان کی بیوی ۱۶۲۳ء میں ۶۷ برس کی عمر میں فوت ہوئی اور شیکسپیئر سے ۸ سال بڑی تھی۔ ۱۵۹۲ء میں لندن کے ایک ڈرامہ نویس رابرٹ گرین کے ایک پمفلٹ میں اس کا ذکر ہے۔ رابرٹ اپنے دوستوں کو ایک اداکار سے خبردار کرتا ہے جو ڈرامے لکھنے کی گستاخی کر سکتا ہے۔ ۱۵۹۲ء میں شیکسپیئر کا ذکر The Lord Chamberiain's men میں ایک سرکردہ رکن اور سٹاک ہولڈز کے طور پر ملتا ہے اس بات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں شیکسپیئر نے بطور اداکار کیا کردار ادا کیے۔ البتہ خیال ہے کہ اسے ''ہیملٹ'' کے بھوت جیسے معاون کردار ہی ملے ہوں گے۔ ۹۱۔۱۵۹۰ء اور ۱۳۔۱۶۱۲ کے درمیان اس نے ۳۸ ڈراموں میں حصہ لیا۔ ۱۵۹۹ء میں وہ ''گلوب تھیٹر'' کا شراکتی مالک بنا اور ۱۶۰۸ء میں 'بلیک فرائرز تھیٹر'' کا۔ ۱۶۱۲ء یا ۱۶۱۳ء میں وہ سٹریٹفورڈ چلا گیا جہاں ۱۵۹۷ء میں تھیٹر سے ہونے والی کمائی سے ایک گھر خرید چکا تھا۔ شیکسپیئر ڈراموں کے علاوہ شاعری بھی کرتا تھا اس کی بعض نظمیں بہت مقبول ہوئیں مثلاً ''وینس اور ایڈونس'' اور ''ریپ آف لکریشیا'' ان میں بھی اسی قسم کی قوت بیان اور ویسا ہی تخیل موجود ہے جو اس کے ڈراموں کی جان ہے۔ وہ ۲۳/اپریل ۱۶۱۶ء کو فوت ہوا۔ ممتاز شیکسپیئرین اداکار ہنری اروِنگ نے شیکسپیئر کی تحریروں کے ایک مقبول عام ایڈیشن کے دیباچے میں اسے سقراط سے بالاتر قرار دیا۔

بین جانسن اور اس کے دوسرے دوستوں کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ شیکسپیئر خوددار او رمتحمل مزاج تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ عام ہوٹلوں میں بیٹھ کر اپنے دوستوں سے گپیں ہانکنا اسے بہت پسند تھا۔

شیکسپیئر ولیم

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ　　نغمۂ شام کو خاموشی شام آئینہ
برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار　　شاہدِ مے کے لیے حجلہ جام آئینہ

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دل انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ
ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرت روشن تھی مآلِ ہستی؟
تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

(کلیات اردو، ص ۲۵۱)

ooo

ٹینی سن، الفرڈ لارڈ

حضرت علامہ محمد اقبال اس جوہری کی طرح تھے جسے جہاں کہیں سے بھی کوئی ہیرا، جواہر ریزہ ملا انھوں نے اسے عزت واحترام کے ساتھ اردو طبقہ کے لیے محفوظ کرنے کی سعی کی۔ ٹینی سن لارڈ کے خیالات وتصورات سے اقبال متاثر تھے انھوں نے بعض شعراء کے خیالات وافکار کو اردو سانچے میں ڈھالا ہے۔ بلائنڈ پروفیسر شیخ محمد اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں ان تمام انگریزی شعراء کرام کا تذکرہ کیا ہے جن کی شاعری سے علامہ اقبال متاثر تھے۔ ٹینی سن لارڈ بھی ان شعرا میں شامل ہے۔ ٹینی سن لارڈ کے افکار ونظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اقبال نے ''عشق وموت'' ایسی ہی ایک نظم ہے۔ ٹینی سن لارڈ ممتاز انگریزی شاعر ہے جو کٹوریہ عہد کی عظیم نمائندہ شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ ٹینی سن لارڈ ۱۸۰۹ء کو سامرسبائی، لنکن شائر میں پیدا ہوا۔ اس نے زیادہ تر تعلیم اپنے کلیسائی عہدیدار باپ سے حاصل کی۔ ٹینی سن لارڈ نے لڑکپن میں ہی شاعرانہ تک بندی میں دلچسپی اور مہارت ظاہر کرنا شروع کردی۔ اس نے متعدد بحروں میں شعر کہے اور لارڈ بائرن جیسے مشہور شاعروں کی طرح پر شاعری کی۔ پندرہ برس کی عمر میں وہ نظم معری میں متعدد ڈرامے اور ایک رزمیہ لکھ چکا تھا۔ عہدِ نوجوانی کی کچھ شاعری س کے بھائی چارلس کی شاعری کے ساتھ ''Poems by Two Brothers'' (۱۸۲۷ء) میں شائع ہوئی۔ ۱۸۲۷ میں ٹینی سن لارڈ نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں پڑھنے کے دوران اس نے پرجوش نظم ''Timbuctoo'' (۱۸۲۹ء) میں لکھی جس پر اسے ایک انعام ملا اور نظموں کا پہلا مجموعہ ''Poems Chiefly Lyrical'' (۱۸۳۰ء) شائع ہوا۔ اسی سال کے موسم گرما میں اپنے قریبی دوست آرتھر ہالام کے ساتھ مل کر ہسپانوی انقلابی فوج میں شمولیت

اختیار کی مگر کسی عسکری لڑائی میں حصہ نہ لیا۔ اگلے سال باپ کی وفات کے بعد ٹینی سن لارڈ نے ڈگری لیے بغیر کیمبرج کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کی نظموں کے دوسرے مجموعے (۱۸۳۲ء) میں متعدد جانی پہچانی نظمیں شامل تھیں، جیسے "The Lady of Shlott"، "Oenone"، "The Palace of Art"، "The Lotos-Eaters"۔ ۱۸۳۳ء میں دوست ہالام کی اچانک موت نے ٹینی سن لارڈ میں ایک عمیق روحانی ڈپریشن پیدا کیا اور اس نے مزید دس سال کوئی شاعری نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ اس دوران وہ مطالعہ اور ریاضت میں لگا رہا۔ چھپوانے سے انکار کے باوجود اس نے لکھنا جاری رکھا، اور موت و لافانیت پر ایک فلسفیانہ نظم "The two Voices" بھی تخلیق کی۔ ۱۸۴۲ء میں اسے نظموں کے دو مجموعوں کی اشاعت کے بعد زبردست شہرت ملی۔ ٹینی سن لارڈ کی پہلی طویل نظم "The Princess" (۱۸۴۷ء) تھی۔ تین سال بعد اس نے اپنے مرحوم دوست کی یاد میں "Memoriam" جیسی شاہکار نظم تخلیق کی۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے ایمیلی سارہ سے شادی کی جس کو پچھلے پندرہ برس سے پیار کرتا تھا۔ اسی سال اسے برطانیہ کا ملک الشعراء تعینات کیا گیا۔ وہ اپنی دلہن کے ہمراہ لندن کے قریب رہنے لگا اور پھر Isle of Wight پر اپنی جاگیر پہ چلا گیا ٹینی سن لارڈ کی دیگر تحریروں میں درج ذیل شامل ہیں۔ "Enoch Arden" (۱۸۶۴ء)، "Queen Mary" (۱۸۷۵ء)، "Harold" (۱۸۷۶ء)، "Becket" (۱۸۸۴ء)، "Ballads and Other Poems" (۱۸۸۰ء)، "Tiresias and Other Poems" (۱۸۸۵ء)، اور "Demeter and Other Poems" (۱۸۸۹ء)۔ چند ایک شعرا نے ہی ٹینی سن لارڈ کی طرح اتنے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ٹینی سن لارڈ ۱۸۹۲ء کو انتقال کر گیا۔

عشق اور موت

(ماخوذ ـــــ ٹینی سن، لارڈ)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی　　تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا　　عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
یہ پیرہن شام کو دے رہے تھے　　ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی

کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے   کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا   ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو   خودی تشنۂ کام مے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی   کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لا مکاں ہوں
غرض اس قدر یہ نظارا تھا پیارا
کہ نظارگی ہو سراپا نظارہ
فلک آزماتے تھے پرواز اپنی
جبینوں سے نورِ ازل آشکارا
فرشتہ تھا اک ، عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کا پتلا تھا بیتابیوں کا
مَلک کا مَلک اور پارے کا پارا
پے سیرِ فردوس کو جا رہا تھا
قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا
یہ پوچھا ''ترا نام کیا؟ کام کیا ہے؟
نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ
اجل ہوں ، مرا کام ہے آشکارا
اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انسان کی دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

(کلیاتِ اردو، ص ۵۷۔۵۸)

ooo

کوپر ولیم

کوپر ولیم Cowper William ۱۷۳۱ء کو پیدا ہوا۔ کوپر اینگلیکن کلیسیائی عہدیدار کا بیٹا تھا۔ کوپر ولیم انتہائی پڑھے لکھے شعرا میں سے تھے ان کی ایک مشہورِ زمانہ نظم The Poplar Trees اٹھارہویں صدی کی ایک نمائندہ نظم سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس نظم نے فطرت نگاری میں ایک منفرد انداز پیدا کیا۔ کوپر ولیم نے لندن ویسٹ منسٹر سکول سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۷۵۴ء میں بار کا رکن بنا اور اس دوران ذہنی عدم استحکام کی علامات ظاہر کرنے لگا جو ساری زندگی اس کے ساتھ رہیں۔ اس کا والد ۱۷۵۶ء میں فوت ہوا تو کوپر کے خاندان نے اپنے تعلقات کی بنا پر اسے ہاؤس آف لارڈز میں دو اچھے عہدوں پر تعینات کیا جس کے لیے کوپر کو باقاعدہ امتحان دینا ضروری تھا۔ اس امتحان کے خوف نے کوپر کو خودکشی کی طرف بھی مائل کیا اور وہ ڈیڑھ سال تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ وہ مذہبی شکوک اور خوف کا شکار تھا۔ تاہم مذہب نے اسے ذہنی سکون اور آرام پہنچایا وہ پادری Unwin، اس کی بیوی میری اور چھوٹے سے کنبے کے ساتھ رہا۔ ۱۷۶۷ء میں پادری ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوا تو کوپر ولیم پر ایک بار پھر دورے پڑنے لگے اور وہ سخت بیمار ہو گیا ۱۷۷۳ء میں اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ جس کی وجہ سے وہ میری سے شادی نہ کر سکا۔ ۱۷۷۴ء میں اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے چھ ہجو لکھیں، کوپر کا شہرۂ آفاق گیت The Journey of john Gilpin ۱۷۸۳ء میں شائع ہوا تو اسے بے پناہ شہرت ملی یہ گیت زبان زدِ عام ہو گیا۔ اس کی نصیحت آموز نظم ''The Task'' ۱۷۸۵ء کو بھی دنیا بھر میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ کوپر ولیم نے ہومر کی شاعری کا ترجمہ شروع کیا۔ اس دوران وہ سخت بیمار بھی ہوا ۱۷۹۵ء میں وہ میری کے ساتھ نارفوک میں رہنے لگا۔ اگلے سال میری کی وفات

نے اس کو ایک بار پھر تنہا کر دیا اور وہ شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گیا پھر ایسا بیمار ہوا کہ پھر کبھی صحت مند نہ ہو سکا۔ وہ میری کے غم میں موت کو گلے لگانے لگا تھا اور بالآخر کوپر ولیم ۱۸۰۰ء میں وفات پا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی تحریروں کو ایڈٹ کر کے ۳۷۔۱۸۳۵ء میں پندرہ جلدوں میں شائع کیا گیا۔ اس کی کچھ نظمیں پروٹسٹنٹ انگلینڈ کے لوک ورثے کا حصہ بن چکی ہیں۔ کوپر ولیم سے حضرت علامہ اقبال بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے کوپر ولیم کی نصیحت آموز نظموں کا عمیق نظری سے مطالعہ کیا اور بعض نظموں سے متاثر ہو کر اقبال نے بڑی یادگار نظمیں بھی لکھیں جو ولیم کوثر سے ماخوذ بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم ''ہمدردی'' جو کہ اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے کہی پیش خدمت ہے۔

''ہمدردی''

(ماخوذ: کوپر ولیم)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(کلیاتِ اردو، ص ۳۵)

○○○

نپولین بونا پارٹ

عالمی شہرت یافتہ جرنیل نپولین بونا پارٹ منفرد صلاحیتوں کا حامل تھا۔ فرانس کی سرزمین کو فخر حاصل ہے اس کے دامن سے یورپ کا عظیم جرنیل ۱۵ر اگست ۱۷۶۹ء جزیرہ کارسیکا میں پیدا ہوا۔ بہت کم جانتے ہوں گے کہ نپولین کو قدرت نے چند اہم اور منفرد خوبیوں سے سرفراز کیا تھا۔ نپولین کا دل ایک منٹ میں بیالیس بار دھڑکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دل کی لکیر نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنی دیر چاہے نیند لے سکتا تھا۔ ارادے کا پکا اور وعدے کا سچا تھا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال ایسے احباب کو ہدیہ تحسین پیش کرتے تھے جو محنت شاقہ اور عزم و یقین کے ساتھ منزل مقصود پر گامزن رہتے تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے فلسفہ حیات میں یقین محکم، عمل پیہم اور مسلسل جدوجہد کا پیغام ملتا ہے۔ نپولین اقبال کے ایسے ہی پیغام کی عملی تفسیر تھا۔

اس نے پیرس اور برائن کے فوجی سکولوں میں تعلیم پائی۔ سب سے پہلی کامیاب (۱۷۹۳ء) میں تولون کے محاصرے کی صورت میں حاصل کی۔ اس کی کامیابی کا راز توپ خانہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اٹلی میں اپنی فتح کا پرچم لہرایا۔ ۱۷۹۷ء تک نپولین بونا پارٹ ایک قومی ہیرو بن گیا۔ اسی مذکورہ سال اسے مصر کے خلاف کمان کرنے کا موقع میسر آیا۔ نپولین نے مختلف فتوحات کے بعد ۱۷۹۹ء کو پیرس آ کر حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود قونصل اول بن گیا، انتظامیہ کی ابتری کو دور کر کے امن قائم کیا، مالی نظام میں اصلاح کی، عدالتوں کا نیا ضابطہ تیار کیا، تعلیم کو عام کرنے کا انتظام کیا اور فرانسیسی قوانین کی باقاعدہ ضابطہ بندی کے کام کی نگرانی کی۔ ۱۸ مئی ۱۸۰۴ء کو اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۸۰۵ء میں آسٹریا اور ۱۸۰۶ء میں جرمنی کو شکست دی۔ ۱۸۱۲ء میں روس پر

حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ماسکو (روس) سے پسپا ہوتے وقت اس کی تقریباً ساری فوج تباہ ہوگئی۔ ۱۸۱۳ء میں پروشیا اور آسٹریا نے روس کے ساتھ مل کر لائپزگ کے مقام پر اسے شکست فاش دی۔ وہ تخت سے دست بردار ہوگیا اور ایلبا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ مگر سو دن کے بعد وہاں سے نکل بھاگا اور فرانس واپس آیا اور فوج جمع کر لی لیکن ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو واٹرلو کے میدان میں اسے شکست ہوئی۔ اس کی یہ شکست اس کے جرنیل کی دومنٹ تاخیر کی وجہ سے ہوئی۔ بعد ازاں نپولین کو وقت کی پابندی کا گہرا احساس ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنی پہلی بیوی جوزیفائن کو طلاق دے کر ۱۸۱۰ء میں شاہ آسٹریا کی بیٹی ماری لویزا سے شادی کی تھی۔ نپولین بونا پارٹ کو فتوحات کا بہت شوق تھا لیکن موسم سرما میں ماسکو سے جاتے ہوئے اس کی فوج تقریباً تباہی کے دھانے پر تھی۔ ۱۸۱۳ء میں پروشیا اور آسٹریا نے روس کے ساتھ مل کر نپولین بونا پارٹ کو لائپزگ کے مقام پر شکست دی۔ ۱۱ اپریل ۱۸۱۴ء کو اسے تخت سے دست بردار ہونا پڑا نپولین کو ایک جزیرے میں قید کر دیا گیا تھا جہاں سے بھاگ کر اس نے دوبارہ فرانس میں آمریت قائم کی۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو نپولین واٹرلو کی جنگ میں ہار گیا اور اسے جلاوطن بھی ہونا پڑا۔ ۵۱ برس کی عمر میں نپولین کو معدے کا کینسر ہوگیا اور ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو دار فانی سے کوچ کر گیا۔ جنگ و جدل کی تاریخ میں نپولین کا نام شجاعت و بہادری کا استعارہ ہے۔ جو یورپ میں پہلے سے موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے اس کی بہادری اور جرأت کو بہت سراہا ہے۔

نظم: نپولین کے مزار پر

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوش کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس — عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!

(کلیات اردو، ص ۴۴۱)

ایمرسن

ایمرسن، رالف والڈو ۱۸۰۳ء کو بوسٹن، میساچوسٹس میں پیدا ہوا۔ امریکی مضمون نگار، شاعر ماورائیت کی فلسفیانہ تحریک کا راہنما تھا۔ انگریزی رومانویت، نوفلاطونیت اور ہندو فلسفہ جیسے مکاتب ہائے فکر سے متاثر ایمرسن بلیغ اور شاعرانہ انداز میں اپنے نظریات پیش کرنے کی مہارت کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے خاندان میں سے سات افراد منسٹر تھے۔ اس کا باپ ولیم ایمرسن بوسٹن کے فرسٹ چرچ کا منسٹر تھا۔ ایمرسن نے ۱۸ سال کی عمر میں ہارورڈ یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اور اگلے تین برس تک بوسٹن کے ایک سکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۸۲۵ء میں وہ ہارورڈ ڈیوینٹی سکول میں داخل ہوا اور اگلے برس مڈل سیکس ایسوسی ایشن آف منسٹرز کی جانب سے تبلیغ کی اجازت حاصل کی۔ خرابی صحت کے باوجود ایمرسن نے گاہے بہ گاہے بوسٹن کے گرجاگھروں میں خطبے دیئے۔ ۱۸۲۹ء میں وہ سیکنڈ چرچ کا منسٹر بنا اور ایلن ٹکر سے شادی کر لی جو سترہ ماہ بعد مر گئی۔ ۱۸۳۲ء میں ایمرسن نے بطور پاستور اپنی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دیا اور کیونکر وہ خداوند کی ضیافت (Lord's Supper) کی ساکرامنٹ کے بارے میں متشکک ہو گیا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں بروز کرسمس وہ امریکہ چھوڑ کر یورپ چلا گیا۔ اس نے کچھ عرصہ انگلینڈ میں گزارا اور وہاں برٹش لائبریری کے مشہور افراد والٹر ساوتھ، سیموئل ٹیلر کالرج، ٹامس کارلائل، اور ولیم ورڈز ورتھ کے ساتھ شناسائی پیدا کر لی۔ کارلائل کے ساتھ دوستی تا حیات قائم رہی۔ یورپ میں ایک سال گزار کر وہ امریکہ واپس آیا اور ۱۸۳۴ء میں کونکورڈ منتقل ہو کر بوسٹن میں لیکچر دینے لگا۔ اس کے خطبات کی بنیاد روزناموں پر تھی جن میں وہ ہارورڈ میں پڑھنے کے دوران روزمرہ مشاہدات اور نوٹس لکھتا رہا۔ اس کے عقیدے کا سب سے تفصیلی

بیان ''Nature'' (۱۸۳۶ء) میں ہے جو پہلی مرتبہ کسی نام کے بغیر شائع ہوئی۔ ایمرسن نے اپنے ۱۸۳۷ء کے لیکچر The American Scholar میں ثقافتی اور عقلی مسائل پر لاگو کیا۔ اس کے مضامین کا پہلا مجموعہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا جس میں مندرجہ ذیل موضوعات پر مضامین تھے: ''تاریخ''، ''خودانحصاری''، ''رعایت''، ''روحانی قوانین''، ''محبّت''، ''دوستی''، ''ہیروازم''، ''دائرے''، ''عقل'' اور ''آرٹ'' مضامین کے دوسرے سلسلے (۱۸۴۴ء) میں ''شاعر''، ''آداب'' اور ''کردار'' شامل تھے۔ ۱۸۶۰ء میں شائع ہونے والی اس کی کتاب The Conduct of Life کو فوراً شہرت مل گئی جس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے۔ ''دولت''، ''مقدر'' اور ''ثقافت''

ایمرسن ۱۸۸۲ء کو وفات پا گیا۔ اس کے افکار ونظریات کو آج بھی دنیا مانتی ہے اور اس کی شاعری کی دنیا معترف ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(بچوں کے لیے ماخوذ ایمرسن)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے، تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا!

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا!
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجکو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(کلیات اردو، ص۳۱)

رخصت اے بزمِ جہاں

(ماخوذ۔ایمرسن)

رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں
بسکہ میں افسردہ دل ہوں ،درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں
قید ہے دربارِ سلطان و شبستان وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیر طلائی کا اسیر
گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے
مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا
مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں
مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ! یوسف ہاتھ نہ آیا ترے بازار میں
چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے
چھوڑ کر مانند بُو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ! یہ لذت کہاں موسیقیٔ گفتار میں
ہمنشین ہے نرگس شہلا رفیقِ گل ہوں میں

کلام

ہے چمن میرا وطن ہمسایہ بلبل ہوں میں
شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھ
بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند
ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں مَیں
شوق کس کا سبزہ زادوں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟
طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل پیامی بزمِ قدرت کا ہوں مَیں
ہم وطن شمشاد کا ، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں
کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے
عاشقِ عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں
لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کر نظر
علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے لیکن ہست و بود

(کلیاتِ اردو، ص ۶۳۔۶۵)

ooo

گوئٹے

جوہن وولف گینگ فان گوئٹےعلم وادب کاایک ایسا آفتاب ادب ہے جس کی چمک نے جرمن کے ایوانِ ادب کودرخشندہ کر دیا۔ گوئٹے اپنی تخلیقات کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبول ہوا گوئٹے کو جرمن میں شہرت دوام حاصل ہوئی بالکل اسی طرح جس طرح شیکسپیئر کوانگریزی ادب میں مقبولیت حاصل ہے۔ گوئٹے کے والدوزیر تھے۔ ۱۴/اگست ۱۷۴۹ءکوفرانکفرٹ میں پیدا ہوا۔ گوئٹے نے سولہ برس تک قانون کی تعلیم حاصل کی پھرلائپزگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ گوئٹے کا ذہن ادبیات اور فلسفے کی طرف ہوا بہرحال اس نے قانون کی تعلیم پوری کی۔ گوئٹے نے اپنی مرضی سے علمِ کیمیا، تشریحِ اعضاء کا بھی مطالعہ کیااورفنِ تعمیر کا بھی ماہر ہوگیا۔اس کے علاوہ ادبیات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ سٹراس بورگ میں اس کوایک پادری کی انیس سالہ بیٹی ''فریدرکا بریوں'' سے محبت ہوگئی لیکن اس سے شادی نہ ہوسکی۔اس کے بعد کہیں ۱۸۰۶ء میں ایک خاتون کرسچیانا وولپیس سے رشتہ ازدواج قائم ہوا۔ سٹراس بورگ کے بعدگوئٹے نے کچھ عرصہ ویزلر میں قیام کیااور وہیں اس نے Sorrows of werther ''ورتھر کی داستانِ غم'' اس کتاب نے اس کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا اسی زمانے میں گوئٹے نے اپنی مشہور کتاب ''فاؤسٹ'' تحریر کرنا شروع کی جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ۱۷۷۵ء میں گوئٹے ویمر میں مقیم ہوگیا جہاں کے دوست گرینڈ ڈیوک آف سیکس ویمر نے اہلِ ادب کا ایک گروہ جمع کر رکھا تھا، گوئٹے اس گروہ کوسیاسیات وادبیات پر لیکچر دیا کرتا تھا کچھ مدت بعد اس نے سوئزرلینڈ اور اٹلی کا سفر بھی کیا۔ جس کے دوران اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے گوئٹے کے ''دیوان مغرب'' کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' تحریر کر کے مشرق و مغرب کے ادبی رجحان پر روشنی

ڈالی ہے۔علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' کے دیباچہ میں ''دیوان مغرب'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''غرض کہ ''مغربی دیوان'' کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا تکمیل تک پہنچایا۔ پلاٹن نے ادبی اغراض کے لیے فارسی زبان سیکھی۔ قافیہ ردیف بلکہ ایرانی عروض کے قواعد کی پابندی سے غزلیں لکھیں۔ رباعیاں لکھیں اور نپولین پر ایک قصیدہ بھی لکھا۔۔۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللّٰہ لا یغیر مابقوم حتٰی یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

۱۷۹۲ء میں جرمنی نے فرانس کے خلاف جنگ کی جس میں گوئٹے بھی باقاعدہ شامل ہوا یہ جنگ ناکام ہوئی۔ گوئٹے نے اس کے حالات بھی تحریر کیے۔ ڈیوک سیکس ویمر کا انتقال ۱۸۲۸ء میں ہوا تو گوئٹے نے سیاسیات اور معاشرے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بالکل تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ کو گوئٹے نے وفات پائی۔

گوئٹے

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے (کلیات اردو۔ص ۲۶)

پیر مغرب شاعرِ المانوی
آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی (کلیات فارسی۔ص ۱۸۶)

حور و شاعر

(در جواب نظم گوئٹے موسوم بہ "حور و شاعر")

حور

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی
ہمہ سازِ جستجوئے ہمہ سوزِ آرزوئے
نفسے کہ می گدازی، غزلے کہ می سرائی
بنوائے آفریدی چہ جہان دلکشائے
کہ ارم بچشم آید چو طلسمِ سیمیائی

شاعر

دل رہرواں فریبی بہ کلام نیش دارے
مگر ایں کہ لذت اونر سد بہ نوک خارے
چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپد آں زماں دل من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے، قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرائم بہ ہوائے نو بہارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے، نہ غمے، نہ غمگسارے

(کلیات فارسی۔ص ۲۹۶۔۲۹۸)

ہنیری برگساں

برگساں کا مکمل نام ہنیری برگساں تھا اور وہ ۱۸۵۹ء کو ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا ہنیری برگساں ممتاز فرانسیسی فلسفی اور صاحب طرز ادیب تھا۔ ہنیری برگساں نے اپنے اسلوب اور انداز تحریر سے دنیا بھر کے ادباء کو متاثر کیا۔ اس نے انسانی زندگی کی روحانی جہت کی بنیاد پر نظریہ ' ارتقاء پیش کیا جس نے متعدد نکتہ ہائے نظر پر وسیع اثرات مرتب کیے۔ برگساں کو ۱۹۲۷ء میں نوبیل پرائز برائے ادب کا مستحق قرار دیا گیا۔ برگساں ایک موسیقار گھرانے میں پیدا ہوا گھرانے کا نام Berek-son تھا جو بعد میں بگڑ کر برگساں ہو گیا۔ فرانس اور پیرس میں زیادہ وقت گزارا۔ اس نے پیرس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۸۱ سے ۱۸۹۸ء تک مختلف سیکنڈری سکولوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ برگساں نے Time and Free will کے موضوع پر ۱۸۸۹ء میں مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ Ecole Normale میں بحیثیت پروفیسر تعینات ہوا۔ بعدازاں College de Frances میں فلسفے کی چیئر پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کی کتاب Metter and Memory (۱۸۹۶ء) شائع ہوئی اس کے بعد اس کا ایک مضمون Laughter (۱۹۰۰ء) میں منظر عام پر آیا جس نے برگساں کی شہرت میں اضافہ کیا۔ پھر اس نے Creative Evolution (۱۹۰۷ء) میں انسانی وجود کے مسئلے پر تفصیل سے بحث کی اور ذہن کو خالص توانائی یا قوت حیات کے طور تعبیر کیا۔ یہی قوت تمام نامیاتی ارتقاء کی ذمہ دار ہے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ کالج ڈی فرانس سے مستعفی ہو کر بین الاقوامی امور، سیاست، اخلاقی مسائل اور مذہب پر توجہ دینے لگا۔ اس نے رومن کیتھولک ازم قبول کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دو عشروں کے دوران اس نے The Two Sources of Morality and Religion

(۱۹۳۲ء) لکھی۔ جس میں اپنے فلسفہ کو عیسائیت کی مطابقت میں پیش کیا۔ برگساں کا شمار ارتقاء پسند فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ اس فلسفہ کے دیگر حامیوں میں سپنسر، مورگن اور سیموئل الیگزینڈر شامل تھے۔ بلاشبہ ارتقاء پسند نظریات انیسویں صدی کے فلسفیوں پر اثرات کا نتیجہ تھے۔ اس کے علاوہ نفسیات نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ سپنسر کے نظریۂ ارتقاء پر نہایت حیرت انگیز تنقید برگساں نے اپنی ''تخلیقی ارتقاء'' میں پیش کی۔ برگساں نے نے تصور ارتقا کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مشتملات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ بیسویں صدی کے عظیم فلسفیوں آرٹسٹوں اور اہلِ قلم نے برگساں کی کتب کے علاوہ متعدد مقالوں، لیکچرز کا بھی گہرا اثر قبول کیا۔ اگر چہ اسے اکثر وجدانیت پسند فلسفیانہ مکتبہ فکر کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ بہت اچھوتا اور حقیقی نادر خیالات کا حامل ہے۔ ہنیری برگساں وجدانیت کا پیرو کار تھا۔ ہنیری برگساں ۱۹۴۱ء کو دنیا سے کوچ کر گیا۔ برگساں آج بھی اپنے تصورات وخیالات کی وجہ سے زندہ ہے۔

نظم: برگساں

تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود راجد از شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا میار
در مرزد بوم خود چو غریباں گزر مکن
نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

(کلیات فارسی۔ص ۳۷۷)

نظم: برگساں

نہ مۓ از ازل آورد نہ جامے آورد
لالہ از داغ جگر سوز دوامے آورد

(کلیات فارسی۔ص ۳۸۱)

○○○

کانٹ، امانوئیل

امانوئیل کانٹ ۱۷۲۴ء کونگسبرگ جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ شہرت ایک معروف جرمن فلسفی، ریاضی دان، اور ماہر فلکیات کی وجہ سے ہے۔ مارٹن کنوزن کی شاگردی میں لائبنے اور ولفیان کا مطالعہ کے فلسفوں کا مطالعہ کیا اور فلکیات، میکانکس اور دینیات کا علم حاصل کیا۔ اس کے فلسفیانہ افکار میں نیوٹن کی طبیعیات، لاک کی نفسیات اور لائبنے کے فلسفے کا گہرا اثر ہے۔ اس کی ذاتی زندگی اتنی با اصول تھی کہ اس کے زمانے کے لوگ اسے مشین سے تعبیر کرتے تھے۔ ساری زندگی مشکل سے چالیس میل کا سفر کیا ہوگا۔ ۱۷۵۵ء کاؤنٹ کیسر لنگ کے خاندان میں اتالیق مقرر ہوا۔ ۱۷۶۶ء میں ایک کالج میں نائب لائبریرین کی نوکری کی اور ۱۷۷۰ء میں کونگسبرگ یونیورسٹی میں منطق اور مابعد الطبیعیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔

کانٹ عصر حاضر کا ایک عظیم فلسفی ہے جو سقراط، افلاطون اور ارسطو کے برابر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے لاک اور فلسفے کے انگریزی اسکول اس نظریے کا انتقادی تجزیہ کیا اور اس کی تغلیط کی کہ قوت مدرکہ ہی تمام علوم کی بنیاد ہے۔ ہیوم نے جب کہا تھا کہ ''روح کے وجود سے انکار کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے اور اس نظریے کی بنیادیں پختہ کر دی ہیں کہ ہمارے حواس ہی تمام علوم کی بنیادیں ہیں۔'' کانٹ نے اس کی زبردست مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ مطالق اور قائم بالذات حقیقت کا عرفان ہمیں سائنسی (علمی) تجربے یا حواس کی مدد سے حاصل ہو۔ حقیقت ہر حال میں حقیقت رہے گی خواہ ہمارا ادراک وہاں تک پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے۔

امانوئیل کانٹ کی ایک معرکہ آرا تصنیف Critique of Pure Reason کا ترجمہ اردو

میں ''تنقید عقل محض'' کے نام سے ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا۔ کانٹ کی تصنیف ''تنقید عقل محض'' کے حوالے سے اقبال ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں لکھتے ہوئے کہا ہے:

''اس کی تصنیف ''تنقید عقل محض'' نے پرواز دلیل کی محدودیت کو بخوبی واضح کیا ہے اور استدلال پسندوں کے سارے کام کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اسے (کانٹ کی) صحیح طور پر خدا کی طرف سے ملک کو بہترین تحفہ کہا گیا ہے۔''

اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی بھی مغربی نقاد یا فلسفی کی نظریات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتے بل کہ اس کے نظریات کو اپنے مشرقی ماحول کے حوالے سے دیکھتے ہوئے اسے قبول ورد کرتے ہیں۔ کانٹ کے نظریے کو بھی انھوں نے من وعن قبول نہیں کیا۔ کانٹ ایک ماہر مابعد الطبیعیات تھا اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیاتی افکار اس کے جہد وعمل کی تعلیم میں ایک ذہنی پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں بنیادی اہمیت جہد وعمل کی ہے۔

کانٹ اپنے افکار کی وجہ سے دنیا بھر میں معروف ہوا۔ کانٹ ۱۸۰۴ء میں کونگسبرگ جرمنی میں انتقال کر گیا۔

علامہ محمد اقبال نے کانٹ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک خوبصورت شعر اپنے فارسی کلام میں کہا ہے۔

کانٹ

فطرتش ذوقِ مئے آئینہ فام آورد
از شبستانِ ازل کوکب جامے آورد

(کلیات فارسی۔ص ۳۸۱)

ooo

اہلِ قلم و دانش ور

فردوسی

ابوالقاسم فردوسی ایران کے سب سے بلند پایہ شاعر تھے۔ تمام ایرانی شاعران کی عظمت کے قائل ہیں۔ انھیں ایران کا ہومر کہا جاتا ہے۔ وہ مشہد کے قریب طوس کے مقام پر ۹۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ابوالقاسم فردوسی حسن بن اسحاق بن شرفشاہ فردوسی طوسی ان کا سلسلہ نسبت ہے۔ ان کے والد سامانی دربار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ بیٹے کو اپنے باپ سے طوس کے قریب Bazh کے مقام پر ایک پر آسائش بنگلہ وراثت میں ملا۔ فردوسی فارغ وقت میں قدیم ادب پر تحقیق کرتے کرتے انہیں خدائی نامہ میں دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ نظموں کو ایک قومی رزمیہ کی صورت دینے میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے اسے ''شاہنامہ'' کا نام دیا۔ ۲۵ سال کی انتھک محنت اور لگن سے تیار کرنے والے مجموعہ نظم کا انتساب محمود کی نذر کرنے کے لیے غزنی روانہ ہوئے سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اپنا ضخیم نظم کا مسودہ سلطان محمود کو دکھایا اور سنایا۔ سلطان محمود نے اسے شاہی مہمان بنایا اور اسے کچھ ترمیم واضافہ کرنے کو کہا۔ ہر ترمیم کے بدلے اسے سونے کا ایک درہم دینے وعدہ کیا۔ فردوسی ایک طویل عرصہ تک اس مسودہ کی ترمیم واضافہ میں لگے رہے۔ فردوسی نے کمال محنت ولگن سے ضخیم مسودہ آخر کار ۱۰۱۰ء میں مکمل کیا۔ یہ مسودہ ایک اندازے کے مطابق ۶۰.۰۰۰ اشعار پر مشتمل تھا۔ سلطان محمود وعدہ کے مطابق رقم ادا کرنے والا تھا کہ کچھ درباریوں نے احتجاج کیا اور یہ بھی کہا کہ فردوسی شیعہ ہے۔ محمود نے طلائی درہم کے بجائے چاندی کے ۶۰,۰۰۰ درہم بھجوا دیئے۔ شاعر نے غصہ میں آ کر وہ رقم ایک حمام کے خادم اور شربت فروشی میں تقسیم کر کے وہاں سے نکل آیا اور ہرات میں ایک کتب فروش کی دکان میں چھپا رہا۔ وہاں سے نکل کر فردوسی نے طبرستان

میں شیراز کے بادشاہ شہر یار کے پاس پناہ لی اور وہاں محمود کے خلاف ایک ہجو لکھی لیکن سلطان کے قہر سے خوف زدہ ہو کر شہر یار نے ۱۰۰،۰۰۰ درہم کے عوض یہ نظم خرید کر ضائع کر دی۔ وہاں سے فردوسی بغداد آ گئے۔ اور ایک طویل نظم ''یوسف زلیخا'' لکھی پھر وہ ۶۷ برس طوس میں رہا۔ دس سال بعد سلطان محمود نے اس نظم کا ایک شعر سن کر شاعر کا نام پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ یہ شعر فردوسی کا ہے۔ سلطان محمود شاعر کو وعدہ کے مطابق انعام نہ دینے پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ سلطان محمود نے ۶۰۰،۰۰۰ دینار مالیت کے نیل پر مشتمل کاروان اور خط معذرت بھجوایا جب یہ کاروان طوس میں داخل ہوا تو شاعر کا جنازہ جا رہا تھا۔

فردوسی نے ''شاہنامہ'' کو تصنیف کرنے میں زندگی کے ۳۵ سال صرف کر دیئے اور یہ شاہکار نظم دنیا کے تمام بڑی نظم میں سے ایک ہے۔ ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسے'' کو ملا بھی دیا جائے تو بھی شاہ نامہ ان سے کئی گنا ضخیم ہے۔

۱۹۳۴ء میں ایشیاء، یورپ اور امریکہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے فردوسی کا ایک ہزار سالہ جشن منایا۔ اس شاعر کی تخلیق کردہ ضخیم کتاب ایک ہزار سال سے فارسی روح کو تحفظ دیئے ہوئے ہے۔

فردوسی

یہ کہتا ہے فردوسی دیدہ ور
عجم جس کے سرمے سے روشن بصر
(کلیات اردو، ص ۴۵۲)

ooo

میر مہدی مجروح

میر مہدی مجروح ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام میر مہدی حسین جب کہ مجروح تخلص تھا۔ان کے والد میر حسن فگار بھی اچھے شاعر تھے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی ذوق انہیں والد سے وراثت میں ملا۔ان کا خاندان مغلوں کے آخری دور میں ایران سے آ کر ہندوستان میں آباد ہوا۔ان کا خاندان علمی وادبی لحاظ سے بہت معروف تھا۔ابتدائی تعلیم گھر میں پائی کیوں کہ ان کا سارا خاندان دولت علم وفضل سے مالا مال تھا۔ان کے والد جید عالم اور عمدہ شاعر تھے۔ان کے چچا میر حسن فارسی نثری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ان کے بھائی میر سرفراز حسین جن کا غالب کے لاتعداد مکتوبات میں ذکر ملتا ہے۔میر مہدی مجروح نے ایک علمی وادبی گھرانے میں آنکھ کھولی اور علمی وادبی ذوق اس گھرانے سے میر مہدی مجروح کے حصہ میں آیا۔شاعری میں وہ اسداللہ خان غالب کے شاگرد ہوئے۔جس شاعر کی اصلاح خود غالب نے فرمائی ہو اس کی اٹھان اور اس کے مقام ومرتبہ کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

اسداللہ خان غالب کے بڑے لاڈلے شاگرد تھے۔میر مہدی مجروح نہایت خوش نصیب ہیں کہ انہیں ذوق، مومن، شاہ نصیر، آرزو، شیفتہ اور صہبائی کا زمانہ ملا۔دلی کو اپنا مسکن بنایا لیکن جنگ آزادی کے بعد فکر معاش میں دلی کو چھوڑنا پڑا۔کچھ عرصہ الور اور کچھ عرصہ جے پور کے مہاراجاؤں کی سرپرستی میں بسر کیا۔آخری وقت نواب حامد علی خاں والی رام پور کی سرپرستی میں بسر کیا۔

میر مہدی مجروؔح خلف میر حسین نگاؔر دہلی کے رہنے والے اور غالب کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔جنگ آزادی کے بعد مدتوں پانی پت میں رہے پھر الور اور آخری ایام کسی قدر راحت

سے بسر کی ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ایک دیوان مظہر معانی کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی زبان میں صفائی اور سادگی اور محاورہ بندی زیادہ ہے۔ ایک خط میں غالب نے فرمایا:

''میر مہدی جیتے رہو، آفرین صد ہزار آفرین، اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی! سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو بھی کہا اللہ برکت دے۔''

میر مہدی کی شاعری دلی میں معروف ہوئی۔ جنگِ آزادی کے بعد انہیں دلی سے کوچ کرنا پڑا۔ پانی پت میں انصار کے محلے میں سکونت اختیار کی، پھر وہاں سے ریاست الور میں اپنے بھائی کے پاس چلے گئے جہاں ایک عرصہ تحصیل دار رہے۔ قدر دان مہاراجہ شودیان سنگھ کے انتقال کے بعد ریاست جے پور میں کچھ دن کاٹے اور پھر دلی کی راہ لی۔ جنگ آزادی میں قیمتی مال و متاع لُٹا اور دلی میں ہی آنکھوں کی بصارت بھی جاتی رہی۔ باقی عمر اسی طرح گزار دی۔ حضرت مجروح کے حصہ میں میر تقی اور میر حسن کا رنگ آیا۔ سادگی اور نزاکت پر جان دیتے تھے۔

آخری سالوں میں میر مہدی مجروح نے غزل کہنا ترک کر دیا تھا اور حمد، نعت اور سلام کہتے۔ بزرگانِ دین کی مدح سرائی میں لکھتے رہتے۔ وہ غزل میں بھی ایسے ہی اشعار باندھنے لگے تھے۔ کربلا نجف کی بھی زیارت سے مشرف ہوئے۔ میر مہدی مجروح وفات ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء کو انتقال کر گئے۔ اور درگاہ قدم شریف میں سپردِ خاک ہوئے۔ اقبال نے بھی ان کا تذکرہ اپنے کلام میں کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدی مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
(کلیاتِ اُردو، ص۸۹)

ooo

جسٹس جاوید اقبال

فرزندِ اقبال، جاوید اقبال نے اپنے والدِ گرامی کے نقشِ قدم چلتے ہوئے عملی زندگی میں بھرپور جدوجہد کی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (۹ نومبر ۱۸۷۷ء۔۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء) اسلامی جذبوں کے عظیم شاعر تھے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری میں خودی اور نوجوانوں کو اہم جگہ دی۔ جاوید اقبال سے اُن کی محبّت لازوال رہی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی دوسری بیوی سردار بیگم ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو دنیا سے عالم بالا عازمِ سفر ہوئیں۔ جاوید اقبال ۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء اتوار بمطابق ۶ ربیع الاوّل ۱۳۴۳ھ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ صرف گیارہ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اُتر گیا۔ ۳۰/اگست ۱۹۳۰ء کو اُن کی بہن منیرہ اقبال پیدا ہوئیں۔ جسٹس جاوید اقبال کے بڑے بھائی آفتاب اقبال ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو پنڈ دادنخان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا ڈاکٹر شیخ عطا محمد سول سرجن تھے۔ آفتاب اقبال ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔ انھیں سخی حسن قبرستان کراچی میں دفن کیا گیا۔ دونوں بہن بھائی ماں کی شفقت کے بغیر محنت کرتے رہے۔ اُنھوں نے اُردو، انگریزی کی بہت سی اصناف پر کام کیا۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں اُن کی تحریروں کو خاص جگہ دی جاتی ہے۔ وہ انگریزی اور اُردو کے نہ صرف بہترین لکھاری تھے بل کہ شعلہ نوا مقرر بھی تھے۔ اُنھوں نے تحقیق، ڈرامہ نویسی، اقبالیات اور قانون میں اپنا بلند مقام پیدا کیا۔ جاوید اقبال، نے ۱۹۵۴ء میں انگریزی اور فلسفہ میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ طلائی تمغہ حاصل کر کے فلسفہ میں اپنے والد کی روایت کو برقرار رکھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یونی ورسٹی انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے اُنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کے بعد ۱۹۵۶ء میں بار ایٹ لاء ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ قانونی مہارت کی

وجہ سے انھوں نے ۱۹۶۰ء میں آسٹریا کے شہر کینبرا میں آئین کے حوالے سے منعقدہ ایک مذاکرہ میں شرکت کی۔ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کا تین مرتبہ اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۱ء میں امریکی حکومت کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے۔ کالجوں، یونی ورسٹیوں اور مختلف اداروں میں (اقوامِ متحدہ کا مستقبل) کے عنوان پر سیر حاصل لیکچر دیے۔ ۱۹۶۵ء ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور ۱۹۷۱ء لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۵/ اکتوبر ۱۹۸۶ء سے ۴/ اکتوبر ۱۹۸۹ء تک عدالتِ عظمیٰ پاکستان کے سینئر جسٹس کا عہدہ سنبھالا۔ ۸/ مارچ ۱۹۸۲ء تا ۵/ اکتوبر ۱۹۸۶ء لاہور میں عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس بھی رہے۔ اُنھیں بہترین خدمات کے اعتراف میں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا۔ عجب اتفاق ہے کہ وہ ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے اور ۳/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو انتقال کر گئے۔

جسٹس جاوید اقبال کی کتاب ''میراث قائداعظمؒ'' (۱۹۶۷ء) میں منظر عام پر آئی۔ اُنھوں نے انگلش میں علامہ اقبال کی نوٹ بکس ''Stray Reflections'' (۱۹۶۱ء) مرتب کر کے چھپوائی، جس کا اُردو ترجمہ افتخار احمد صدیقی نے کیا۔ آج بھی ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے لاتعداد ایڈیشن منظر عام آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی سوانح حیات ''زندہ رود'' تین جلدوں میں شائع کرنے کا اعزاز بھی جاوید اقبال کو حاصل ہے۔ آج کل یہ کتاب ایک جلد میں بھی دستیاب ہے۔ خطبات اقبال، تسہیل و تفہیم، رضیہ سلطانہ (ڈراما)، افکار اقبال (تشریحات جاوید)، اس کے علاوہ ڈرامے، افسانے اور مقالے ''جہان جاوید'' (دو جلدیں) (۲۰۰۴ء) کی شکل میں شائع ہوئے۔ اُنھوں نے ''افکارِ اقبال کی تشریحات جاوید'' (۲۰۰۵ء) اور مقالوں پر مشتمل ''مئے لالہ فام'' (۱۹۹۶ء) بھی لکھی۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' (۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئی جب کہ ۲۰۱۵ء میں معارف اشاعتی ادارے سنگِ میل نے ایک اضافہ شدہ ایڈیشن بھی شائع کیا۔ جس میں نادر تصاویر بھی شامل ہیں۔

جاوید اقبال، ڈاکٹر جسٹس

جاوید کے نام

خودی کے ساز میں ہے عُمرِ جاوداں کا سراغ!
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!

(کلیات اردو، ص ۷۰۴)

جاوید کے نام

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر!
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو!
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر!
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے!
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

(کلیات اردو، ص۴۳۹)

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
(کلیات اردو، ص۴۹۷)

جاوید سے

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربارِ شہنشہی سے خوشتر مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے انداز میں سب کے جادوانہ!
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک باقی ہے کہاں مئے شبانہ!
خالی ان سے ہوا دبستان تھی جن کی نگاہ تازیانہ!
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ!

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ!
شاخِ گل پر چہک و لیکن　　کر اپنی خودی میں آشیانہ!
وہ کبر ہے آدمی کہ جس کا　　ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ!
دہقان اگر نہ ہو تن آساں　　ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ!

غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہنراست و کار سازی ست

(کلیات اردو، ص ۵۴۸۔۵۴۹)

○○○

جسٹس شاہ دین ہمایوں

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ہم عصر احباب کے علاوہ اپنے پسندیدہ باصلاحیت افراد کو بھی فراموش نہیں کیا۔ اہلِ قانون سے اقبال کی یاد اللہ بہت زیادہ تھی۔ شاعروں وادیبوں کے علاوہ ان کا حلقہ اثر بہت زیادہ تھا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی محبوب شخصیات میں جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں کا نام سرفہرست ہے۔ ان کا نام تو میاں محمد شاہ دین تھا لیکن علمی وادبی ذوق کی وجہ سے وہ ہمایوں تخلّص کیا کرتے تھے۔ میاں محمد شاہ دین ہمایوں اپریل ۱۸۶۸ء کو لاہور کے علاقہ باغبان پورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلّق ایک ایسے معروف گھرانے سے تھا جو مغلیہ دور سے شالیمار باغ کے انتظامی امور انجام دیتا رہا۔ ان کے والد میاں نظام الدین اپنے عہد کے بزرگ شخص تھے اور دادا جان میاں قادر بخش فارسی اور عربی کے جید عالم اور صاحب ذوق انسان تھے۔ ان کے ذوقِ علمی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مغلیہ دور میں شاہی خاندان کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ شعروسخن سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ میاں قادر بخش ادبی ذوق کی وجہ سے نادر تخلّص رکھتے تھے۔ میاں شاہ دین ہمایوں نے ابتدائی تعلیم باغبانپورہ کے سکول میں حاصل کی۔ صرف چھ سال کی عمر میں قرآنِ کریم پڑھ لیا۔ مڈل کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ میٹرک کے امتحان میں نہ صرف نمایاں کامیابی حاصل کی بل کہ انگریزی مضمون میں پنجاب بھر کا ریکارڈ توڑتے ہوئے اوّل پوزیشن حاصل کی۔ ایف اے اور بی اے پنجاب یونیورسٹی سے مکمّل کیے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ بار ایٹ لاء مکمّل کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہر چند میاں شاہ دین سے نو سال چھوٹے تھے لیکن صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کا شمار ذہین لوگوں میں ہوتا تھا۔ دونوں ہی بیرسٹر تھے۔ میاں شاہ دین ہمایوں نے کچھ عرصہ تو لاء پریکٹس کی اور پھر پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن بن گئے۔ میاں شاہ دین لاہور ہائی کوٹ کے پہلے جسٹس مقرر ہوئے اور پھر چیف جسٹس کے عہدے تک خدمات انجام دیتے رہے۔ میاں شاہ دین ہمایوں کی کتاب دوستی ضرب المثل رہی۔ سفر زیست میں کتابوں کو دوستوں سے زیادہ اہمیت دیتے رہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال ان کی علمی، ادبی اور قانونی صلاحیتوں کے معترف رہے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ زندگی کے بہت سے لاتعداد مسائل کے باوجود کتابوں سے گہرا لگاؤ ان کی زندگی کا ایک سرمایہ ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں بیماری کا شکار رہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے وہ ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے ان کی شخصیت، خوبیوں کے اعتراف میں ایک نظم سپردِ قلم کی ہے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو:

نظم: ہمایوں

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و درد مند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند
کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلہ گردوں نورِ داک مشتِ خاکستر میں تھا
موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامہ فردا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبح دوامِ زندگی

(کلیات اردو: ص ۲۵۴)

○○○

شیخ سر عبدالقادر

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی خوبیوں کا ادراک کرنے والوں میں شیخ سر عبدالقادر صف اول میں شامل رہے۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ اقبال امت مسلمہ کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو شعور کی دولت سے مالا مال کر سکتے ہیں۔ نیز خوابیدہ مسلمانوں میں آزادی کی روح بیدار کرنے کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر کا گمان اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کی عروقِ مردہ میں خون زندگی دوڑا دیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اپنے محسن شیخ سر عبدالقادر کی بہت قدر کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' کا دیباچہ لکھوانے کے لیے سر عبدالقادر انتخاب کر کے ان کی صلاحیتوں پر مہر ثبت کر دی۔ گونا گوں صلاحیتوں سے مزین شیخ سر عبدالقادر ۱۸۷۴ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔

۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں مسلمانان ہند کے پہلے انگریزی اخبار ''آبزرور'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اسی دوران سر عبدالقادر نے اردو ادب کی آبیاری کے لیے ایک ادبی پرچہ ''مخزن'' کا بھی اجراء کیا۔ ''مخزن'' اپنے دور کا ایک نہایت معیاری اور علمی و ادبی پرچہ تھا جس میں اس وقت کے تمام بڑے ادباء و شعراء کی نگارشات شائع ہو رہی تھیں۔ اقبال کا بھی ابتدائی کلام بھی ''مخزن'' کی زینت بنتا رہا۔ ''مخزن'' کے پہلے پرچے میں علامہ محمد اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شائع ہوئی تو لوگوں اور ادباء و شعراء کی بڑی تعداد نے اس کو سراہا۔ ۱۹۰۴ء میں بار ایٹ لاء کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ دو سال بعد لاء کی تعلیم مکمل کر کے لاہور آ گئے اور پریکٹس شروع کر دی۔

شیخ سر عبدالقادر اپنی زندگی میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج تعینات ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں پنجاب اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنز کے اجلاس منعقدہ جینوا میں شرکت کی۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں دوبارہ ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لندن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور پھر ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر ۱۹۴۲ء میں بہاول پور ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اس عہدے سے ریٹائرڈ ہو کر لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ ایک عرصہ تک انجمن حمایتِ اسلام کے صدر بھی رہے۔ آپ نے ملی وقومی مسائل اور خصوصاً اردو زبان کے حوالے متعدد مضامین لکھے۔ آپ کے دو سفرنامے بھی منظر عام پر آئے جن میں ''دربارِ خلافت'' اور ''سفرنامہ یورپ'' شامل ہیں۔ ''دربار خلافت'' ان کا ترکی کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے ترکی کے سفر کی روداد اور وہاں کے حالات وواقعات کو نہایت جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب شیخ عبدالقادر بار ایٹ لاء کے لیے انگلستان گئے تو وہاں علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اپنی انہی ملاقاتوں کے حوالے سے عبدالقادر کا کہنا ہے:

> ''جو دو سال میرے اور اقبال کے انگلستان میں مشترک گزرے وہ بہت دلچسپ تھے گو وہ کیمبرج میں رہے اور میں لندن میں تھا مگر ان سے ملنے کے لیے بہت سے موقع ملتے رہے جب اقبال لندن آئے تو بیرسٹری کے لیکچروں یا کھانوں کے لیے ہم مل جایا کرتے تھے بعض علمی مجالس میں بھی اکٹھے شریک ہوتے تھے میں جب آخری مرتبہ کیمبرج گیا تو میرے ایک دوست نے میری چائے کی دعوت کی۔ ہم سب دریائے کیم کے کنارے جس سے کیمبرج کا نام بنا ہے۔ سیر کے لیے گئے ایک خاتون کے پاس کیمرہ تھا۔ وہ ہماری تصویریں لینے لگی مجمع کیمرے کے سامنے ترتیب پا رہا تھا کہ روشنی نے دھوکا دیا۔ اور آفتاب نے بادل کا نقاب منہ پر ڈال لیا۔ یوں تو دھوپ چھاؤں بدلتے رہتے ہیں لیکن مشرقی ملکوں میں تو پھر بھی برسات کے سوا ان کا کچھ ٹھکانہ ہوتا ہے مگر انگلستان میں آفتاب اکثر نایاب ہوتا ہے کسی دن صبح کی شکل دکھاتا ہے تو شام کو نادر اور کسی دن شام کو ذرا سی جھلک دکھاتا ہے تو صبح کو غائب جس دن پورا وقت حاضر ہے وہ دن گویا جشن کا دن ہے۔ آفتاب کو منہ چھپاتے دیکھ کر اقبال نے فی البدیہہ مصرعے موزوں کیے۔

ماہ روئے بر لب جوئی کشد تصویر ما
منتظر باشیم ماتا آفتاب ایدیروں

یہ مجھے یاد نہیں کہ آفتاب پھر نکلا اور خاتون تصویر کھینچ سکی یا نہیں مجھے پروگرام کے مطابق اقبال سے ایک سال پہلے انگلستان چھوڑنا پڑا۔ وہ میرے بعد آئے۔"

شیخ عبدالقادر نے ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۳۴ میں لندن جا کر رہائش اختیار کر لی مگر وہ ۱۹۳۷ء کو ایک مرتبہ علامہ محمد اقبال سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ اس وقت علامہ اقبال کافی علیل تھے یہ ان کی علامہ سے آخری ملاقات تھی۔ علامہ اقبال کی وفات کی خبر انہیں لندن میں ہی ملی تھی۔ اس دوران ۱۹۴۲ء کو ریاست بہاول پور نے ان کی خدمات حاصل کیں اور ان کو ہائی کورٹ بہاولپور کا چیف جج مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں سبکدوشی کے بعد لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شیخ سر عبدالقادر نے قیام پاکستان کے تین سال بعد یعنی ۹ فروری ۱۹۵۰ کو انتقال کیا۔ علامہ محمد اقبال اور شیخ عبدالقادر کے درمیان گہرے مراسم تھے۔

عبدالقادر سر شیخ

اٹھ کے ظلمت ہوئی افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ ترازِ خونِ زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر — قطرہ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز — جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ — چیر کے سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزمِ گہ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں
ہر چہ درد دل گزرو وقفِ زباں دارد شمع — سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

○○○

سرحمیداللہ خان

علامہ محمد اقبال بڑے اعلیٰ ظرف کے مالک تھے۔ان کی یہ خوبی تھی کہ دوسروں کے دامن پر ہمیشہ خوشبوئیں چھڑکتے رہتے تھے جس سے ان کی اپنی سانسیں عطر بیز ہو جاتی تھیں۔دوستوں کی خوبیوں کو بیان کرنے میں ہمیشہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے۔اگر کوئی شخصیت تحریک پاکستان سے وابستہ ہوتو اس کی تعریف و توصیف میں ایسے رطب اللسان ہوتے ہیں زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہ رکھتے۔نواب حمیداللہ خان بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جن کے بارے میں اقبال نے منظوم ہدیہ تحسین پیش کیا ہے۔ریاست بھوپال کی چوتھی اور آخری خاتون حکمران نواب سلطان جہاں بیگم کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ان کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا گیا جہاں سے وہ بی اے کرنے کے بعد بھوپال واپس لوٹ آئے اور سیاسی اور مذہبی راہنماؤں سے میل ملاپ بڑھا ان کے سیاسی و سماجی کاموں سے اقبال آگاہ ہوئے ۱۹۲۷ء میں وہ بھوپال ریاست پر تخت نشین ہوئے۔انھوں نے علم و ادب کی خوب سرپرستی کی۔دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب اقبال بھوپال آئے تو وہ پہلے حمیداللہ خان سے ملے اور تادیر مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اصلاح و مشورے کرتے رہے۔اس کے بعد بھی علامہ محمد اقبال جب بھی بھوپال جاتے تو نواب حمیداللہ خان ان کے قیام و طعام کا بہت عمدہ انتظامات کرتے۔کبھی شیش محل اور کبھی ریاض منزل میں ان کے شاہی انداز میں رہائش فراہم کی جاتی رہیں۔حمیداللہ خان جانتے تھے کہ علامہ محمد اقبال ہی ایک ایسے رہنما ہیں جو مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکال سکتے ہیں اور ان کی صحیح معنوں میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔قرآن

وسنت پر عمل پیرا ہو کر کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حوالے اقبال نے ایک کتاب ''قرآن اور عصر حاضر'' لکھنے کا ارادہ کیا جس پر نواب حمید اللہ خان نے بھی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا جس کے باعث ا ن کا گھرانہ کئی طرح کے مسائل سے دو چار ہو گیا بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسری طرف مالی مسائل نے بھی آن گھیرا۔ انھوں نے اس دکھ اور کرب کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا:

> ''اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا، مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا موقع میسر ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔ بہر حال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے''

نواب حمید اللہ خان جب علامہ اقبال کے حالات سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے اقبال کے لیے لائف پنشن پانچ سو روپے ماہوار مقرر کر دی تا کہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام بہتر انداز میں بسر کر سکیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد علامہ اقبال کی کتاب ''ضربِ کلیم'' منظر عام پر آئی تو اس کا انتساب چند اشعار کی صورت میں حمید اللہ خان کے نام کیا۔ نواب صاحب ۲۱ فروری ۱۹۶۰ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔

زمانہ با اممِ ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحبِ نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشہ تو مے داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

(کلیاتِ اردو۔ ص ۴۷۱)

○○○

مرزا اسد اللہ خان غالب

اُردو ادب میں انسانی جذبوں کے شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب ہیں جب کہ اسلامی جذبوں کے شاعر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہیں۔ کئی ادبی حلقوں میں یہ بحث جاری رہتی ہے کہ شاعرانہ میدان میں کس کا پلڑا بھاری ہے؟ محققین اور ناقدین نے دونوں شعراء کرام کو فنی اعتبار سے عظمت عطا کی ہے۔ آگرہ صرف اپنے تاج محل کی وجہ سے ہی مقبول نہیں بل کہ یہ وہ شہر ہے جہاں شہنشاہِ شاعری مرزا اسد اللہ خان غالب نے جنم لیا۔ مرزا اسد اللہ غالب کو مرزا نوشہ بھی کہا جاتا ہے وہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء بمقام اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام عبداللہ بیگ تھا جو ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سمرقند سے ہجرت کر کے ہندوستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مرزا غالب کے والد ممتاز فوجی افسر تھے۔ غالب پانچ سال کے تھے کہ اُن کے والد راج گڑھ کی جنگ میں گولی لگنے سے انتقال کر گئے۔ غالب کی پرورش کا بار ان کے چچا نصر اللہ بیگ کے کندھوں پر آن پڑا مگر چار سال بعد ۱۸۰۶ء میں ان کے چچا ہاتھی سے گر کر وفات پا گئے اور غالب اپنے نانا خواجہ غلام حسین کے پاس آ گئے۔ یہاں ان کو ہر طرح کی آسائش حاصل تھی عیش ونشاط کے اس زمانے کی یاد ان کو تمام عمر ستاتی رہی کیوں کہ پھر کبھی یہ عیش نصیب نہ ہو سکی۔ یہاں غالب کی تعلیم و تربیت کا بہت اچھا انتظام تھا۔ غالب کے اساتذہ میں مولوی معظم علی، نظیر اکبر آبادی، اور ملا عبدالصمد کا نام لیا جاتا ہے۔ غالب نے ان اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔

تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کر دی گئی۔ غالب کی شادی چوں کہ دہلی ہوئی تھی اس لیے انھوں نے دہلی میں مستقل طور پر سکونت

اختیار کرلی۔ دہلی میں اس وقت بڑے اہلِ علم حضرات رہتے تھے۔ شعروشاعری کا چرچا تھا غالب اس معاشرے کے ایک اہم فرد بن گئے۔

غالب کی آمدنی اس دور کے لحاظ سے بہت معقول تھی لیکن وہ اپنی فضول خرچی کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ غالب مالی طور پر ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ' دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب دیا اور شاہان تیمور کی تاریخ لکھنے پر ۵۰ روپے ماہوار پر ما مور کیا۔ دوست احباب بھی غالب کی کافی مدد کرتے تھے۔

۱۹/اکتوبر ۱۸۵۷ء میں غالب کے بھائی مرزا یوسف بیگ کا انتقال انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہوا۔ یہ صدمہ غالب سے برداشت نہ ہوسکا۔ اور ۱۸۵۷ء کے حالات نے ان کو مزید سوگوار بنا دیا اور بالآخر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور نظام الدین اولیاء کے مزار کے صحن میں دفن ہوئے۔ دیوان اردو' دیوان فارسی' پنج آہنگ' مہر نیمروز' لطائف غیبی' قادر نامہ غالب' عود ہندی' اردوئے معلیٰ' سبد چین وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

مرزا غالبؔ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ انھیں اپنے فارسی کلام پر بہت ناز تھا لیکن اتفاق زمانہ دیکھیے کہ جو شہرت انھیں اپنے اردو کے مختصر دیوان کے باعث ہوئی وہ فارسی زبان سے نصیب نہ ہوسکی۔ ذیل میں ہم غالبؔ کی اردو شاعری کی خصوصیات کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ ان خصوصیات کو ہم دو عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف۔ امتیازی خصوصیات　　　　ب۔ ثانوی خصوصیات

غزل الفاظ و معانی کی حسین آمیزش سے ترکیب پاتی ہے۔ الفاظ غزل کا ظاہری لباس ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غزل کی ہیئت الفاظ سے تشکیل پاتی ہے۔ اچھی غزل ساخت کے اعتبار سے متناسب الاعضاء ہوتی ہے۔ الفاظ کے حسن وخوبی کی اہمیت غزل میں مسلم ہے۔ ان میں ایک خاص قسم کی موسیقی کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔ اس اعتبار سے غالبؔ کی ہر غزل مکمل و اکمل ہے۔ ان کی غزل کا مرکزی جذبہ عموماً ساری غزل پر جاری وساری رہتا ہے۔ وہ ایسے الفاظ اور ردیفیں استعمال کرتے ہیں جو مرکزی خیال کی شیرازہ بندی کرتی ہیں۔

غالبؔ کا فلسفۂ غم حکیمانہ انداز کا حامل ہے۔ ان کے غم میں نشاط اور مستی ہے۔ غم زندگی کا ایک جزو عظیم ہے۔ غم زندگی کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ غالب کا فلسفۂ غم زندگی کا صحیح ترجمان ہے یہ غم

فطرتِ انسانی کا ایک حصہ ہے جو اسے عظمت عطا کرتا ہے۔ میرؔ کا غم ایک فریاد ہے جو چبھتا ضرور ہے لیکن زندگی کو ابھارتا نہیں۔

غالب نے اپنی غزل کے ایک ایک شعر میں استعارے، کنائے، تمثیل، ایجاز، اختصار اور بلاغت کا ہر جوہر یوں سمو کر رکھ دیا ہے کہ کوزے میں سمندر کا گمان ہوتا ہے۔ ایک ایک شعر میں وسیع معانی پوشیدہ ہیں اور الفاظ کم سے کم استعمال ہوئے ہیں تاثیر میں ایمائی کیفیت اپنے عروج پر ہے۔ اکثر ناقدینِ سخن کا خیال ہے کہ غالبؔ ایک فلسفی شاعر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کی نظر میں فلسفیانہ گہرائیاں اور حکیمانہ باریکیاں ہیں لیکن غالبؔ ان معنوں میں فلسفی نہیں جن معنوں میں ہم اقبال کو فلسفی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان کا کوئی منظم مربوط اور مستقل فلسفہ نہیں۔ ان کے کلام میں پیغام بھی ہیں لیکن یہ پیغام بھی ان معنوں میں پیغام نہیں جو ہمیں اقبال کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ غالب فطرت انسانی کے رموز و اسرار سے پورے پورے واقف ہیں وہ قلبِ انسان کی عمیق ترین گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ تجرباتِ انسانی کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا احساس تیز اور ان کی قوتِ مشاہدہ بہت باریک بین ہے۔ وہ کیفیات ذہنی و قلبی کے تحلیل و تجزیے میں ایک ماہرِ نفسیات نظر آتے ہیں۔

مرزا اسداللہ خان غالب نہ صرف ایک منفرد شاعر تھے بل کہ اردو نثر میں بھی وہ ایک خاص اسلوب کے بانی تھے۔ غالب کے خطوط اردو نثر کے ارتقاء میں ایک سنگ میل بل کہ مینارہ روشنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط نے اردو نثر کو ایک درخشاں مستقبل عطا کیا۔ غالب کے خطوط کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہ تھے۔ یہ غالبؔ کی جدت پسند طبیعت تھی کہ بے ساختہ تخلیق پر آمادہ ہوئی اور خطوط غالب کی سادہ رنگین نثر اردو زبان و ادب کو بخشی گئی۔

ڈاکٹر علامہ اقبال ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے جب کہ غالب ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اقبال نے کلام غالب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبال بھی دوسرے شعرا کرام کی طرح مرزا غالب کے معترف رہے۔ انھوں نے ان کے فکر و فن کو ہدیہ تحسین پیش کرنے کے لیے خصوصی اہتمام کیا۔

نظم: مرزا اسداللہ خان غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مُرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو ، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سوناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ دیمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلِ سوزیٔ پروانہ ہے

اے جہانِ آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرے ذرے ہیں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

(کلیاتِ اردو۔ص۲۶۔۲۷)

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں (کلیاتِ اردو۔ص۸۹)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا (کلیاتِ اردو۔ص۲۸۵)

میرزا غالب خدا بخشے ، بجا فرما گئے
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟ (کلیاتِ اردو۔ص۲۸۷)

ooo

زُہیر (عرب شاعر)

قبل اسلام کا ایک مشہور شاعر۔ عرب نقادوں نے اسے عظیم شعراء میں شمار کیا ہے۔ زہیر نام کے عرب میں کئی شاعر ہوئے ہیں لیکن یہ زہیر ابن ابوسلمٰی ہے۔ زُہیر کے خاندان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے کئی افراد شاعر ہوئے ہیں خاص طور پر زُہیر کا سگا باپ ابوسلمٰی، ربیعہ بن ریاح، سوتیلا باپ اوس بن حجر، ماموں بشامہ بن الغدیر، سُلمٰی اور الخنسا دونوں بہنیں، کعبؓ اور بجیرؓ دونوں بیٹے عقبہ بن کعب المضرب پوتا اور العوام بن عقبہ پڑپوتا۔ تمام شاعر تھے۔ کعبؓ بن زہیر کا نام تاریخ نعت میں قصیدہ ''بانت سعاد'' کے سبب روشن ہوا جو حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں گزرانا گیا اور جس کے صلے میں حضور ﷺ نے کعبؓ کا قصور معاف فرماتے ہوئے اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔

زہیر کے باپ ابوسلمٰی ایک موقع پر ناراض ہو کر اپنے قبیلے بنومزینہ سے چلے گئے اور بنوغطفان کے علاقے میں رہنے لگے اور پھر اسی قبیلہ کی ایک خاتون سے شادی کر لی چنانچہ زہیر نے وہیں جنم لیا یہی وجہ ہے کہ زہیر نے بنومزینہ سے زیادہ بنوغطفان کے ساتھ جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ بنوغطفان کے سرداروں کی مدحیں بھی ملتی ہیں۔

زہیر نے اوس بن حجر اور بشامہ بن الغدیر سے بہت کچھ حاصل کیا۔ زہیر کے شعروں میں رعنائی اور حسن ان دونوں شعراء سے اکتساب فیض کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خورشید رضوی لکھتے ہیں......

''اوس بن حجر کے علاوہ زہیر نے اپنے ماموں بشامہ بن الغدیر کی بھی خوشہ چینی کی۔ بشامہ جو اپاہج اور لاولد تھا، ایک اچھا شاعر اور بڑا بیدار مغز آدمی تھا۔ بنوغطفان اپنی عسکری

مہمات کی منصوبہ بندی اسی کے مشورے سے کرتے تھے اور مال غنیمت میں سے اسے بھاری حصہ دیتے تھے۔ چنانچہ بشامہ خاصا مال دار ہوگیا۔ زہیر اس کی شاعری کے بہت متاثر تھا اور اکثر اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ روایت ہے کہ مرتے وقت بشامہ نے اپنا مال اپنے اقرباء میں تقسیم کرنا شروع کیا تو زہیر بھی اپنے حصے کا طالب ہوا اس پر بشامہ نے کہا ...... ''بھانجے بہترین اور سب سے وافر مال تو میں نے تمہی کو دیا ہے۔'' پوچھا ''وہ کیا؟'' کہا ''شعر، جس میں تم میرے وارث ہو۔''

زہیر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی کی مداح نہ لکھتا اور نہ ہی کسی کے خلاف ہجو کہتا تھا۔ مدح وستائش میں بہت احتیاط سے کام لیتا تھا اس کے اس فعل کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ وہ جس کسی کی مدح کرتا ہے انہی اوصاف کی بنا پر کرتا ہے جو فی الواقع اس میں پائے جات ہیں۔ زہیر حضرت عمرؓ کے بھی پسندیدہ شاعر تھے۔ زہیر نے ایک سو سترہ برس عمر پائی اور بعثت کے ایک سال قبل وفات پا گیا۔ یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ زہیر نے پایانِ عمر میں یہ خواب دیکھا کہ ایک شخص اس کے پاس آیا اور اسے اٹھا کر آسمان کی طرف لے چلا۔ قریب تھا کہ وہ آسمان کو چھو لے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ زمین پر آن پڑا۔ مرتے وقت زہیر نے یہ خواب اپنے بیٹے کعبؓ سے بیان کیا اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد کوئی آسمانی خبر رونما ہوگی اگر ایسا ہو تو تم اس سے منسلک ہونا اور اس کی طرف جلدی کرنا اس نے اپنے بچوں کو ہدایت کی کہ آپ ﷺ کے ظہور کے وقت آپ۔ پر ایمان لائیں۔

چشم خاصانِ عرب گردیدہ کور
برنیائی اے زُہیر از خاک گور
(کلیات فارسی، ص ۶۴۳)

ooo

داغ دہلوی

نواب مرزا خان نام جب کہ داغؔ تخلص تھا۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نواب شمس الدین خان تھا۔ داغ ابھی سات برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے مرزا محمد سلطان ولی عہد شاہ دہلی سے شادی کر لی۔ ان کی والدہ کو شوکت محل بیگم کا خطاب ملا۔ داغؔ بھی والدہ کے ساتھ قلعہ معلیٰ چلے گئے اور وہیں تربیت پائی۔ داغ نے فارسی کی ابتدائی کتابیں غیاث الدین مؤلف ''غیاث اللغات'' سے پڑھیں۔ اپنے عہد کے مشہور خوش نویسوں سے خوشنویسی کا فن سیکھا۔ شاعری میں داغؔ، ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔

۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال اور ۱۸۵۷ء میں غدر برپا ہونے سے شاہی محفلیں اجڑ گئیں۔ لہٰذا داغؔ دہلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے۔ نواب یوسف علی رام پور کے حکمران تھے داغؔ ان کے مہمان ہوئے۔ نواب یوسف علی خان کی وفات کے بعد نواب کلب علی خان نے داغ کی بہت قدردانی کی اور انھیں اپنا مصاحب بنالیا۔ نواب موصوف کے ہمراہ داغؔ کو حج کا شرف حاصل ہوا۔

۱۸۸۲ء میں داغؔ نے کلکتہ کا سفر کیا۔ کلکتے کے قیام کے دوران ان کا ایک طوائف منی بائی حجاب سے بڑا زوردار عشق رہا۔ مثنوی ''فریادِ داغؔ'' اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ اس وقت داغؔ کی عمر پچاس سال تھی۔ اس واقعہ سے ہی داغ کی رنگینیٔ مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خان کی وفات پر رام پور سے جی اچاٹ ہوگیا۔ لہٰذا داغؔ مختلف جگہوں پر پھرتے پھراتے بالآخر ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد پہنچے اور نظام دکن کے استاد مقرر ہوئے۔ یہاں پہلے ایک ہزار اور پھر ڈیڑھ ہزار ماہانہ وظیفہ پانے لگے۔ دبیر الدولہ فصیح الملک نواب ناظم جنگ بہادر وغیرہ کے

خطابات بھی داغ کو اسی زمانے میں ملے۔ آخری عمر حیدر آباد دکن میں بسر ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں یہیں وفات پائی۔

داغؔ کا تعلق جس طبقہ سے تھا وہ ہندوستان کا خوش حال اور فارغ البال طبقہ تھا جس کی زندگی کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ کے اصول کے تحت تھی اور یہ زمانہ بھی شعر و شباب اور چنگ و رباب کے لیے موزوں تھا داغ کی شخصیت پر اس زمانے کا گہرا اثر ہے۔ وہ بڑے خوش باش، خوش خوراک اور خوش مزاج انسان تھے حسن و جمال کے پرستار ہی نہیں بل کہ ان کے طلب گار بھی تھے۔

داغؔ کے شاگردوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مشہور شعراء سائل دہلوی، جگر مراد آبادی، اشک دہلوی، نوح ناروی، سیماب اکبر آبادی، بے خود دہلوی، اور احسن مارہروی کے علاوہ علامہ محمد اقبال ان کے شاگرد تھے۔ علامہ اقبال کی شاگردی پر داغ کو بڑا فخر تھا۔

ان کی تصانیف مثنوی ''فریاد داغ'' کے علاوہ داغ کے چار دیوان گلزار داغؔ، آفتاب داغؔ، مہتاب داغؔ، اور یادگار داغؔ، ان کی غزلیات پر مشتمل ہیں۔ داغ نے اردو زبان کے گہوارے یعنی دہلی میں پرورش پائی تھی اس لیے زبان و بیان کی تمام تر خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ روزمرہ محاورہ اور زبان کی صفائی کے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہیں ہے۔

نظم۔ داغؔ

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا، سارا چمن ماتم میں ہے
شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

بلبلِ دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

چل بسا وہ آہ میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے ہم

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے تبخانے سے
مئے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیرچ

اشک کے دامن زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روائے خاکِ دلی، داغ کو روتا ہوں میں

اے جہانِ آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

(کلیاتِ اردو۔ص۸۹۔۹۰)

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

(کلیاتِ اردو۔ص۸۹۔۹۰)

○○○

امیر مینائی

اصل نام احمد امیر مینائی ہے جب کہ دنیائے ادب میں امیر مینائی کے نام سے معروف ہوئے۔ ۱۸۲۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت مخدوم شاہ مینا سے ملتا ہے اس لیے ''مینائی'' کہلاتے ہیں۔ اپنے نام کے حوالے سے ان کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے:

نام کا نام، تخلّص کا تخلّص ہے امیر
ایک یہ وصف خدادادمرے نام میں ہے

مغلیہ دور میں لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ امیر مینائی کے والد مولوی کرم محمد مینائی لکھنؤ کے مذہبی سکالر اور ممتاز صوفی شخصیت کے حامل تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا کا مزار آج بھی لوگوں کے لیے توجہ کا مرکز ہے۔ اس مرکز کے گرد و نواح میں مینا بازار اور محلّہ مینا نین مقبولیت کے حامل ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور بعد میں مفتی سعد اللہ اور فرنگی محل کے جید علما سے حاصل کی۔ ان دنوں لکھنؤ میں شعر و شاعری کا سلسلہ عروج پر تھا۔ وہ ابھی نو برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا بڑے بھائی نے پرورش کی۔ مفتی سعد اللہ اور فرنگی محل کے علماء سے درسی کتب کی تحصیل کی۔ عربی و فارسی میں دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے مظفّر علی اسیر کی شاگردی اختیار کی اور اسی کے توسط سے واجد علی شاہ کے دربار تک رسائی پائی۔ جنگ آزادی کے بعد انھیں رام پور بلا لیا گیا۔ وہاں کے والیان ریاست کی سرپرستی اور قدر دانی میں فراغت و خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ نواب یوسف علی خان عدلیہ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی امیر مینائی کی خدمات حاصل کیں۔ امیر مینائی ۱۹۰۰ء تک رام پور میں مقیم رہے۔ آخر عمر میں نظام کی طلبی پر حیدر آباد کا سفر کیا۔

امیر مینائی نے قریب قریب تمام اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔فارسی اور اردو پر دسترس کی وجہ سے انھیں صوفی ازم اور مترجم کی حیثیت میں شہرت حاصل ہوئی۔تاریخ ، مذہب ،موسیقی ، فلاسفی ،ریاضی ،جغرافیہ،منطق ،قانون ،ادویات ایسے علوم کے مطالعہ نے امیر مینائی کو ایک کامیاب تخلیق کار بنادیا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو اور فارسی میں کم از کم پچاس کتابیں لکھیں جن میں سے بہت سی منظر عام پر نہ آسکیں۔غزلوں کے دو دیوان ''مراۃ الغیب'' اور ''صنم خانہ عشق'' ہیں۔ایک دیوان میں لغت اور واسوخت ،قصیدے اور مثنویاں موجود ہیں۔انھوں نے ایک اردو لغت ''امیر اللغات'' کی تالیف شروع کی تھی لیکن وہ لغت مکمل نہ ہوسکی۔ان کی ایک اور اہم تصنیف ''انتخاب یادگار'' ہے جس میں رامپور کے شاعروں کا کلام اور مختصر حالات درج ہیں۔سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد والی پور کے ہاں زندگی عزت و وقار سے گزاری۔حیات مستعار کے آخری برس نظام دکن کے ہاں حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں انتقال کر گئے۔

امیر مینائی ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے۔ان کے کلام میں بڑا تنوع ہے اور ان کے بہت سے شعر زبان زد عام ہو کر ضرب الامثال کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔حمد اور نعت نہایت عمدہ کہتے تھے حمد و نعت کے ۲۵ مجموعے ان کا تخلیقی سرمایہ ہیں۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیرؔ
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیرؔ
(کلیات اردو......ص۸۹)

ooo

سرسیداحمد خان

محسن علم وادب، دوقومی نظریہ کے محرک، انشائی خدوخال کے بانی، تحریک علی گڑھ کے سپہ سالار اور اردو زبان کے قائد حریت سرسید احمد خان کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا۔ برعظیم پاک و ہند میں خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ ہرات سے ہجرت کر کے شاہ جہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور دہلی میں آباد ہوئے۔ اُن کے والد سید متقی پرہیز گار اور قانع انسان تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے انھیں جوادالدولہ کا خطاب دیا، جو بعد میں سرسید کو ملا۔ ان کی والدہ ایک پڑھی لکھی روشن خیال خاتون تھیں۔ سرسید احمد خان کی تعلیم وتربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ سرسید احمد خان کی ابتدائی تربیت ننھیال میں ہوئی۔ ننھیال کے ماحول نے اِن پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ شروع ہی سے انتہائی ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر اور مکتب میں ہوئی۔ فارسی، عربی اور اسلامیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے والد محترم نے چاہا کہ وہ کوئی کام سیکھ لیں لیکن انھوں نے زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر اصرار کیا' والد مان گئے۔ انھوں نے فارسی اور عربی کو اعلیٰ تعلیم پائی لیکن ابھی وہ انیس برس ہی کے تھے کہ والد اللہ کو پیارے ہوگئے اور سرسید کو عملی زندگی میں قدم رکھنا پڑا۔

انیس سال کی عمر میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں معمولی سے ملازم ہوگئے۔ اپنی خداداد قابلیت سے منصفی کا امتحان پاس کیا اور منصف کے عہدہ ءجلیلہ پر فائز ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء میں برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے چاہا کہ انگریزی استعمار کا جوا اپنی گردن سے اتار ڈالیں۔

ان دنوں سر سید احمد خان بجنور میں تھے۔ آزادی کی جنگ میں جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ غیر ذمہ دار انسانوں پر خون سوار ہو گیا اور وہ جذبۂ انتقام کی مجنونانہ حرکات میں حد سے باہر نکل گئے۔ انگریزوں نے بچوں اور عورتوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بجنور کے انگریز خاندانوں کو پناہ دی۔ اپنی جان پر کھیل کر ان کی جانیں بچائیں۔ ان کا یہ انسانیت نواز کارنامہ مسلمانوں کے بہت کام آیا۔ بعد ازاں انھوں نے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو پھانسی کے پھندے سے بچایا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی یہ جنگ کامیاب نہ ہوگی کیوں کہ انھیں کوئی عظیم رہنما میسر نہ تھا اور جنگ کے خاتمے پر ''اسبابِ بغاوت ہند'' جیسی مشہور و معروف کتاب لکھی۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ جنگِ آزادی کے ذمہ دار انگریز ہیں۔ مسلمان نہیں کیوں کہ ان کی مسلسل ناانصافیوں سے مسلمان قعرِ مذلت میں گر گئے تھے۔

مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور تعلیمی اصلاح کے لیے سر سید کے کام کا آغاز ملازمت کے زمانے ہی سے ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں انھوں نے ایک اسکول مراد آباد میں قائم کیا۔ اس کے بعد غازی پور میں وکٹوریہ اسکول بنایا۔ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کی نگرانی میں بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ لندن سے واپسی ۱۸۶۹ء میں سر سید نے تحریک علی گڑھ کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' نکالا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں اینگلو اورینٹل اسکول قائم کیا جسے بعد میں کالج اور پھر یونی ورسٹی کا درجہ ملا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد سر سید کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کی فلاح و بہبود کی نذر ہو گیا۔ سر سید نے اسی سال کی عمر پائی اور مرتے دم تک کوئی ساعت ایسی نہ گزری جب وہ کام سے غافل ہوئے ہوں۔ اُنھوں نے ۱۷ مارچ ۱۸۹۷ء کو وفات پائی۔ ان کی تصانیف میں آثار الصنادید' اسباب بغاوت مسلمانان ہند' خطباتِ احمدیہ' تبئین الکلام اور تہذیب الاخلاق وغیرہ شامل ہیں۔

اُردو نثر میں سر سید سب سے پہلے مقالہ نگار ہیں۔ مقالہ نگاری ایک خاص طرزِ تحریر کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس طرزِ تحریر میں ادیبانہ شان سے زیادہ منطقی انداز کی اہمیت مسلم ہے۔ مقالہ نگاری قوتِ مشاہدہ اور قوتِ استدلال دونوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ سر سید کے پاس یہ دونوں قوتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر مقالے لکھے۔ سیاسی اقتصادی' سائنسی' مذہبی' اصلاحی غرض کوئی ایسا موضوع نہ تھا جن پر انھوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو اور لطف یہ ہے کہ ہر موضوع

کے مطابق زبان استعمال کی۔ اپنے موضوع کی منطق کے اصولوں کے مطابق لکھنے کی سعی کی۔ صحیح استدلال کے لیے صحیح زبان برتی اور اس طرح انھوں نے نثر کو متانت اور سنجیدگی کا شاہکار بنا دیا۔ مضمون میں دل چسپی کو برقرار رکھنا' ان کے اندازِ بیان کا خاص کمال ہے وہ بیان میں الجھاؤ اور پیچیدگی بھی بہت کم آنے دیتے ہیں۔ سرسید کے کچھ مضامین ادبی مضمون نگاری کی صف میں بھی آجاتے ہیں۔ ان مضامیں میں ادبی حسن موجود ہے لیکن قافیہ اور ردیف بالکل صحیح نہیں۔ صنائع بدائع سے بھی پاک' تاہم دلچسپی کے لحاظ سے یہ مضامین اپنے اندر ادبی چاشنی رکھتے ہیں۔ کچھ نقاد ان مضامین کو انشائیہ نگاری کے اولین نمونے قرار دیتے ہیں لیکن اگر انھیں انشائیہ نگاری کے اصولوں پر پرکھا جائے تو ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہین کہ ان میں ہلکے پھلکے مضامین کی کچھ صفات ضرور موجود ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں انشائیے نہیں ہیں۔

سرسید کی نثر کی ایک اور خوبی جوشِ بیان ہے چوں کہ وہ مصلح اور رہنما تھے اس لیے ان کے لہجے میں خطیبانہ شان کا پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ ان کے انداز میں زور بیان ہے۔ استدلالی مضامین میں دلائل بڑے اثر انگیز' اور نتیجہ خیز ہیں۔ بعض مضامین جن میں انھوں نے مخالفین کی تنقید و تنقیص کا جواب دیا ہے' طنز و استہزا کا شاہکار ہیں۔ ان کی طنز میں بڑی چبھن اور زور ہے اس کے باوجود وہ بے لاگ تنقید میں انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ آزادی اور دلیری ان کے انداز بیان کے خاص اوصاف ہیں۔ رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند میں سرسید نے حیرت انگیز جرأت اور نا قابلِ تردید دلائل سے کام لے کر یہ ثابت کر دیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں صرف مسلمان ہی قصوروار نہ تھے بل کہ انگریز زیادہ ملزم تھے۔

سرسید کی عبارت کبھی کبھی بے لطف اور ناہموار ہو جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ عبارت آرائی پر مفہوم اور مطلب کو ترجیح دیتے ہیں۔ جوشِ اصلاح اور اظہارِ خیال میں وہ اتنے آزاد تھے کہ قواعد کی پابندی اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جو لفظ ان کے مفہوم کو پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا اس کو فوراً استعمال کر جاتے تھے۔ اس لیے عبارت کبھی کبھی گلابی اردو کا مزہ دے جاتی ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کو جا بجا استعمال کرنے کے عادی بن چکے تھے۔ ان میں سے کچھ الفاظ تو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر اس میں رچ بس گئے لیکن اکثر الفاظ ایسے ہیں جو کسی کم انگریزی پڑھے لکھے آدمی کے ناپختہ شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے مترادف فارسی' عربی

اور خود اردو میں موجود تھے اس لیے وہ اردو کا جز و نہ بن سکے۔

سید کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائرِ قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ
مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ نہ جائے تری تقریر سے

محفل نو میں پرانی داستانوں کی چھیڑ
رنگ پر جواب نہ آئیں ان افسانوں کو نہ چھیڑ
تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے

نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
ہوا اگر ہاتھوں میں تیری خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زبان تلمذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(کلیات اردو، ص۵۲۔۵۳)

وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی

(کلیات اردو، ص۲۶۶)

○○○

علامہ محمد اقبال

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ پنجاب کے مشہور اور قدیم شہر سیالکوٹ میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے اُن کے والد ماجد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ وہ صوفی مشرب تھے اور کشمیری الاصل تھے اُن کی والدہ ماجدہ امام بی بی بڑی نیک، شفیق اور ہر دلعزیز خاتون تھیں۔

علامہ اقبال بچپن ہی سے بے حد ذہین اور عقیل تھے۔ اُن کو آوارہ گردی سے نفرت تھی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو اُنھیں مولانا غلام حسن کی درس گاہ میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں اُنھوں نے عربیات و دینیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں اُنھیں سیالکوٹ کے عالم معتبر مولانا سید میر حسن کے سپرد کر دیا گیا۔ بچپن ہی سے اقبال کو شعر و شاعری سے خاص مناسبت تھی اقبال کو بھیڑیں پالنے، کبوتر اُڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بھی شوق تھا مولانا میر حسن کے مشورے سے اقبال کو سکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں داخل کر دیا گیا۔ اقبالؒ نے پرائمری، مڈل اور انٹرنس کے امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ انٹرنس کا امتحان انھوں نے ۱۸۹۳ء میں پاس کیا۔ اس وقت اُن کی عمر بیس سال تھی۔ سکاچ مشن ہائی اسکول سکاچ مشن کالج بن گیا تو اقبال انٹرمیڈیٹ میں داخل ہو گئے۔ مولانا میر حسن کی صحبت نے ان کی صلاحیتوں کو اور بھی جلا بخشی۔ اس زمانے میں اقبال کی شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ علامہ سیالکوٹ کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ اِسی زمانے میں داغ سے بذریعہ خط و کتابت اُن کو تلمذ کا فخر حاصل ہوا۔ یہ تلمذ کا سلسلہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا لیکن داغ کو اپنے قابل شاگرد پر ہمیشہ فخر رہا۔

اسکاچ مشن کالج میں ابھی بی اے کی کلاسیں نہیں کھلی تھیں اس لیے انٹرمیڈیٹ پاس

کرنے کے بعد اقبالؔ کو لاہور بھیج دیا گیا۔ اقبالؔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج کی بی اے کلاس میں داخل ہوئے اور انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کا امتحان نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ انگریزی اور عربی میں دو طلائی تمغے حاصل کیے اور وظیفہ بھی پایا۔ انھیں دنوں پروفیسر آرنلڈ جو اپنے زمانے کے نامور فلسفی تھی، علی گڑھ کی ملازمت چھوڑ کر گورنمنٹ کالج میں آ گئے تھے۔ اقبالؒ ایم اے فلسفہ میں ان کے ایماء پر داخل ہوئے۔ آرنلڈ نے بھی اپنے قابل شاگرد کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ۱۸۹۹ء میں اقبال نے فلسفے میں ایم اے کیا اور یونی ورسٹی بھر میں اوّل آئے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ گئے اور وہاں پہنچتے ہی کیمرج یونی ورسٹی لندن کے ٹرنٹی کالج میں داخل ہوگئے۔ یہاں پروفیسر نکلسن سے اِن کی ملاقات ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء'' (The Devlopment of Metaphysics in Persia) کا موضوع منتخب کیا۔ یہ ڈگری انھوں نے جرمنی کے شہر میونخ سے لی اور انگلستان سے بار ایٹ لاء بھی کیا۔

علامہ محمد اقبال ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء لاہور پہنچے شروع میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور عارضی طور پر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تعینات ہوئے۔ کالج سے اُن کا تعلق ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ زندگی کے آخری پانچ سالوں میں وہ سیاسیات سے علی العموم کنارہ کش رہے۔ جس کی وجہ ان کی شدید علالت تھی، ان کی آواز بیٹھ گئی تھی اور آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا ہلکا سا درد رہنے لگا تھا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں ان کو ایک بہت بڑا صدمہ پہنچا یعنی آپ کی وفادار اور خدمت شعار بیوی (جاوید اقبال کی والدہ محترمہ) کا انتقال ہوگیا۔ ان پر یہ وقت بہت بھاری تھا چار سال سے وکالت بند تھی جو کچھ سرمایہ جمع تھا وہ جاوید منزل کی تعمیر پر خرچ ہو چکا تھا۔ بیگم بے وقت ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بڑا پریشان کن تھا۔ اس موقع پر نواب بھوپال نے پانچ سو ماہوار کی پیش کش کی جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کا احیاء ہوا تو اس سے اگلے برس ۱۹۳۶ء میں وہ پنجاب مسلم لیگ کونسل کے دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ ان کو قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ انھیں دنوں انھوں نے حضرت جناح کو کئی خط لکھے جن میں اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار کیا۔ قائداعظم نے اعتراف کیا کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا تھا۔

آخری ڈیڑھ دو سال انھوں نے ''ارمغان حجاز'' کی ترتیب میں بسر کیے۔ اہلیہ کے انتقال اور بیماری نے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ ۱۹۳۸ میں کل ہند پیمانے پر یوم اقبال منایا گیا اس سال علامہ اقبال کو سانس کا عارضہ شروع ہوا اور آخر ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی بے قرار طبیعت کو ہمیشہ کے لیے قرار آ گیا۔ رات کے پچھلے پہر بے چینی آہستہ آہستہ چین کی طرف بڑھنے لگی۔ موت و حیات کی کشمکش ختم ہوئی۔ اسلامی جذبوں کے مجاہد نے ۲۱، اپریل سوا پانچ بجے صبح آنکھیں بند کر لیں اور اسلام کا یہ بطل جلیل اور دانائے راز اپنے خالق کے دربار میں سرخرو حاضر ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعُوْنَ.

علامہ کی مشہور تصانیف بانگِ درا' بالِ جبریل' ضربِ کلیم' ارمغانِ حجاز' پیامِ مشرق' اسرارِ خودی' رموزِ بےخودی' جاوید نامہ اور زبورِ عجم ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنا تخلّص بہت کم استعمال کیا ہے۔ جن اشعار میں اقبال کا ذکر موجود ہے منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

ز اقبال فلک پیاچہ پری
حکیم نکتہ دانِ ماجنوں کرد (کلیات فارسی، ص۲۴۹)

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر (کلیات فارسی، ص۳۱۶)

بگو اقبال را اے باغباں رخت از چمن بندد
کہ ایں جادو نوا مارا زگل بیگانہ می سازد (کلیات فارسی، ص۳۲۳)

ز شعرِ دلکشِ اقبال می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید (کلیات فارسی، ص۳۲۶)

بیا کہ دامنِ اقبال را بدست آریم
کہ اوز خرقہ شانان خانقاہے نیست (کلیات فارسی، ص۳۵۲)

نہ شیخ شہر نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال
فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد (کلیات فارسی، ص۳۳۳)

اقبال بہ منبر ز دروازے کہ نہ باید گفت
ناپختہ بروں آمد از خلوت میخانہ (کلیات فارسی، ص ۳۳۶)

بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی در کش
تو از میخانہ مغرب ز خود بیگانہ می آئی (کلیات فارسی، ص ۳۴۳)

بیا بمجلس اقبال ویک دو ساغر کش
اگرچہ سر نترا شد ، قلندری داند (کلیات فارسی، ص ۳۴۶)

اقبالِ غزل خواں را کافر نتواں گفتن
سودا بد ماغش زدا ز مدرسہ بیروں بہ (کلیات فارسی، ص ۳۱۵)

چساں بسینہ چراغ فروختی اقبال
بخویش آنچہ توانی بماتوانی کرد! (کلیات فارسی، ص ۳۵۶)

در غزل اقبال احوالِ خودی را فاش گفت
زانکہ ایں نو کافر از آئین دیر آگاہ نیست (کلیات فارسی، ص ۳۷۹)

اقبال قبا پوشد در کار جہاں کو شد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست (کلیات فارسی، ص ۳۹۷)

کلیاتِ اُردو

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی (کلیات اردو، ص ۵۹)

مجموعہ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل و دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی (کلیات اردو، ص ۶۰)

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے (کلیاتِ اردو، ص ۶۰)

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا! (کلیاتِ اردو، ص ۸۳)

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی (کلیاتِ اردو، ص ۹۹)

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۱)

برا سمجھوں انھیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۵)

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبالؔ
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہ حجاز کرے (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۶)

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۷)

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۸)

ہے عجب مجموعۂ ضداد اے اقبال تو!
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے (کلیاتِ اردو، ص ۱۲۲)

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا (کلیاتِ اردو، ص ۱۳۰)

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا (کلیات اردو، ص۱۳۴)

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟ (کلیات اردو، ص۱۳۵)

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے (کلیات اردو، ص۱۳۶)

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا! (کلیات اردو، ص۱۳۸)

صدائے لن ترانی سن اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں (کلیات اردو، ص۱۳۸)

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی (کلیات اردو، ص۱۳۹)

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفت ہے اس کی
کہیں سرِ راہگزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا! (کلیات اردو، ص۱۴۲)

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا (کلیات اردو، ص۱۵۹)

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں (کلیات اردو، ص۱۶۲)

میں نے اقبال سے ازراہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز (کلیات اردو، ص۱۷۶)

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے (کلیات اردو، ص ۱۹۵)

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا
کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانہ حجاز (کلیات اردو، ص ۱۹۸)

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوانِ جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد (کلیات اردو، ص ۲۲۲)

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیمِ طور سے
اے کہ تیرے نقشِ پا سے وادیٔ سینا چمن! (کلیات اردو، ص ۲۴۰)

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے! (کلیات اردو، ص ۲۴۱)

کہاں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی (کلیات اردو، ص ۲۴۴)

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی (کلیات اردو، ص ۲۷۸)

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دامِ ابھی (کلیات اردو، ص ۲۷۹)

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر (کلیات اردو، ص ۲۸۰)

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا (کلیات اردو، ص ۲۹۱)

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی! (کلیاتِ اردو، ص ۳۰۳)

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند! (کلیاتِ اردو، ص ۳۱۳)

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا! (کلیاتِ اردو، ص ۳۲۴)

بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں (کلیاتِ اردو، ص ۳۳۹)

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ! (کلیاتِ اردو، ص ۳۴۳)

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ! (کلیاتِ اردو، ص ۳۴۷)

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے! (کلیاتِ اردو، ص ۳۴۸)

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا (کلیاتِ اردو، ص ۳۴۹)

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا! (کلیاتِ اردو، ص ۳۵۰)

فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آگیا کیونکر
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری! (کلیاتِ اردو، ص ۳۵۲)

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی (کلیات اردو، ص۳۶۳)

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعرِ غریب! (کلیات اردو، ص۳۷۱)

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعرِ نشاط آور و پر سوز و طربناک (کلیات اردو، ص۳۸۲)

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ! (کلیات اردو، ص۴۰۸)

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی (کلیات اردو، ص۴۴۱)

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند! (کلیات اردو، ص۴۷۴)

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے با خبر ہے (کلیات اردو، ص۴۸۰)

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات (کلیات اردو، ص۵۳۹)

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب! (کلیات اردو، ص۵۷۱)

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز! (کلیات اردو، ص۵۹۰)

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو! (کلیاتِ اردو، ص ۶۰۹)

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار (کلیاتِ اردو، ص ۶۱۵)

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محراب مسجد سو گیا کون؟ (کلیاتِ اردو، ص ۶۷۳)

ooo

سر راس مسعود

سر راس مسعود ۱۸۸۹ءکوعلی گڑھ میں جسٹس سید محمود کے ہاں پیدا ہوئے۔جسٹس سید محمود سر سید احمد خان کے صاحبزادے اور راس مسعود سر سید احمد خان کے پوتے تھے۔ نیو کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔انھوں نے فرانس، اٹلی اور سوئٹزلینڈ کا دورہ کیا۔لندن سے واپسی پر کچھ عرصہ پٹنہ میں وکالت بھی کرتے رہے پھر انڈین ایجوکیشنل سروس کے ساتھ وابستگی قائم کی۔ ملازمت کا کچھ عرصہ بہار میں گزارا، اسی دور میں وہ ریاست حیدر آباد کو ناظم تعلیم کے عہدہ جلیلہ کے لیے امیدوار کی ضرورت پیش آئی تو اس نے حکومت ہند سے راس مسعود کی خدمات مستعار لے لیں۔سر راس مسعود کو ناظم تعلیمات تعینات کر دیا گیا۔ان کی شبانہ روز کاوشوں سے شرح خواندگی میں اضافہ ہوا اور تعلیمی معیار بھی بلند ہوا۔دارالترجمہ کا قیام اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ریاست حیدر آباد نے ان کو مسعود جنگ کا خطاب دیا۔تعلیمی نظم ونسق کے مطالعہ کے لیے انہیں جاپان بھیجا گیا جہاں انھوں نے مزید تعلیمی اصطلاحات اور نظم ونسق کا نہ صرف مطالعہ کیا بل کہ اپنے تجربات ومشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں بھی پیش کیا۔

راس مسعود کو علامہ محمد اقبال کے سیکڑوں شعر ازبر تھے وہ مختلف موقعوں پر اقبال کے شعر سناتے رہتے۔وہ اقبال کے بہت بڑے دیوانے تھے وہ اقبال سے بے پناہ عقیدت رکھتے اور انہیں امت اسلامیہ کے لیے نیک فال قرار دیتے۔ان کا خیال تھا کہ اقبال ایسا مرد درویش ہی مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکال سکتا ہے۔جب راس مسعود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو اقبال نے وہاں پہنچ کر ان سے تفصیلی ملاقات کی اور مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کا مشورہ دیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد والیِ افغانستان کی خصوصی دعوت پر اقبال، سلیمان ندوی اور سر راس مسعود نے کابل کا دورہ کیا۔ کابل میں ایک یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مفید مشورے بھی دیئے۔ اقبال کو اس سفر میں راس مسعود کو قریب سے دیکھنے اور ان کے نظریات و افکار کو سمجھنے میں آسانی ہوئی یہی سفر ان دونوں کی گہری محبت اور دوستی کی نوید ثابت ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود نے وائس چانسلر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور بھوپال چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر وزیر معارف مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں اقبال کئی بار بھوپال گئے اور خط و کتابت بھی جاری رکھی اقبال بھوپال میں ان کی کوٹھی ''ریاض منزل'' میں قیام کرتے رہے۔ ضربِ کلیم میں شامل کئی نظمیں اقبال نے ریاض منزل میں بیٹھ کر لکھیں۔

علامہ محمد اقبال کی بیگم ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو جب انتقال کر گئیں تو راس مسعود نے ان کی بڑی دستگیری کی نواب حمید اللہ خان والی بھوپال سے تاحیات پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کروا کر اقبال کو کئی قسم کی مالی پریشانیوں سے نجات دلائی۔ سر راس مسعود کو بھوپال بلا کر ان کا علاج و معالجہ بھی کروایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سر راس مسعود کو ایک بیٹی عطا کی تو اقبال نے ایک قطعہ لکھ کر انھیں ارسال کیا۔

راس مسعود جلیل القدر کو
جو کہ اصل و نسل میں محدود ہے
یادگار سید والا گہر
نورِ چشم سید محمود ہے
راحتِ جان و جگر دختر ملی
شکر خالق منت معبود ہے
خاندان میں ایک لڑکی کا وجود
باعثِ برکاتِ لامحدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دخترِ محمود ہے

(۱۹۳۷ء)

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال ایک وصیت نامہ تیار کر رہے تھے اور گارڈین کی فہرست میں سر راس مسعود کا نام بھی شامل تھا جب راس مسعود سے اس حوالے سے رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے کہا کہ 'جہاں تک کہ منیزہ اور جاوید کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں کیونکہ جب تک ان دونوں کی ان شاء اللہ انیس برس عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقے پر مدد دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ الخ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو تمہارے ان دونوں بچوں کے لیے وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے۔'

چند ہی ماہ بعد سر راس مسعود ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء اپنے مالک حقیقی کے پاس چلے گئے۔ جب اقبال کو ان کی وفات کی خبر ملی تو اقبال بہت افسردہ اور دکھی ہو گئے انھوں نے اسی دکھ اور غم کی کیفیت میں سر راس مسعود کے لیے ایک نظم لکھی جو کہ پیش خدمت ہے۔

نظم: مسعود مرحوم

یہ مہر و مہ ، یہ ستارے ، یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالمِ عدم ہے یا کہ وجود!
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود
رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرور!
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود!
دے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است
نہ مجھ سے پوچھ کہ عمر گریز پا کیا ہے؟
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبت صغریٰ ہے یا فنا، کیا ہے
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟
دل ونظر بھی اسی آب وگل کے ہیں اعجاز؟
نہیں تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟
جہاں کی روح رواں لا الہ الا ھو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟
قصاصِ خون تمنا کا مانگیے کس سے؟
گناہگار ہے کون، اور خوں بہا کیا ہے؟
غمیں مشو کہ بہ بند جہاں گرفتار یم
طلسمہا شکنند آں دے کہ ماداریم!
خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات!
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل وفرات!
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
نگاہ ایک تجلّی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلّی تلافیِ مافات
مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر

زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات!
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات
خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند!

(کلیات اردو، ص۶۶۶ تا ۶۶۸)

ooo

اکبر الٰہ آبادی، لسان العصر

اُردو شاعری کو طنز و مزاح کے سانچے میں ڈھال کر اصلاحی شاہراہ پر گامزن کرنے والوں میں اکبر الٰہ آبادی سرفہرست ہیں۔ سرکاری اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے عام آدمی کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔

سید اکبر حسین رضوی المعروف اکبر الٰہ آبادی ۱۸۴۶ء بمقام باڑہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اکبر بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ ان کے والد سید تفضّل حسین بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اور تصوف سے خاص مناسبت رکھتے تھے، والدہ بھی نہایت پرہیز گار تھیں۔ چناں چہ والدین کے فیض کی وجہ سے مذہب کو عمر بھر حرز جاں بنائے رکھا۔ ۱۸۵۶ میں بطور نقل نویس سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں قانون کا پہلا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۰ میں ہائی کورٹ میں ریڈر مقرر ہوئے۔ ۷۳۔۱۸۷۲ میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۸۰ء میں پریکٹس کرتے ہوئے جج مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ علی گڑھ رہے۔ یہ تقرر سرسید احمد خان اور مولوی سمیع اللہ خاں کی درخواست پر عمل میں آیا، لیکن اکبر اور سرسید مختلف خیالات کے نمائندے ہونے کی وجہ سے متفق نہ ہو سکے۔ اکبر نے مغرب کی تقلید کے خلاف آواز بلند کی۔ اکبر کو سرسید کے کارناموں کا اعتراف تھا، البتہ ان کے طریقہ کار سے اختلاف رکھتے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں اکبر سب جج کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۸۹۴ء میں الٰہ آباد کی عدالت کے جج مقرر ہوئے اور اس سال سیشن جج ہو گئے۔ اس کے بعد آنکھوں کی شکایت کی وجہ سے ملازمت سے دستبردار ہونا پڑا۔ ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۰۷ء میں عدالتی خدمات کے صلے میں حکومت نے ''خان بہادر'' کا خطاب

عطا کیا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے
قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر
آیۂ لا یخلف المیعاد رکھ
یہ لسانِ العصر کا پیغام ہے
ان وعد اللہ حق یاد رکھ

(کلیات اردو: ۲۸۲)

ooo

سر اکبر حیدری

سر اکبر حیدری ۸نومبر ۱۸۲۹ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور اکاؤنٹس کے امتحان میں پاس ہو کر ناگپور، کلکتہ، لاہور، الہ آباد اور مدارس میں اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا اور تاریخی کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے۔ اکاؤنٹس کے حوالے سے ان کی شہرت عام ہوئی تو نظام حیدر آباد نے انہیں بلا کر اکاؤنٹینٹ جنرل اور پھر کچھ عرصہ کے بعد مہتمم خزانہ کے منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ یہیں سے ترقی پا کر وہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ سر اکبر حیدری اقبال کے مداحین میں سے تھے۔ اقبال کا اولین تعارف عطیہ بیگم نے کروایا مارچ ۱۹۱۰ء میں علامہ محمد اقبال جب پہلی مرتبہ حیدر آباد آئے تو سر اکبر حیدری نے ان کی خوب پذیرائی کی۔

سر اکبر حیدری کی خواہش تھی کہ اقبال مستقل طور پر حیدر آباد منتقل ہو جائیں اسی حوالے سے انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں اقبال کو قانون کی تعلیم کے پروفیسر تعینات کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اقبال واپس لاہور آ گئے۔ اقبال نے ان سے رابطہ برقرار رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کے کانوکیشن میں سر اکبر حیدری بحیثیت صدر شریک ہوئے دیگر مہمانوں کے علاوہ اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ بعد میں ان کے دونوں کے اختلافات بھی سامنے آئے۔ اس وقت یہ اختلافات شدت اختیار کر گئے جب علامہ محمد اقبال نے ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ء کو گول میز کانفرنسوں میں کہا کہ صوبوں کو خود مختاری دی جائے اور نظام دکن کو ان کی سیاسی اور ریاست کی عظمت دیکھتے ہوئے ہز مجسٹی خطاب دیا جائے تو سر اکبر حیدری کے حیدر آباد کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ علامہ محمد اقبال نے جاوید نامہ کو مکمّل کرتے وقت بھی سر اکبر حیدری کا رویہ یاد رہا اور انھوں نے ایک شعر میں کہا:

دین او آئین او سوداگری ست
عنتری اندر لباس حیدری ست

ایک مرتبہ اس شعر کی بابت بہادر یار جنگ نے اقبال سے پوچھا کہ اس میں آپ کا اشارہ سر اکبر حیدری کی طرف ہے؟ تو اقبال نے کہا کہ میں خوش ہوں کہ آپ میرے شعروں کو سمجھ لیتے ہیں۔ آخری ایام میں جب اقبال کی بیماری طول پکڑ گئی تو سر اکبر حیدری مالی امداد پہنچانے کے لیے برابر کوشاں رہے انھوں نے توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو ان کے ماتحت تھا ایک ہزار روپے کی رقم بطور تواضع بھجوائی ایک ہندو منتظم نے ناواقفیت کی بنا پر ایک دفتری کارروائی کے سلسلہ کا ایک مراسلہ بھی ساتھ لف کر دیا جس کو پڑھ کر اقبال کو بے حد تکلیف ہوئی اور انھوں نے وہ رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا اور رقم واپس بھجوا دی۔ اس کے چند روز بعد اقبال اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ سر اکبر حیدری کو صفائی کا موقع بھی نہ مل سکا جس پر وہ آخری دم تک پشیمان رہے۔ انھیں اس بات کا سخت قلق رہا۔ سر اکبر حیدری ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو انتقال کر گئے۔

نظم: سر اکبر حیدری صدرِ اعظم حیدر آباد دکن کے نام

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(کلیات اردو: ص ۲۹۰)

ooo

انوری

انوری...... مشہور فارسی شاعر ہے۔ بارہویں صدی کے ابتدائی سالوں میں خراسان میں پیدا ہوا۔ اس نے طوس میں فارسی، عربی اور نجوم کی تعلیم حاصل کی اور پھر سلطان سنجر کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ اس نے سلطان کے قصیدے لکھے۔ جب سلطان سنجر کو ترکوں نے پکڑ لیا تو اس نے ایک زبردست مرثیہ لکھا۔ اس نے نجوم کے حساب سے پیش گوئی کی تھی کہ فلاں وقت میں زبردست طوفان آئے گا جو بربادیاں لائے گا لیکن میعاد گزر گئی اور طوفان نہ آیا۔ اس پر انوری کو دربار سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہ مرد سے بلخ چلا گیا۔ ۱۱۹۰ء میں فوت ہوا۔ کئی سال بعد اس کی پیش گوئی چنگیز خاں کی صورت میں پوری ہوئی۔ علامہ اقبال انوری سے بہت متاثر تھے۔

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا
(کلیات اردو، ص۴۰۹)

نایاب نہیں متاع گفتار
صد نوری و ہزار جامی!
(کلیات اردو، ص۵۵۰)

ooo

بھرتری، ہری

مالوہ کا ایک راجا تھا جوانی میں شباب و شراب کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کی رانی بڑی خوبصورت تھی رانی کو معلوم ہوا کہ راجا کسی اور عورت سے محبت کرتا ہے اس پر اس نے خودکشی کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے دوسری شادی کر لی۔ راجا نے اس کا امتحان لینا چاہا۔ وہ شکار پر گیا اور وہاں سے رانی کو پیغام بھجوادیا کہ راجا کو درندوں نے کھالیا ہے یہ خبر سنتے ہی رانی کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ جل کر مرگئی۔ راجا کو واپس آنے پر جب ان حالات کا علم ہوا تو وہ سب راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں میں چلا گیا۔ بھرتری ہری ایک اچھا شاعر بھی تھا۔

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است
فطرت او چوں سحابِ آذری است

(کلیات فارسی، ص ۷۵۷)

نظم: برتری ہری

(پہلا اور آخری شعر)

کس نداند در جہاں شاعر کجا ست
پردۂ او از بم و زیر نوا ست

بادو بیتے در جہانِ سنگ و خشت
می تواں بردن دل از حورِ بہشت

(کلیات فارسی، ص ۷۵۸)

نظم: بھرتری ہری

(پہلا اور آخری شعر)

ایں خدایانِ تنک مایہ ز سنگ اندوز خشت
برترے ہست کہ دوراست زدیر وز کنشت

پیش آئین مکافات عمل سجدہ گذار
زانکہ خیز دز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

(کلیات فارسی، ص ۷۵۸۔۷۵۹)

اُردو

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

(ماخوذ: بھرتری ہری) (کلیات فارسی، ص ۲۹۵)

ooo

حافظ شیرازیؒ

حافظ شیرازی کا اصل نام خواجہ شمس الدین جب کہ حافظ تخلّص تھا۔ ۱۳۲۵ء کو ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ حافظ شیرازی فارسی زبان و ادب کے بلند پایہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کو لسان الغیب بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے ''دیوان حافظ'' سے فال نکالنے کا بھی بہت رواج رہا ہے۔ ان کے ہاں رومانوی، سماجی، معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ تصوف کا رنگ بھی خاصا غالب ہے۔[۱]

قرآن کے مدرس کی حیثیت سے ''حافظ'' کا لقب حاصل کیا۔ متوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث انھوں نے بچپن غربت میں گزارا۔ انھوں نے بڑے نامساعد حالات میں گزربسر کی۔ حافظ تیس برس کی عمر میں درباری شاعر بن گئے۔ دربار سے ملنے والے نذرانے ہی ان کے لیے زندگی گزارنے کا واحد ذریعہ تھے۔ جب وہ جلال الدین شاہ شجاع کے منظورِ نظر بنے تو انھوں نے حافظ کو شیراز کے ایک بڑے مدرسے میں دینی علوم پڑھانے کے لیے بطور استاد تعینات کروایا۔ انھوں نے شیخ محمد عطار کے ساتھ مطالعہ کیا۔ شہوانی غزل حافظ کی مخصوص طرز سخن ہے جسے انھوں نے کاملیت کے درجے تک پہنچایا۔ انھوں نے غزل میں تصوف کا رنگ شامل کیا اور محبوبِ حقیقی کے ساتھ مکمل وصال کی خواہش کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اگرچہ حافظ کی غزلوں کو الوہی حسن کی تشبیہات کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے لیکن وہ واضح طور پر دنیاوی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میخانے کی عادات کی خاطر مسجد چھوڑ دی۔ عقیدہ پرستوں پر حملے کرنے کے بعد حافظ کے سرپرست شاہ شجاع نے مذہبی حکام کے اصرار پر اسے جلاوطن کر دیا۔ البتہ بعد ازاں دربار میں حافظ کو ان کی سابقہ حیثیت پر بحال کر دیا گیا۔ حافظ شیرازی کی شہرت ملکی سرحدوں کو پار کر کے دیگر ممالک میں پہنچی تو وہاں کے امراء اور وزراء

نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا جن میں سلطان احمد ین انھیں بغداد آنے اور حاکم دکن محمود شاہ بہمنی نے اسے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی مگر حافظ نے معذرت کی اور شیراز میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ حافظ اپنے ایک مشہور شعر کے باعث بہت مقبول ہوئے۔

اگر منظور دل میرا ہو اس ترک دل آراء کو
فدائے خال وخد کر دوں سمر قند و بخارا کو

اس شعر کی پاداش میں منگول راہنما تیمور لنگ کے دربار میں پیش کیا گیا تو تیمور نے کہا کہ میں نے سمر قند و بخارا کی شان وشوکت اور دولت وحشمت بڑھانے کے لیے بہت سے شہروں اور علاقوں کو تاخت وتاراج کیا اور حافظ تم جیسا اایک عام فرد اپنے معشوق لڑکے کی رخسار کے ایک تل کے بدلے انہیں دینے کو کیسے تیار ہو گئے؟ حافظ نے جواب دیا ''حضور میں اسی قسم کی سخاوت کی وجہ سے آپ کے سامنے ایک غریب شخص کی حیثیت میں کھڑا ہوں'' کہتے ہیں کہ تیمور حافظ کے اس جواب پر بہت خوش ہوا۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ حافظ انگریزی ادب میں بھی شیکسپیئر سے زیادہ مقبول ہوئے۔ آج بھی اہل فارس اپنی روزہ مرہ زبان میں حافظ کے بے ساختہ انداز میں حوالہ دیتے ہیں۔حافظ شیرازی نے اپنی غزلوں کا دیوان مرتب کیا جو کہیں کھو گیا بعد میں ان کے دوست نے انہیں دوبارہ اکٹھا کیا۔ حافظ غیر معمولی اور متواتر مقبولیت کی وجہ سے آج ہزاروں دلوں کی دھڑکن ہیں۔ فارسی ادب کا یہ ایسا غزل گو ہے جس نے شہرت اور عزت کے اس زینے کو چھو لیا ہے جس کی تمنا میں کئی شاعر زندگی بھر ترستے رہتے ہیں۔ حافظ کی غزلیں شراب نوشی، شکار اور درباری محبت کا تذکرہ کرتی ہیں البتہ گہرائی میں وہ وصال الٰہی کے لیے صوفی کی مستغرق جستجو کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''دیوان حافظ'' میں ۵۰۰ سو غزلیات شامل ہیں۔ حافظ شیرازی کے ''دیوان حافظ'' کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۸۹۱ ء میں ہوا جس کے بعد اسے مغرب میں بہت مقبولیت ملی۔

انھوں نے اپنے فارسی کلام میں رندوں اور میکشوں کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔ حافظ شیرازی ۱۳۸۸ میں وفات پا گئے اور شیراز میں ہی دفن ہوئے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے ''پیام مشرق '' کے دیباچہ میں خواجہ حافظ شیرازی کا تذکرہ صفحات ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱ پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں کلیات اردو میں حافظ شیرازی اقبال کی عقیدت کئی اشعار پر منعکس ہے۔

اُردو

پیامِ مرشدِ شیراز بھی مگر سن لے
کہ ہے یہ سرِّ نہاں خانۂ ضمیرِ سروش
(کلیاتِ اردو: ص ۲۱۰)

ہوائے بزمِ سلاطین ، دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظِ رنگیں نوا نے راز یہ فاش
(کلیاتِ اردو: ص ۲۳۹)

دلق حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن
وانگہش مست و خراب ازرہِ بازار بیار
(کلیاتِ اردو: ص ۲۸۸)

خونِ رگِ معمارِ کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ تبخانۂ بہزاد!
(کلیاتِ اردو: ص ۵۹۳)

○○○

حالی، شمس العلماء مولانا الطاف حسین

مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ان کا انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق تھا۔حالی کے ننھیال کا تعلق سادات گھرانے سے تھا اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے جو اپنے وقت کے مشہور و معروف عالم تھے اور یہ زمانۂ غیاث الدین بلبن میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور بادشاہ نے ان کے خاندان کو کچھ زمین عطا کی تا کہ اُن کے والدین اپنی مالی حالت بہتر بنا سکیں کیوں کہ خواجہ کے والد خواجہ ایزد بخش، غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے رہے۔

حالی ابھی نو سال ہی کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی اور بہن نے کی۔حالؔی نے پانی پت کی روایات کے مطابق سب سے پہلے قرآن حفظ کیا اور اس کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔سترہ برس کی عمر میں ان کی شادی کر دی گئی، اور وہ گھر سے بھاگ کر دہلی آ گئے۔حالی نے ۱۸۵۶ء میں کلکتہ کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی، مگر ۱۸۵۷ کے جنگ آزادی میں ملازمت چھوڑ دی اور آٹھ برس تک نواب مصطفیٰ خان شیفتؔہ کے بچوں کو پڑھاتے رہے۔نواب شیفتؔہ کے ذوقِ علم وادب سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔

لاہور میں کرنل ہالرائیڈ کے ایماء پر جب آزؔاد نے جدید مشاعرے کی بنیاد رکھی تو حالی نے اس میں شرکت کی اور چار مثنویاں برکھارت' نشاطِ امید' مناظرۂ رحم وانصاف اور حبِ وطن لکھیں' لیکن لاہور میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے اور واپس دلی آ گئے' اور اینگلو عربک اسکول میں درس وتدریس سے

وابستہ ہو گئے۔ دلی میں سرسید سے اُن کی ملاقات ہوئی جن کی خاص فرمائش سے انھوں نے مشہور و معروف ''مسدس حالی'' (مدوجزر اسلام) لکھی۔ انھوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک میں بھی شمولیت اختیار کی ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اُن کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔ وہ تادمِ واپسیں سرسید کی تحریک سے وابستہ رہے اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ تریاقِ مسموم، طبقات الارض، مسدس حالی، تاریخ محمدی پر منصفانہ، سائے مجالس النساء، مقدمہ شعر و شاعری، حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید ان کی تصانیف ہیں۔

اٹھ گئے ساقی جو تھے، میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالؔی رہ گیا

(کلیاتِ اردو: ص ۹۰)

نظم: شبلؔی و حالؔی

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوانِ جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کے گرد

پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئینہ آبروئے مرد

مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ و حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چرخ لا جورد

پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
غماز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد

خاموش ہو گئے چمنستان کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کے نوائے درد

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

(کلیاتِ اردو: ص ۲۲۲)

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز

(کلیات اردو: ص۲۴۴)

باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رو رو کے لگا کہنے اے صاحبِ اعجاز!

(کلیات اردو: ص۲۴۴)

ooo

امیر خسرو

اُردو شاعری کے تاج محل کے سرتاج حضرت امیر خسرو تسلیم کیے جا چکے ہیں۔انھوں نے جہاں اردو لفظیات کو شاعری کی زینت بنایا وہاں بے جان لکڑی کے ٹکڑوں کو ساز و آواز سے ہم آہنگ کیا۔ڈاکٹر علامہ اقبال فنون لطیفہ میں مصوری، موسیقی، تعمیرات اور شاعری کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب اردو شاعری اور موسیقی کا مقفل پنڈورا کھولنے کا وقت آیا تو امیر خسرو کی محنتِ شاقہ کا دروازہ کھل گیا۔

امیر خسرو ۱۲۵۳ء کو پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ترکی النسل گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت امیر خسرو کا نام ابوالحسن لقب یمین الدین اور تخلّص خسرو تھا۔ان کے والد محترم امیر سیف الدین محمود ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے تھے اور مغلوں کی یلغار کے زمانے میں وہ وہاں سے فرار ہو کر ہندوستان کے ایک شہر پٹیالی عرف مومن آباد ضلع ایٹہ (یوپی) میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔امیر سیف الدین محمود کے تین صاحبزادے پیدا ہوئے بڑے بیٹے کا نام عزالدین علی شاہ، منجھلے بیٹے کا نام خسرو اور چھوٹے صاحبزادے کا نام حسام الدین قتلغ تھا۔۔امیر خسرو کے نانا عماد الملک بہت اچھے موسیقار تھے۔یہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔امیر خسرو کے والد بڑے صاحب علم وفضل بزرگ تھے ان کے نانا عماد الملک معارف نواز اور علم پرور شخصیت تھے۔خسرو نے علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی تو علمی و ادبی ذوق ان کو گھٹی میں ملا۔انھوں نے اسی علمی ماحول سے مروجہ علوم و فنون بڑی توجہ سے سیکھے۔

امیر خسرو مختلف زبانوں پر دسترس رکھتے تھے ان میں فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت، اور

عربی شامل تھیں۔انھوں نے اپنے دیوان ''تحفہ الصغر'' میں بتایا ہے کہ وہ شاعری اس وقت سے کر رہے ہیں جب ان کے دودھ کے دانت گر رہے تھے۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

درآں سن کے دندان من افتاد سخن می گفتم

ترجمہ: میں اس وقت سے شعر کہہ رہا ہوں جس زمانے سے میرے دودھ کے دانت گر رہے تھے۔

ابتدا میں سلطانی تخلّص رکھا ان کے پہلے دیوان میں سلطانی تخلّص کی کئی غزلیں ملتی ہیں۔وہ تلمیذ الرحمٰن تھے انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی تھی وہ انوری اور سنائی کے مداح تھے ان کی شاعری کو پڑھ کر ان کے ہاں ذوق شعر پیدا ہوا اور انہی کے مطالعہ سے ان کی شاعری میں نکھار پیدا ہوا۔اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح امیر خسرو آٹھ سال کے ہوئے تو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی سے بیعت سے مشرف ہوئے۔سلطان مبارک شاہ خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہنے لگے۔روایت ہے کہ امیر خسرو کو پانچ مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی۔

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی سے امیر خسرو کو اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ وہ محبوب الٰہی کے محرمِ اسرار قرار پائے۔ایک روز انھوں نے حضرت سلطان المشائخ کی مدح میں کچھ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کیے،حضرت محبوب الٰہی نے خوش ہو کر فرمایا کہو کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا کہ میں شیرینیٔ سخن کا خواستگار ہوں،فرمایا وہ شکر کا طشت جو چارپائی کے نیچے رکھا ہے،اٹھا کر لاؤ، اپنے سر پر نثار کرو،اور کچھ اس میں سے کھالو،امیر خسرو نے ایسا ہی کیا،آخر ان کے سخن کی شیرینی و حلاوت کو دنیا نے تسلیم کیا۔امیر خسرو کا اکثر وقت عبادت وریاضت میں گزرتا تھا ان کا معمول تھا کہ ہر شب میں تہجد کے وقت سات پارے کلام اللہ کے پڑھتے۔اپنے مرشد سے والہانہ عشق اور عقیدت رکھتے تھے کہ ہر کام میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی نے وصیت کی تھی کی امیر خسرو کو میرے پہلو میں دفن کیا جائے کہ وہ میرے صاحب اسرار ہیں اور میں ان کے بغیر بہشت میں قدم نہ رکھوں گا۔

برعظیم پاک وہند کے فارسی شعراء میں امیر خسرو کا مرتبہ بہت بلند ہے یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ عظمت کو اہل ایران نے بھی تسلیم کیا ہے۔ان کی تصانیف میں ''تحفۃ الصغر''،''دیوان وسط الحیات''، ''غرۃ الکمال''،''مطلع الانوار''،''شیریں خسرو''،''مجنوں ولیلیٰ''،''آئینہ سکندری''،اور''ہشت بہشت''

شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''قرآن السعدین''، ''نہ سپہر مفتاح الفتوح''، ''خزائن الفتوح''، ''دول رائی''، ''تغلق نامہ'' اور ''تاج الفتوح'' ہیں جب کہ فن انشاء میں بھی امیر خسرو نے ایک کتاب رسائل الاعجاز تصنیف کی تھی۔

آپ نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی۔شعروشاعری کا بچپن ہی سے ذوق تھا۔امیر خسرو پہلے علاؤالدین قتلغ باربک کے دربار سے وابستہ ہوئے پھر سلطان بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کے دربار سے وابستگی ہوگئی۔آپ نے شاعری اور موسیقی میں کئی اہم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔کئی راگ ایجاد کیے۔انھوں نے ستار میں تیسرا تار ابھی ایجاد کیا۔امیر خسرو نے ہندی دوہے، کہہ مکرنیاں، دوسخنے اور مثنویاں بھی لکھیں۔امیر خسرو ۱۳۲۵ء کو انتقال کر گئے۔

خسرو و شیریں زباں ، رنگیں بیاں
نغمہ ہائش از ضمیر کن فکاں (کلیات فارسی،ص ۲۷)

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست (کلیات فارسی،ص ۱۸۰)

من شکوہ خسروی او را دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم (کلیات فارسی،ص ۱۸۷)

اُردو

رہے نہ ایبک و غوریؔ کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ خسرو!
(کلیات اردو،ص ۳٦٦)

ooo

خوشحال خاں خٹک

خوشحال خان خٹک، خٹک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری اور مجاہدانہ زندگی وجہ شہرت ثابت ہوئی۔ خوشحال خان خٹک ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۲۷ سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار منتخب ہوا۔ وہ انقلابی شاعری کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے افغانوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ خوشحال خان خٹک شہنشاہ شاہ جہاں کے انتہائی وفادار رہے۔ شہنشاہ شاہ جہاں ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے خلاف اس لیے ہو گئے کہ انھوں نے خوشحال خان خٹک کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ سات برس کے بعد رہائی ہوئی تو وطن واپس آ کر انھوں مغل حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور افغانیوں کو انقلابی شاعری کے ذریعے مغل حکومت کے خلاف اُکسایا اور جنگ کر دی مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخر کار آفریدی قبائل میں پناہ لی اور وہیں ۷۸ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ عالمی سطح پر اپنی انقلابی شاعری کی وجہ سے شہرت پائی ان کی شاعری کے کئی زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اقبال نے اس مردِ قلندر کے اعزاز میں ایک پوری نظم بعنوان ''خوشحال خاں کی وصیت''، لکھی اور کلیات اردو میں شامل کرا سے زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم — کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبّت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں — قہستاں کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات — وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ — مغل شہسواروں کی گردِ سمند

(کلیات اردو، ص۴۴۶)

سعدی شیرازی

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مختلف علوم وفنون سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ جس شخصیت سے متاثر ہوئے اس کے گرویدہ رہے۔ ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء'' پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی وجہ سے ایران سے تعلق رکھنے والے صوفیاء شعرا کرام سے ان کی دلی وابستگی رہی حافظ شیرازی، اور شیخ سعدی شیرازی کے کلام کا مطالعہ ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ یہی نہیں دیگر دانش وروں اور صوفی منش احباب سے بھی اقبال مطالعہ کے رشتے میں بندھے رہے۔

''گلستانِ سعدی'' اور ''بوستان سعدی'' فارسی زبان وادب میں ایک بلند مقام ومرتبہ رکھنے والی کتب ہیں۔ جہاں فارسی ادب کا ذکر آتا ہے وہاں سعدی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ نصیحت آموز کہانیاں، حکایات اور واقعات پڑھنے والوں پر بڑے مثبت اثرات مرتسم کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے خالق شیخ سعدی ایران کے شہر شیراز میں ایک علمی وادبی گھرانے میں ۱۱۸۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کا نام شرف الدین رکھا گیا لیکن پھر اپنے باپ کے نام کی وجہ سے مصلح الدین کہلایا اور سعدی تخلص اختیار کیا۔ کیونکہ شیرازی حکمران اتابیگ سعد بن زنگی اس خاندان کا سرپرست تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد اتابیگ سعد ابنِ زنگی نے ان کی کفالت کی اور ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا۔

مصلح الدین سعدی نے پہلے شیراز میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر بغداد میں تحصیل علوم کرتے رہے، جہاں ان دنوں بڑے بڑے مشہور عالم جمع تھے۔ اس کے بعد حج کیا، بعض ملکوں کی سیاحت کی۔ فلسطین کے صحرا میں ایک مرتبہ سعدی کو عیسائی پکڑ کر لے گئے اور انھیں عام مزدوروں کی طرح خندق کھودنے پر لگا دیا۔ شام کا ایک رئیس اِدھر سے گزرا، جوان کو جانتا تھا۔ اس نے دس دینار دے کر سعدی کو چھڑایا اور گھر لے گیا۔ اس رئیس نے اپنی لڑکی کی شادی شیخ سے کر دی۔ جس زمانے

میں ہلاکو نے بغداد پر حملہ کر کے خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ کیا، اس وقت شیخ سعدیؒ بغداد کے آس پاس تھے۔ انھوں نے خلافت عباسی کی اسی تباہی پر نہایت دردناک مرثیہ تحریر کیا۔ ہلاکو کے وزیر خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاؤالدین، شیخ سعدی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک دفعہ تبریز میں ہلاکو کے بیٹے کی سواری جا رہی تھی کہ شیخ سعدی سامنے نظر آئے۔ دونوں مسلمان وزیروں نے بے حد احترام کیا اور خان سے تعارف کرایا کہ یہ ہمارے بزرگ ہیں۔ خان نے شیخ سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجیے۔ چنانچہ شیخ نے ایسی نصیحتیں کیں کہ ہلاکو خان کا بیٹا اشکبار ہو گیا۔

نظامیہ کالج بغداد سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۲۲۶ء میں اس نے مشرق قریب و وسطیٰ، ہندوستان، ایتھوپیا، مصر اور شمالی افریقہ میں تیس برس غیر معمولی آوارہ گردی کرتے ہوئے گزار دے۔ وہ ہر صعوبت اور ہر قسم کی غربت سے آشنا تھا، اسے شکایت تھی کہ وہ پیروں سے ننگا تھا، حتیٰ کہ اسے دونوں پاؤں سے محروم ایک آدمی ملا،'' میں نے خدا کی نعمتوں اور عنایات کا شکر ادا کیا'' ہندوستان میں اس نے ایک معجزاتی مورتی کا بھانڈا پھوڑا اور اس برہمن کو مار ڈالا جو پیچھے چھپ کر مورتی کو چلاتا تھا۔ بعد میں اس نے تمام نیم حکیموں کے ساتھ بھی اس قسم کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیا۔ وہ صلیبوں کے خلاف لڑا، عیسائیوں کا قیدی بنا اور تاوان ادا کرنے والے شخص کی بیٹی سے شادی کر لی۔ وہ نہایت مکار عورت تھی سعدی نے اسے طلاق دے دی۔ پھر دوسری شادی کی لیکن دوسری بھی جلد وفات پا گئی۔ پچاس برس کی عمر میں سعدی نے لکھنا شروع کیا۔ کنجِ تنہائی میں بیٹھ کر سعدی نے ''پند نامہ'' لکھی جس نے خوب شہرت پائی۔ نظموں کا ایک مختصر سا ''دیوان''۔ زیادہ تر اس نے فارسی میں، تھوڑا بہت عربی میں بھی لکھا ہے۔ سعدی کا عمومی فلسفہ ''بوستان'' میں ہے۔ جب کہ ''گلستان'' ۱۲۵۸ء پند و انصائح اور خوب صورت شاعری کا امتزاج ہے۔ سعدی ایک فلسفی تھا لیکن نا قابل فہم تحریریں لکھنے کے باعث اس اعزاز سے محروم رہا۔

سعد بن زندگی کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا ابو بکر بن سعد زندگی شیراز کا بادشاہ بنا۔ اس وقت شیخ سعدی واپس اپنے وطن میں آئے۔ آخری عمر میں شیراز سے باہر ایک علیحدہ سے مکان میں رہتے تھے۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ عمر پا کر ۱۲۹۲ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدیٔ شیراز

(کلیات اردو: ص ۲۴۴)

سعید حلیم پاشا

سعید حلیم پاشا ۱۸۶۰ء کو استنبول (قسطنطنیہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پہلے خدیو مصر محمد علی پاشا کے دوسرے بیٹے ابراہیم حلیم پاشا تھے۔ محمد علی کے بعد جب توفیق پاشا مصر کا حاکم بنا تو لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے۔ ایک طبقہ سعید حلیم پاشا کو حاکم مصر بنانا چاہتا تھا مگر انگریزوں کی دخل اندازی سے حلیم پاشا مصر سے نکلوا دیے گئے۔ وہ واپس ترکی آ گئے اور سلطان عبدالحمید کے دربار میں وزیر مقرر ہو گئے۔ سعید پاشا ترقی پسند اور ملک میں اصلاحات نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن سلطان کو یہ پسند نہ تھا لہٰذا انھیں وزارت سے الگ کر دیا گیا۔ وہ مصر چلے آئے۔ آخر نوجوان ترکوں کی کوششوں سے سلطان انھیں وزارت دینے پر رضا مند ہو گیا چنانچہ انھیں ۱۹۱۱ء میں بلا کر ترکی کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا پہلی جنگ عظیم میں سعید حلیم پاشا غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے مگر ترکی علیحدہ نہ رہ سکا اور جرمنی کا ساتھ دیا۔ جنگ میں ترکی کو شکست ہوئی۔ سعید حلیم پاشا کو مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا ایک سال بعد رہا ہو کر روم میں سکونت اختیار کی۔ ۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ایک آرمینی نے انھیں گولی مار کر شہید کر دیا۔

پاک مرداں چوں فضیل و بو سعید
عارفاں مثلِ جنید و بایزید

(کلیاتِ فارسی: ص ۶۴۸)

ooo

حکیم سنائی غزنوی

حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے علم و ادب کے حکماء اور دانش وروں سے بہت اکتسابِ فیض کیا۔ حکیم سنائی غزنوی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ غزنوی حکمرانوں نے اس خطے میں جو خدمات انجام دیں۔ اقبال نے انھیں ہدیہ تحسین پیش کیا۔ حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم جوانی ہی میں عرفانی، رنگ معرفت سے بھرپور اخلاقی اقدار کے حامل اشعار کہنے لگے تھے۔ انھوں نے کم عمری میں بارہ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان ادب کو مرحمت کیا۔ ان کی فارسی زبان میں پہلی ''حدیقہ'' مقبول عام ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا نظریہ تصوف مذکورہ مثنوی میں دیکھ سکتے ہیں۔ حکیم سنائی نے دربارداری ترک کے تنہائی کا دامن تھام لیا ۱۱۰۱ء سے ۱۱۵۰ء تک کا عرصہ حکیم سنائی کی زندگی ادبی محنت میں گزرا۔ کچھ محققین نے ان کی تاریخ وفات ۱۱۴۰ء بھی رقم کی ہے۔ حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم جتنا بڑا نام اُتنا بڑا کام کرتے رہے۔ یہ بات مقبول ہے کہ فارسی غزل میں تخلّص استعمال کرنے کا رواج حکیم سنائی سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال ان کے بہت معترف تھے۔ جب علامہ اقبال ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے حکیم سنائی کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ علاوہ ازیں دو نظمیں تحفہ محبّت کے طور پر سپردِ قلم کیں۔ مولانا رومؒ بھی حکیم سنائی کے کلام میں تصوف کے گہرے مسائل کا تذکرہ کرتے تھے اور اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں حکیم سنائی اور فریدالدین عطار کے کلام سے گہرا استفادہ کیا۔ حکیم عطار عمر میں حکیم سنائی سے تقریباً چھوٹے تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان دونوں حکماء کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

تصوف ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا اہم موضوع ہے۔ انھوں نے جن صوفی شعراء کرام سے

اکتساب فیض کیا ان میں حکیم سنائی غزنوی بھی شامل ہیں۔علامہ اقبال کی عقیدت کا اظہار ملاحظہ ہو:

''ما از پئے سنائی و عطار آمدیم''

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا — غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا
خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں — یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں — زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(کلیات اردو، ص۱۴۔۱۵)

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے — یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی — وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیم بو ذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا؟
حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے — دگرفتہ چیناں احرام و مکی خفتہ در بطحا
لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مے لا سے — مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الا
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے — بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے — زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولو سے لالا!

(کلیات اردو، ص۳۱۸)

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی — مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش!
حلاج میں لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(کلیات اردو، ص۵۸۰)

ooo

کمال الدین بہزاد

فطرت کے دلکش مناظر انسانی طبیعت پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان فطرت کا انمول کردار ہے۔ وہ جو دیکھتا ہے آنکھوں کے راستے دل پر اترنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض افراد کو یہ خوبی عطا کی ہے کہ اپنی ذات مناظر قدرت میں اس انداز سے سرایت کر لیتے ہیں کہ یہ مناظر ان کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کائنات کی پھیلی یہ تصویریں کچھ تخلیق کاروں کے ذہن کا حصہ بن کر ان کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے موقلم سے قرطاس پر منتقل ہونے میں دیر نہیں کرتیں۔ مصنوعی رنگوں کی دنیا کا فطرتی رنگوں سے گہرا تعلق ہے۔ یہ انسان ہی کا کمال ہے کہ وہ کائنات کی پھیلی ہوئی وسعتوں کو رنگ آمیزی کے ذریعے صفحات پر مقید کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مصوری کو فنونِ لطیفہ کا اہم حصہ گردانا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں بہت سے باکمال مصوروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اسم با مسمیٰ کمال الدین بہزاد کے کمال فن کو لفظوں کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ بہزاد کا اصل نام کمال الدین تھا۔ ایران کا مشہور نقاش اور مصور تھا ۸۴۴ھ بمطابق ۱۴۵۰ء میں ہرات میں پیدا ہوا اور ۹۴۲ھ بمطابق ۱۵۳۵ء کو ۹۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ''خاک قبر بہزاد'' سے نکلتی ہے۔ سلطان حسین کے زمانے میں اس کی وجہ سے ایرانی نقاشی کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ جب صفویوں نے ایران پر اقتدار حاصل کیا تو ان کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ رنگ آمیزی میں ''مانوی دبستان'' کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہرات کے شمال میں واقع ایک پہاڑی کے اوپر اس کا مزار ہے جہاں اس کی شبیہ دو مجسمہ جات میں رکھی گئی ہے۔

مسودوں پر نقاشی کرنے والا فارسی مصور جس کے کام نے اسلامی مصوروں کی کئی پشتوں کو

متاثر کیا۔ وہ ہرات میں پیدا ہوا اور اصل نام استاد کمال الدین بہزاد تھا۔ سرپرست مصور میرک نقاش نے اسے تربیت دی۔ بہزاد نے تیموری حکم رانوں کے شاہی کتب خانے میں کام کیا جہاں محققین، خطاطوں اور آرٹسٹوں کی ایک اکیڈمی نے کلاسیکی کتب کو سجانے کا کام شروع کیا۔ ۱۵۱۰ء میں نئی صفوی سلطنت کی زیرِ سرپرستی بہزاد تبریز دربار میں گیا وہاں ۱۵۲۲ء کے بعد شاہی کتب خانے کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں اس نے فارسی مصوری کو متاثر کیا، اور اپنے فن پاروں اور طلباء کے ذریعہ ہندوستان اور سلطنت عثمانیہ میں بھی اس نے فن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ محققین ۳۲ فن پاروں کو اس سے ہرات میں تخلیق ہوئے۔ پھولوں بھرے باغات اور خوب صورت جگہوں پر گھوم پھر رہے ہیں۔ بہزاد ایران کے معروف ترین مصوروں میں شمار ہوتا تھا اس کی بنائی ہوئی تصویریں ایرانی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ تھیں۔ وہ کرداروں اور داستانوی ادب کو رنگوں اور برش کے ذریعے ایسے تخلیق کرتے کہ وہ تصویریں بولنے لگ جاتی تھیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ مختلف داستانوں کو ایسے پینٹ کرتا کہ وہ زندہ کردار بن کر سامنے آجاتے۔ بہزاد کا یہ فن اسے آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

زروے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادِ اوست
(کلیاتِ فارسی، ص ۹۷۷)

مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی!
(کلیاتِ اردو، ص ۵۸۶)

خونِ رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
(کلیاتِ اردو، ص ۵۹۳)

○○○

جسٹس سیّد محمود

سید محمود ۲۴ مئی ۱۸۵۰ کو دہلی میں سر سید احمد خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ سید محمود نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ علم و ادب سے ذوق ان کو وارثت میں ملا۔ ان کی والدہ نہایت نیک دل اور سلیقہ شعار خاتون تھیں ان کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان نقیب الاولیا سے تھا۔ سید محمود ابھی گیارہ برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ سر سید احمد خاں نے ان کی تعلیم و تربیت وقت کے بڑے علماء سے دلوائی۔ ابتدائی تعلیم عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی سے حاصل کی جب کہ عربی اور فارسی کے لیے مولانا ظہور الحسن سہارنپوری سے اکتساب فیض کیا۔ سید محمود کے اساتذہ میں ایک نام سید یاد علی سہوانی کا بھی لیا جاتا ہے۔

سید محمود عربی میں غیر معمولی مہارت کے ساتھ ساتھ قانون میں بھی اپنی قابلیت اور صلاحیت میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بڑے بھائی اور والد کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے جہاں کرائسٹ چرچ کالج کیمبرج میں قانون کی تعلیم مکمل کر کے ۱۸۷۳ میں واپس آگئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ وہ جلد ہی بریلی کے ضلع جج مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دیں۔ ۱۸۸۲ء میں ان کی تقرری الہ آباد ہائی کورٹ بطور عارضی جج کے ہوئی جہاں انھوں نے تاریخ ساز فیصلے دیئے جن کی شہرت چہار دانگ عالم پھیل گئی۔ ۱۸۹۲ء میں الہ آباد کورٹ کے چیف جج سے اختلاف کی وجہ سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور علی گڑھ میں آگئے اور اپنے والد سر سید احمد خان کی تعلیمی سرگرمیوں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ وہ کچھ عرصہ بعد کالج کے مستقل سیکرٹری مقرر ہوگئے۔ ان کی تصانیف میں ''

قانون شہادت ہند'' ''الطلاق از شرح مجمع البحرین''، ''کتاب الشفعہ از مجمع البحرین'' فتاوی قاضی خان اور'' درمختار'' شامل ہیں۔ بائیس برس کی عمر میں انھوں نے یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا جس کا اعتراف سرسید احمد خان بھی کئی بار کیا۔

جسٹس سید محمود کی شادی خواجہ فریدالدین کی بیٹی مشرف جہاں بیگم سے ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی جن سے راس مسعود پیدا ہوئے۔ سید محمود نے ۸ مئی ۱۹۰۳ء کو ۵۳ برس کی عمر میں سیتاپور میں وفات پائی۔ جسٹس سید محمود کے بیٹے سر راس مسعود کی وفات پر علامہ محمد اقبال نے ایک مرثیہ لکھا جو ارمغان حجاز میں'' مسعود مرحوم'' کے نام سے شامل ہے اس مرثیہ میں سید محمود کے حوالے سے بھی ایک شعر موجود ہے۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود
(کلیات اردو، ص ۶۶۶)

ooo

سیّد محمد ادریس سنوسی

سید محمد ادریس سنوسی کا تعلق لیبیا سے تھا ان کے عہد میں لیبیا سلطنت عثمانیہ ترکیہ میں شامل تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی طرابلس پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت ترکی حکومت جنگ کے اسباب نہ رکھتی تھی۔ سامان حرب نہ ہونے کے برابر تھا۔ میدانی جنگ کا راستہ مصر کی ناکہ بندی کر کے انگریزوں نے بند کر رکھا تھا۔ ان حالات میں عربوں کے دینی و سیاسی رہنما اور تحریک سنوسیہ کے سرگرم رکن سید محمد ادریس سنوسی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پا گئے۔

محمد ادریس سنوسی تحریک سنوسیہ کے نہایت سرگرم اور فعال رکن تھے اس تحریک کے بانی محمد علی سنوسی تھے۔ اس تحریک نے اسلامی تاریخ نے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔ اس تحریک کے بانی محمد بن علی السنوی جو سنوسی کبیر کے نام سے مقبول ہوئے الجزائر ساحلی شہر مستغانم کے ایک محلہ الواسطیہ میں ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق زیانی بربر نسل کے خطاطبہ خاندان سے تھا۔ وہ موجودہ زمانے کی مشہور دینی اور عسکری جماعت سنوسیہ کے بانی تھے ان کا سلسلۂ نسب مراکش کی دولت ادریسیہ کے بانی ادریس بن عبداللہ الکامل سے جاملتا ہے جو حضرت علیؓ کے پڑپوتے تھے۔ اس طرح ان کا شجرہ نسب آنحضور ﷺ سے جاملتا ہے۔ اس لیے ان کو السنوسی الخطاطی الحسنی کہا جاتا ہے۔

سنوسی کی تعلیم و تربیت ان کی چچی سیدہ فاطمہ نے کی جو اپنے عہد کی ممتاز عالمہ و فاضلہ اور فقیہ تھیں جن سے مرد علماء بھی اکتساب فیض کے لیے حاضر ہوتے۔ انھوں نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فارس گئے اور یہاں کی مشہور یونیورسٹی

جامعہ قرویین میں داخل ہوکر سات سال علوم عالیہ کی تعلیم وقت کے اجل علماء سے حاصل کی، جن میں سید احمد الدرقاوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنوسی نے تبلیغ دین کے لیے مصر اور حجاز کے اسفار بھی کیے۔ یہاں انھوں نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے پہلے مرکز کی بنیاد ڈالی۔ یہ زاویہ یہ جبل ابوقبیس کے زیر سایہ قائم کیا گیا ان کی یہی اصلاحی تحریک سنوسی تحریک کے نام سے مقبول ہوئی۔ اس تحریک نے افریقہ، لیبیا، شمالی افریقہ، مصر، سوڈان، حجاز و شام، انڈونیشیا اور ترکی بلکہ ایران تک میں سنوسی زاویوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔

سنوسی نے ۹ صفر ۱۲۷۶ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۸۵۹ء میں وفات پائی اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

(کلیات اردو، ص ۲۹۱)

ooo

شکری پاشا

شکری پاشا کی ولادت ۱۸۵۴ء میں بمقام روم ایسے خاندان میں ہوئی۔ شکری پاشا اپنی عسکری خدمات کے حوالے خاصے مقبول ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ حربیہ میں ہوئی۔ حصولِ تعلیم کے بعد ترک فوج میں لیفٹیننٹ تعینات ہوئے۔ عسکری ٹریننگ کے لیے جرمنی بھیجے گئے۔ جنگ بلقان میں شجاعت و بہادری کا شاندار مظاہرہ کرنے پر انہیں لازوال شہرت نصیب ہوئی۔

ادرنہ سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت رہا۔ جب بلقان کی جنگ چھڑی تو بلغاریہ، سرویہ اور مانٹی نیگرو کی فوجیں متحد ہو کر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت ترکی فوج کے سپہ سالار شکری پاشا فوجی دستوں کے ساتھ ادرنہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ فوج اسباب جنگ اور رسد کی قلت کے باوجود شکری پاشا نے تقریباً پانچ ماہ تک دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر ۲۶ مارچ ۱۹۱۳ء کو شکری پاشا شکست سے دوچار ہوئے اور قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ بند ہوئی تو جنگی قیدیوں کے تبادلے میں شکری پاشا کو قید و بند سے نجات ملی۔ کچھ عرصہ بعد جب بلقانی ریاستیں آپس میں الجھ پڑیں تو شکری پاشا نے موقع پا کر ۱۹۱۳ء میں ادرنہ پر قبضہ کر لیا اس طرح ادرنہ ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ہو گیا۔

محاصرہ ادرنہ کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو مسلمانوں کی دینی حمیت کا مظہر ہے۔ مسلمانوں کے پاس اشیاء خورد نوش کی شدید کمی ہو گئی تو مسلمان فوجیوں نے ذمی عیسائیوں اور یہودیوں کے گھروں سے کھانے پینے کی اشیاء اکٹھی کرنے لگے یہ خبر جب مفتی شہر تک پہنچی تو وہ غصہ میں آ گئے اور فتویٰ صادر فرمایا کہ ذمیوں کا مال و متاع ان کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے لیے کسی

طور پر جائز نہیں۔ مسلم فوجیوں کو فتویٰ کے بارے میں پتہ چلا تو انھوں نے تمام اشیاء بجنسہ ان کے متعلقین کے حوالے کر دیں۔ علامہ محمد اقبال کو ترک فوجیوں کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی نظم ''محاصرہ ادرنہ'' میں اس واقعہ کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ انھوں نے فاقوں سے مرجانا قبول کیا لیکن نجس اشیاء کھانے سے باز رہے۔

گرد صلیب گرد قمر حلقہ زن ہوئی
شکری حصار ادرنہ میں محصور ہوگیا

(کلیاتِ اردو، ص ۲۱۶)

ooo

باب علی محمد

باب علی محمد کا اصل نام علی محمد تھا۔ باب محمد علی یکم محرم ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء کو اور بعض مآخذ کے مطابق یکم محرم ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کو ہوئی۔ ان کے والد گرامی کا نام محمد رضا، جب کہ والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ ان کا لقب ''باب'' اور نسبت شیرازی ہے۔ اسی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ باب لکھتے تھے۔ ان کی ولادت شیراز کے ایک تاجر شیعہ گھرانے میں ہوئی۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہوگیا ان کی پرورش ان کے ماموں آغا سید علی نے کی۔ ابتدائی تعلیم شیخ شیخ عابد سے حاصل کی۔ شیخ عابد شیخ کاظم رشتی کے مرید تھے۔ وہ اپنے ماموں کے ہمراہ تجارتی ضرورت کے تحت مختلف شہروں کا سفر کرتے رہے ایک مرتبہ بوشہر گئے جہاں پانچ سال تک قیام کیا اور وہاں انھیں ذوق ریاضت، مراقبہ ہوئی۔ اسی کے ساتھ باطنی اشتغال کی طرف بھی مائل ہوئے وہ مختلف قسم کے چلے کاٹنے لگے۔

ایران میں کربلا کی زیارت کے بعد واپس وطن جانے کے بجائے شیراز میں رک کر دعوت اصلاح کا کام کرنے لگے۔ کاظم رشتی کی وفات کے بعد انہیں ان کا خلیفہ بنایا گیا۔ علی محمد نے کاظم رشتی کے چند مریدان کے ساتھ بغرض مجاہدہ و مراقبہ کوفہ کی ایک مسجد میں چلہ کشی کی۔ اس موقع پر انھوں نے ۵ جمادی الاول ۱۲۶۰ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو باب العلم بالحقیقۃ ہونے کا دعویٰ کیا۔

اپنے ایک مرید ملا محمد علی قدوس بارفروشی کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کی دوران قیام حرم انھوں نے ''صحیفہ بین الحرمین'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں انھوں نے اپنے دعوت کا خلاصہ پیش کیا۔

حج سے واپسی کے بعد ان کے مریدین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے شیراز میں اذان میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا ''علی محمد قبل النبی'' یعنی باب علی محمد کا رتبہ نبی سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی وقت کے اکابر اور مجتہدین نے سخت مخالفت کی اور احتجاج کیا۔ بالآخر اس نئے مذہب کی اشاعت کو روکنے کے لیے حاکم شیراز نے سخت اقدامات کیے اور بابی لوگوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ باب علی محمد کو بھی قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا انھیں گرفتار کر کے پہلے شیراز سے اصفہان، وہاں سے قلعہ ماکو آذربئیجان اور وہاں سے قلعہ چہرلق میں قید کر دیا گیا۔ ہر طرح کی نگرانی کے باوجود خفیہ طریقے سے تحریرات اور تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا بالاخر چھ سال کی محبوسی کے بعد ۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو تبریز میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔

باب علی نے جس مذہب کی بنیاد ڈالی تھی اس کے کچھ مخصوص عقائد اس طرح سے تھے بابیوں کے نزدیک خدا ایک ہے اور باب اس کا آئینہ ہے۔ جس میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے۔ ہر مخلص معتقد اس کے ذریعہ خدا کا دیدار کر سکتا ہے۔ روزہ اور نماز میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ مثلاً نماز پنج گانہ کی حیثیت ختم کر دی گئی۔ روزے بھی انیس دن کے قرار دیئے گئے۔ باب علی محمد نے جس مذہب کی داغ بیل ڈالی وہ رواج نہ پا سکا اور جلد ہی اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر
بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت
اس کی غلطی پر علما تھے متبسّم
بولا تمھیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات!

(کلیات اردو، ص ۵۰۸)

ooo

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ گجرات کے قصبہ پور بندر ویش ورن بنیا خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کرم چند اتم چند پور بند اور راج کوٹ ریاست میں وزیر اعلیٰ تھے۔ گاندھی نے ابتدائی تعلیم راج کوٹ اور بھاؤ نگر میں پائی۔ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ ۱۸۹۱ء میں وکالت کی ڈگری لی۔ دو سال بمبئی اور راج کوٹ میں وکالت کے جوہر دکھائے۔ جنوبی افریقہ میں مقیم سیٹھ عبداللہ کے ایک مقدمہ کے لیے انھیں جنوبی افریقہ بلایا گیا۔ مقدمہ سے فارغ ہو کر آنے لگے تو وہاں موجود ہندوستانیوں نے اپنے مسئلے مسائل بتائے تو گاندھی جی وہاں رک گئے اور ان کی دادرسی کے لیے کام کرنے لگے۔ یوں انھوں نے سفید فام حکومت کے استحصال کے خلاف ہندوستانیوں کی قیادت کی'' انڈین روپینسین'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ انھوں نے وہاں ''نیٹال ہندوستانی کانگریس'' کی بنیاد رکھی۔ پرامن ستیہ گرہ کے تجربات کیے۔ کئی بار جیل یاترا بھی کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی سہنا پڑیں مگر گاندھی جی ہندوستان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کو ان کے حقوق مل گئے۔ مہاتما گاندھی سرخرو ہوئے اور کامیاب ٹھہرے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۱۶ء کو ہندوستان واپس آئے اور احمد آباد کے نزدیک ایک آشرم کی بنیاد رکھی۔ اس میں ہریجنوں کو داخل کیا گیا تو اس کے خلاف برہمنوں نے خوب احتجاج کیا۔ تاہم ان کا دیہ تبدیل ہوا اور مزدوروں اور کسانوں کی مسیحائی ہونے لگی۔ یہیں سے گاندھی نے جنگ آزادی میں شرکت نظر آئی۔ ان کی پوری زندگی حصول آزادی کے لیے ہمہ وقت کوشاں دکھائی دیئے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو حکومت کے خلاف ایک مضمون لکھنے کی پاداش

میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک بار پھر جیل کی ہوا کھانی پڑی۔۱۹۲۴ء میں آپریشن اور جسمانی لاغری کے باعث رہائی نصیب ہوئی۔

حضرت علامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن اور سکون ہے مگر قلوب اک ہیجان حیرت انگیز ہے۔اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ امم میں بے نظیر ہے۔ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں اس کی عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے جو آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔''

مہاتما گاندھی مختلف تنظیموں اور تحریکوں میں شریک ہوتے رہے اور جیل بار بار آنا جانا لگا رہا۔۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس منعقدہ انگلستان میں شریک ہوئے۔گاندھی جی کو کئی بار قید کیا گیا حتی کہ ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑ د'' کے نعرے لگانے اور اس تحریک کو ہوا دینے کی پاداش میں دیگر ہندوستانی رہنماؤں کے ہمراہ قید کر لیے گئے۔

مہاتما گاندھی کے دل میں بھی اقبال کا احترام اور عزت تھی اس کی مثال ان کے اس بیان سے ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ''کون ایسا ہندوستانی ہے جو اقبال کا ''ہندوستاں ہمارا'' سن کے دھڑ کنے نہیں لگتا۔اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔
>
> اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے یا اردو ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی قومی زبان نہیں۔''

آزادی کے بعد گاندھی ستمبر ۱۹۴۷ء کو کلکتہ سے دہلی آئے اور بھنگی کالونی میں رہے۔وہ روزانہ پرارتھنا منعقد کرتے اور ہندو مسلم اتحاد کی آوازیں بلند کرتے۔ان پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے جن میں وہ بال بال بچتے رہے۔بالآخر ۳۰ جنوری ۱۹۶۸ء کو جب دوبارہ پرارتھنا سبھا کو خطاب کرنے جا رہے تھے کہ ایک ہندو ناتھورام نے ان پر تین گولیاں داغ دیں اور مہاتما گاندھی وہیں دم توڑ گئے۔گاندھی جی بھی اقبال کی دل سے قدر کرتے رہے کئی موقعوں پر انھوں نے اقبال کی تعریف کی اور ان کی شاعری کو سراہا۔علامہ محمد اقبال نے بھی ان کی وطن دوستی اور بے باکانہ انداز سیاست کی تعریف کی ہے ان کا ذکر ان کے کلام میں ملتا ہے۔

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزوری کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے ہوا
گاڑھا اِدھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہگزار میں کیا عرض توتیا
پس کر ملے گا گردِ رہ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا
خارا حریف سعی فیصفاں نمی شود
صد کوچہ ایست درایں زنداں ضلال را

(کلیات باقیات شعر اقبال، مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی، ص۴۲۲)

○○○

سر سردار جگندر سنگھ

سر سردار جگندر سنگھ کا تعلق امرتسر کے نواب خاندان سے تھا۔ وہ ۲۵ مئی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یہی وہ سن ولادت ہے جس میں علامہ محمد اقبال بھی پیدا ہوئے۔ یعنی ان کا اور اقبال کا سن ولادت ایک ہے۔ جگندر سنگھ کا امرتسر کے نواب خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باعث ان کا تعلقات بھی امراء و روساء سے رہے ہیں۔ بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں سر ذوالفقار علی خاں بھی شامل تھے۔ جن کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سر ذوالفقار علی خاں کی وجہ سے ہی جگندر سنگھ کی رفاقت حضرت علامہ محمد اقبال سے ہوئی۔ جگندر سنگھ سکھوں کے مقبول ترین رہنما، سکھ ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر، کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک وزیر زراعت اور ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم رہے۔ انگریز حکومت نے ان کی اعلیٰ کارگزاری پر انہیں سر کا خطاب بھی دیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اس کے علاوہ وہ انگریزی اور فارسی زبان پر خوب دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ''اسرارِ خودی'' پر انگریزی زبان میں کئی اہم مضامین تحریر کیے۔ وہ ایک معروف انگریزی رسالہ East& west کے مدیر رہے۔ ان کی علمی باقیات میں ''اسرارِ خودی'' پر لکھے گئے مضامین میں کملا، نور جہاں اور نسرین نہایت اہم اور یادگار ہیں۔

ایک مرتبہ سردار جگندر، مرزا جلال الدین بیرسٹر اور علامہ محمد اقبال، سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر میں سوار تھے۔ یہ نہایت قیمتی، تیز رفتار اور کم آواز تھی۔ دوران سفر سردار جگندر نے گاڑی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ '' موٹر کس قدر خاموش ہے'' اس پر اقبال کے ذہن رسا نے فوراً یہ نکتہ ڈھونڈ نکالا کہ کارزار حیات میں ہمیشہ تیز گام شے خاموش طبیعت ہوتی ہے۔

اس پر اقبال نے ایک نظم ''موٹر'' کہی جو ان کے کلیات اردو میں شامل ہے۔

موٹر

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز مثال ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادہ حیات پر ہر پا خموش
ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں مثال صبا خموش
مینا مدام شورش قلقل سے پابہ گل
لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش
شاعر کے فکر کو پر پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی ٔ آواز خامشی

(کلیات اردو، ص ۱۷۸)

ooo

طغرل بیگ

طغرل بیگ کا اصل نام محمد، کنیت ابو طالب اور لقب رکن الدولہ تھا۔ یہ میکائیل بن سلجوق کے صاحبزادے تھے۔ سلجوقی حکومت کا مؤسس اور اولین حکمران تھا۔ سلجوق میں میکائیل کی اولاد نے بہت ترقی اور شہرت و بلندی حاصل کی۔ ان کے خاندان میں بڑے نامور فرمانروا ہوئے ایران اور عراق کے سلجوقی حکمران اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

طغرل بیگ نے میدان سیاست میں رکھا اس وقت بغداد میں عباسی حکومت قائم تھی اور قائم خلیفہ اقتدار پر متمکن تھا میکائیل کی وفات کے بعد طغرل بیگ ان کے بھائیوں نے اپنے آبادئی علاقہ ''مقام جد'' سے ہجرت مختلف علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ سب سے پہلے وہ بخارا گئے وہاں سے نکل کر ترکستان گئے لیکن انھیں وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ بالآخر قوت بازو کی بدولت مرو اور خراسان کے علاقے پر قبضہ جمالیا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ قریبی علاقوں کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰۵۲ء میں خلیفہ قائم کی طرف سے طغرل بیگ کو حکومت کا فرمان، خلعت اور رکن الدولہ کا لقب عطا کیا گیا۔

مفتوحہ ممالک اس کے تمام بھائیوں اور بھتیجوں میں تقسیم کر دیئے گئے اور طغرل بیگ کے حصہ میں عراق اور عجم کی حکومت آئی۔ طغرل بیگ نے اپنے حصہ کی حکومت میں مزید توسیع کی حاکم تبریز کو مطیع بنانے کے بعد نواحی علاقوں کے بیشتر امراء کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس مہم سے فراغت پانے کے بعد وعازم بغداد ہوئے۔ انھوں نے خلافت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا قلع قمع کیا اور خلافت کو مستحکم کیا۔ ۱۰۵۶ء میں طغرل بیگ کی شادی خلیفہ قائم کی ایک بھتیجی سے ہوئی۔

طغرل کے سپاہیوں کی طرف سے بغداد کے باشندوں پر ہونے والے ظلم و جور کی وجہ سے انھیں بغداد سے نکل جانا پڑا۔ ۱۰۵۸ء میں وہ دوبارہ بغداد آئے۔ اس باران کا کھلے بندوں استقبال کیا گیا۔ خلیفہ نے توقعات سے بڑھ کر اعزاز و اکرام سے نوازا۔ سلطان المشرق والمغرب کے عظیم خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۰۶۱ء میں اس نے اپنی دیرینہ خواہش یعنی خلیفہ کی صاحبزادی سے عقد نکاح کا اظہار کیا خلیفہ کی ناگواری کے باوجود شادی ہوگئی۔

ستمبر ۱۰۶۳ میں طغرل بیگ نے انتقال کیا۔ طغرل راسخ العقیدہ، دین دار، پاک باز، متقی فرمانروا تھا۔ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا، تہجد کبھی ناغہ نہ ہوتی، صدقات و خیرات خوب کرتا۔ طغرل بیگ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس نے اپنے بھتیجے سلیمان بن داؤد کو اپنا جانشین بنایا۔

طغرل بیگ کا ذکر اقبال نے بھی اپنے کلام میں کیا ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ
یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری
یا مرد قلندر کے انداز ملوکانہ

(کلیات اردو، ص ۳۵۹)

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں

(کلیات اردو، ص ۳۷۸)

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

(کلیات اردو، ص ۵۳۸)

ooo

متفرق شخصیات

آزر

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال معمول سے کہیں زیادہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا تاریخ اسلام سے بہت انس تھا۔ اسلام، تاریخ اسلام، تقابلِ ادیان کے حوالے سے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انبیاء اکرام کے قصص میں بھی ان کی دلچسپی کم نہ تھی انھوں نے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا اس کے ساتھ ان کے والد آذر کو بھی احاطۂ تحریر میں لائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھ کھولی اور شعور پختہ ہونے لگا ان کے گرد بتوں کا گھیرا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر نہ صرف بت تراش، بت فروش اور بُت پرست تھے۔ نمرود کے دور میں آزر کا کاروبار بہت وسیع تھا۔ ممتاز دانش ور، شاعر و ادیب اشرف ذکی اعوان کا کہنا ہے کہ بہت سے محققین کے مطابق آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں بل کہ چچا تھے۔ کچھ احباب کی تحقیق کے مطابق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا۔ اکثر اوقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نمرود کے سرہانے ایک ہاتھ میں شمع اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑے رہتے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ امید سے ہوئیں تو اس دوران نمرود نے آزر کی پیشانی کی طرف دیکھا اور کہا ان کے چہرے پر نور کیسا ہے؟ عجب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کا ادراک ہونے لگا نجومیوں نے نمرود سے کہا کہ تمہارا دشمن ماں کے پیٹ میں آچکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ خوف کے مارے بچے کو لے کر دور جا بسیں۔ ایک غار میں قیام کیا آزر نے کہا کہ اے میرے فرزند میرا خدا تو سوائے نمرود کے کوئی اور نہیں۔ (لعنت اللہ علیہ)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے ابا جان نمرود تمہارا خدا کیسے ہوسکتا ہے اور خدا تو وہی ہوسکتا ہے کہ جو زمینوں آسمان کواکب اور جملہ مخلوقات کا پیدا کرنے والا

ہے اور وہ ہستی بلاشریک ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو راہ راست پر آتا نہ دیکھا تو افسوس کا اظہار کیا۔

''اے میرے ابا جان تم کو اور ساری قوم کو بہت بڑی گمراہی میں دیکھتا ہوں باپ نے بیٹے کی یہ بات سن کر کہا قولہ تعالیٰ: ترجمہ ''وہ بولے اے ابراہیم کیا تو ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آیا ہے یا ہم سے مذاق اور کھیل کرتا ہے یا کسی اور سے یہ باتیں سن لی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی یہ باتیں سن کر جواب میں کہا قولہ تعالیٰ ......ترجمہ ''نہیں اے میرے ابا جان، بلکہ رب تمہارا وہی ہے جو رب ہے آسمان وزمین کا جس نے ان کو بنایا اور میں اسی بات کا قائل ہوں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باوجود سمجھانے اور بتانے کے آزر نے کسی طرح بھی نہیں مانا اور اپنی گمراہی کی ضد پر اصرار کرتا رہا آخر مجبوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قسم کھا کر کہا اے میرے ابا جان میں تمہارے بتوں کا کچھ علاج کروں گا بمصداق اس آیت کے قولہ تعالیٰ:

ترجمہ: ''قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں فکر کروں گا تمہارے بتوں کی جب تم لوگ کہیں جاؤ گے۔''

ماندہ ایم از جادہ تسلیم دور
توز آزر من زا براہیمؑ دور (کلیات فارسی، ص۵۹)

باز طرحِ آزری انداخت است
تازہ تر پروردگارے ساخت است (کلیات فارسی، ص۱۴۰)

عقلِ آزر پیشہ ام زنار بست
نقشِ او در کشورِ جانم نشست (کلیات فارسی، ص۱۶۹)

نہالش دارم از آزر نہاداں
کہ ایں سرّے زا اسرار خلیلؑ است (کلیات فارسی، ص۲۰۲)

نوریٔ ناداں نیم ، سجدہ بآدم برم
او بہ نہاداست خاک من بہ نژاد آذرم (کلیات فارسی، ص۲۵۵)

چہ گویمیت ز مسلمانِ نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیلؑ است و آزری داند (کلیاتِ فارسی، ص۳۴۶)

خویش را در نارِ آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیلؑ از آذر است (کلیاتِ فارسی، ص۳۷۱)

بخودکے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقام آزری کردہ (کلیاتِ فارسی، ص۴۴۴)

ہمچناں دیدم فنِ صورت گری
نے براہیمی درد نے آزری (کلیاتِ فارسی، ص۵۷۸)

عینِ ابراہیم و عینِ آزر است
دستِ او ہم بت شکن ہم بت گر است (کلیاتِ فارسی، ص۵۸۰)

کیشِ او تقلید و کارش آزری ست
ندرت اندر مذہب او کافری ست (کلیاتِ فارسی، ص۵۸۱)

رخت بند داز مقامِ آزری
تاشود خوگرز ترک بت گری (کلیاتِ فارسی، ص۶۲۵)

عشق را خنیاگری آموختہ
با خلیلاں آزری آموختہ (کلیاتِ فارسی، ص۶۳۲)

از طریقِ آزری بیگانہ باش
برمرادِ خود جہانِ نو تراش (کلیاتِ فارسی، ص۶۶۱)

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است
فطرت او چوں سحابِ آزری است (کلیاتِ فارسی، ص۷۵۷)

مومن است و پیشۂ او آزری است
دین و عرفانش سراپا کافری است (کلیات فارسی، ص۸۳۴)

پورِ آزر کعبہ را تعمیر کرد
از نگا ہے خاک را اکسیر کرد (کلیات فارسی، ص۸۵۶)

نگاہش نقشبندِ کافری ہا
کمالِ صنعت او آزری ہا (کلیات فارسی، ص۹۷۷)

بت شکن اُٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا ابراہیم پدر اور پسرِ آزر ہیں (کلیاتِ اردو۔ص:۲۰۰)

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن (کلیاتِ اردو۔ص:۲۶۱)

آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاںؑ خار گدازی! (کلیاتِ اردو۔ص:۳۶۴)

وہی بت فروشی، وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے؟ (کلیاتِ اردو۔ص:۴۵۰)

ooo

بابا گرونانک

بابا گرونانک ۱۴۶۹ء کوضلع شیخوپورہ موضع تلونڈی ننکانہ صاحب میں پیدا ہوئے۔ سکھ مت کے بانی ہیں۔ ان کے والد کا نام کالورائے تھا جو ذات کے کھتری اور گاؤں کے پٹواری تھے۔ سلطان پور کے حکمران دولت خاں لودھی کے پاس سترہ سال تک نانک جی ملازم رہے۔ اس کے بعد باپ نے شادی کر دی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے بعد گھر سے نکل کر ۲۵ پچیس برس تک مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی۔ درویشوں کی خدمت میں رہ کر آپ کو بت پرستی کے نقائص اور خالص توحید کی سچائی کا راز مل گیا۔ آپ نے اس توحید کی تبلیغ شروع کر دی اور لاکھوں آدمی آپ کے مرید ہو گئے۔ آپ ہر قوم اور ملت کے لوگوں کو مرید کرتے تھے۔ آپ کے مرید بعد میں سکھ کہلائے۔ ابراہیم لودھی نے آپ کو قید کر دیا تھا لیکن پانچ ماہ کے بعد ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی، بابر کے ہاتھوں مارا گیا۔ بابر نے آپ کی بڑی تعظیم کی اور رہا کر دیا۔ ضلع سیالکوٹ کے موضع کرتار پور میں ستر سال کی عمر میں یہ درویش صف انسان انتقال کر گیا۔ آپ کے مریدوں نے ایک گردوارہ بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ سیاحت کے دوران بغداد میں ایک چولا وہاں کے حاکم نے ان کو دیا تھا۔ اس چولے پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔ جو آج تک مشرقی پنجاب کے موضع ڈیرہ بابا نانک میں محفوظ ہے۔ آپ کی مرتبہ کتاب گرو گرنتھ صاحب ہے۔ جو سکھوں کی متبرک مذہبی کتاب ہے۔ بابا صاحب پنجاب کے ایک اچھے شاعر تھے۔ شاعری میں عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کی لفظیات ملتی ہیں۔ بابا گرونانک کی وفات کے بعد اس کے ایک شاگرد انگد کو روحانی جانشین منتخب کیا گیا اور اسی نے بطور گرو سکھ برادری کی قیادت سنبھالی۔ نانک کے بھگتوں کی تعداد کے پیش نظر گرو کے افعال کے حوالے سے

متعدد قصے ہندو اور مسلم روایات سے ماخوذ تھے۔ ان قصوں کو ''ساکھیاں'' کہا گیا اور ان کا مجموعہ ''جنم ساکھی'' کہلایا۔ جنم ساکھیاں کے محدثین اور مرتبین کی اصل دلچسپی زیادہ تر نانک کے بچپن اور اسفار پر مرکوز رہی۔ اولین روایات کے مطابق نانک بغداد اور مکہ کے سفر پر گئے۔ بعد کے اضافوں میں ان کی سیاحت کا دائرہ سائیلون (سری لنکا) چین اور حتیٰ کہ روم تک وسیع کر دیا گیا۔ نانک کی تعلیمات کو مختصراً ایک عقیدہ نجات کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ الوہی نام خدا کی کل تجلّی کی علامت ہے۔ وہ خدا مخلوق دنیا اور انسانی روح کے اندر بھی نفوذ کیے ہوئے ہے۔ مراقبہ نہایت سختی کے ساتھ داخلی ہونا چاہیے اور تمام بیرونی معاونات، مثلاً مورتیوں، مندروں، مساجد، صحائف اور عبادات کو مسترد کر دینا چاہیے۔ مسلم اثر نسبتاً ہلکا جب کہ ہندو باطنیت اور بھگتی نظریات کا اثر کافی واضح ہے۔ البتہ نانک کے اپنے اظہار کی خوبصورتی ابتدائی سکھ الہٰیات پر غالب ہے۔ گورنانک نے ۱۵۳۹ء کو وفات پائی۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

(کلیات اردو، ص ۸۷)

نظم: نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بیخبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکارا اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

(کلیات اردو، ص ۲۳۹۔۲۴۰)

ooo

ابوالعلامعرّی

ابوالعلامعری کا اصل نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان تھا ۹۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی چیچک کے باعث ایسے بیمار ہوئے کہ ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ وہ مکمل طور پر اندھے ہوگئے۔ بیس برس کی عمر تک وہ حصولِ علم سے فارغ ہوئے۔ ۱۰۰۸ء میں وہ بغداد چلے گئے ابوالعلامعرّی گوشت، دودھ اور انڈے نہیں کھاتا تھا۔ ۱۰۵۷ کے قریب انتقال کر گئے۔ انھوں نے ۷۳ کے قریب کتابیں لکھیں۔ ان میں غفران اور لزومات نے بہت شہرت پائی۔ انھوں نے شادی نہ کی کیونکہ وہ اولاد پیدا کرنے کو گناہ تصور کرتے تھے۔ اقبال نے ان کا بطور خاص ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری ۔۔۔ پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا ۔۔۔ شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تروتازہ معرّی نے جو دیکھا ۔۔۔ کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغکِ بیچارہ ، ذرا یہ تو بتا تو ۔۔۔ تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو ۔۔۔ دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

(کلیات اردو، ص ۴۴۸، ۴۴۹)

○○○

ابولہب

رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا، مشہور کافر اور حضور ﷺ کا سخت مخالف۔ قریشی سردار تھا اصل نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب۔ قرآن نے اسے ابی لہب (آگ کا باپ یعنی جہنمی) کا خطاب دیا اس کی بیوی جمیل بنت حرب بن امیہ، ابوسفیان کی بہن تھی۔ وہ شوہر سے بھی زیادہ حضورؐ کی دشمن تھی۔ قرآن مجید کے تیسویں پارے کی سورہ لہب میں ان دونوں کا ذکر ہے اور ان کے واسطے عذاب دوزخ کی خبر دی گئی ہے۔ باوجود سخت مخالفت کے بدر کی جنگ میں شریک نہ ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بیماری کی وجہ سے معذور تھا۔ سات دن کے اندر ہی چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ ابولہب انتہائی بدقسمت انسان ہے۔ اس حقیقی بھتیجا نے پوری دنیا کو دائرہ اسلام میں داخل کیا مگر ان کا چچا اس نعمت سے محروم رہا ہے۔ قرآنِ پاک نے ان کے لیے جہنم کی خبر سنائی ہے۔

اقبال نے اکثر مقام پر ابولہب کا استعارہ ذکر کیا ہے۔ ابولہب باطل کے ایک مضبوط استعارہ کے طور پر اقبال کی شاعری میں سامنے آتا ہے۔

نہالِ ترک ز برق فرنگ بار آورد
ظہورِ مصطفویؐ را بہانہ بولہبی است (کلیات فارسی، ص ۳۳۵)

کوررا بینندہ از دیدار کُن
بولہب را حیدرِ کرار کُن (کلیات فارسی، ص ۶۶۳)

از چراغ مصطفیٰ اندیشہ چیست
زانکہ اور اپف زند صد بولہب (کلیات فارسی، ص ۶۷۹)

ابولہب

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(کلیات اردو۔ص۲۲۳)

نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللہی نہ کہیں ابولہبی رہی

(کلیات اردو۔ص۲۸۲)

عشق تمام مصطفیٰ ، عقل تمام بو لہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزوری کشد

(کلیات اردو۔ص۴۰۶)

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جراتِ گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفوی افتراقِ بولہبی

(کلیات اردو۔ص۵۲۵)

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(کلیات اردو۔ص۶۹۱)

ooo

ایاز

سلطان محمود غزنوی کا مشہور باتدبیر مشیر جو غلام تھا اس کی دانائی اور وفا شعاری کی وجہ سے محمود اس سے بہت محبت کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ ادب میں محمود و ایاز لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ پنجاب کا گورنر رہا اور اس نے شہر لاہور کے خراب شدہ حصے از سر نو تعمیر کروائے اور لاہور میں ہی اس کا انتقال ہوا اس کے مقبرہ اس مقر پر بنا جس کے قریب نواب سعد اللہ خان نے رنگ محل کی بنیاد رکھی تھی۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس مقام کے قریب ٹکسال بنائی گئی تھی، لہٰذا اس کا نام ٹکسالی بازار مشہور ہو گیا۔ اصل قبر کشمیر بازار کے اندر مسجد وزیر خان کے قریب ایک چبوترے پر واقع ہے بعض مورخین کا کہنا ہے کہ وزیر آباد کے قریب سوہدرہ کا قصبہ اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اردو اور فارسی کے ہر شاعر نے محمود و ایاز کا ذکر کیا ہے اقبال نے بھی اپنے سلام میں متعدد مقام پر ایاز کا ذکر کیا ہے۔

سلطان محمود غزنوں کے دیگر وزراء نے اور ملازموں نے شکایت کی کہ آپ ایاز کو ہمیشہ ہم سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ سلطان نے ایک روز سب کو دربار میں بلایا۔ اور سب کو کچھ کھانے کے لیے دیا۔ سب نے تھوڑا سا کھا کر تھوک دیا مگر ایاز نے وہ ترش اور انتہائی بد ذائقہ کھانا کھا لیا۔ ایاز سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ جب مالک روز اچھا کھانا دیتا ہے تو کسی روز ترش کھانا بھی سامنے آجائے تو اس پر بد ذائقی کا طعنہ نہیں لگانا چاہیے یہ مالک کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہے کھلا دے اس لیے میں وہ ترش اور بد ذائقہ کھانا بھی کھا گیا۔ ایاز اپنی انہی اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے سلطان کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی بھی ایاز کو بہت پسند فرماتے اور اکثر اپنے ساتھ رکھتے۔ ان سے امور سلطنت میں مشورہ اور تجاویز بھی لیتے تھے۔ غلام ہونے کے باوجود سلطان کا بہترین

دوست اور خدمت گار تھا۔ ایاز نے سلطان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ سلطان کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتا تھا۔

فارسی

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستہ ، بندہ شدی ایاز را (کلیات فارسی، ص۳۱۹)

یکے کار فرما ، یکے کار ساز
نیاید ز محمود کارِ ایاز (کلیات فارسی، ص۳۷۴)

من بسیماے غلاماں فرِ سلطاں دیدہ ام
شعلۂ محمود از خاک ایاز آید بروں (کلیات فارسی، ص۴۶۵)

کسے ایں معنیٔ نازک نداند جز ایاز اینجا
کہ مہرِ غزنوی افزوں کند دردِ ایازی را (کلیات فارسی، ص۴۹۶)

چہ گویمت کہ جہ بودی چہ کردہ چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازی محمود (کلیات فارسی، ص۵۱۰)

اُردو

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا (کلیات اردو ، ص۱۲۹)

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز (کلیات اردو، ص۱۶۵)

درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز (کلیات اردو، ص۱۷۶)

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری (کلیات اردو، ص۲۶۱)

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

(کلیات اردو، ص۲۸۱)

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی نفس ہندی، مقامِ نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

(کلیات اردو، ص۳۷۴)

فرو فالِ محمود سے در گزر
خودی پہ نگہ رکھ، ایازی نہ کر (کلیات اردو، ص۴۲۰)

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی! (کلیات اردو، ص۴۳۸)

حاصل اس کا شکوہ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی! (کلیات اردو، ص۵۵۱)

چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو
کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود! (کلیات اردو ،ص۵۶۷)

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم وخوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود! (کلیات اردو ،ص۵۸۷)

ooo

پطرس

اصل نام سائمن تھا۔ حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں سینٹ پال کے ماسوا سب سے زیادہ ممتاز حواری تھا۔ اس نے ابتدائی کلیسیا کی قیادت اور تبلیغ کی اور جسے روایتی طور پر روم کا پہلا بشپ مانا جاتا ہے۔ حضرت پولوس کے خطوط، چار اناجیل اور رسولوں کے اعمال پیٹر کے متعلق معلومات کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ان تحریروں میں پیٹر کے متعلق متعدد مستند روایات ملتی ہیں۔ پیٹر کو کلیسیا کے سنگ بنیاد کے طور پر دیکھا گیا کیونکہ یسوع نے اسے یہی حیثیت دی تھی تین مرتبہ مسیح کے دشمنوں سے خائف ہو کر حضرت مسیح سے لاتعلقی کا اعلان کیا کفارہ کے طور پر در بدر پھر کر مسیحیت کی تبلیغ کی۔ پال عیسائیت قبول کرنے کے تین برس بعد یروشلم میں پیٹر سے ملا اور انطاکیہ میں دونوں کا شدید اختلاف رائے ہوا۔ پیٹر اپنی بیوی کے ہمراہ تبلیغی مشن پر نکلا اور بالآخر روم میں شہید کی موت پائی مغرب میں حواری پیٹر کا یوم ضیافت ۲۲ فروری کو منعقد ہوتا ہے۔

کلیسا سبحہ پطرس شمارد
کہ اوبا حاکمی کارے ندارد

(کلیاتِ فارسی، ص ۵۴۷)

ooo

پورس

قبل از مسیح پورس دریائے جہلم کے علاقے کا راجہ تھا۔ سکندر اعظم نے جب برصغیر پر حملہ کیا تو ٹیکسلا کے راجہ امبھی نے اس کی اطاعت قبول کر لی لیکن راجہ پورس مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ آخر سکندر سے شکست کھائی۔ پورس گرفتار ہو کر سکندر کے سامنے لایا گیا تو اس نے پوچھا تم سے کیسا سلوک کیا جائے۔؟ پورس نے جواب دیا جو ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ سے کرنا چاہیے۔ سکندر نے اس کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا۔

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

(کلیاتِ اردو، ص ۴۴۱)

ooo

تیمور

۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا۔ ترکوں کے قبیلہ برلاس سے تھا۔ اگر چہ لنگڑا تھا لیکن بڑا بہادر اور فنون حرب کا ماہر تھا ابتدائی عمر میں اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۳۸۲ء میں اس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور تیمور اعظم کہلایا۔ اس نے روس، ایران اور ہندوستان کو روند ڈالا۔ ترکی کا بادشاہ بایزید یلدرم سے جو مغرب میں بڑھتا چلا جا رہا تھا، ایک غلط فہمی کی بنا پر لڑائی ہوگئی۔ جس میں ترکی فوج کو شکست ہوئی اور بایزید یلدر گرفتار کر لیا گیا۔ ستر سال کی عمر میں اس نے چین کو فتح کرنے کی ٹھانی۔ مگر موت نے مہلت نہ دی۔ تیمور جب مرا تو اس کی سلطنت دریائے والگا سے خلیج فارس تک اور گنگا سے دمشق تک پھیلی ہوئی تھی۔

فارسی

چنگیزی و تیموری ، مشتے ز غبار من
ہنگامۂ افرنگی ، یک جستہ شرار من (کلیات فارسی، ص ۲۶۰)

چنگ تیموری شکست آہنگ تیمواری بجاست
سر بروں می آرد از سازِ سمر قندے دگر (کلیات فارسی، ص ۳۱۶)

در فشِ ملت عثمانیاں دوبارہ بلند
چہ گوئمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است (کلیات فارسی، ص ۸۶۰)

اُردو

رہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے (کلیاتِ اردو: ص ۲۱۷)

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے (کلیاتِ اردو: ص ۲۱۸)

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے (کلیاتِ اردو: ص ۲۱۹)

مگر یہ راز آ کر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے (کلیاتِ اردو: ص ۲۱۹)

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز! (کلیاتِ اردو: ص ۳۱۸)

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی، بے سلطنتِ پرویز! (کلیاتِ اردو: ص ۳۱۸)

نہ فقر کے لیے موزوں، نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری (کلیاتِ اردو: ص ۳۳۴)

کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مۓ ناب آخر! (کلیاتِ اردو: ص ۳۴۴)

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری! (کلیاتِ اردو: ص ۳۵۲)

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز (کلیاتِ اردو: ص ۴۴۲)

یکایک ہل گئی خاکِ سمرقند
اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور! (کلیاتِ اردو: ص ۴۴۷)

شفق آمیز تھی اس کی سفیدی
صدا آئی کہ میں ہوں روحِ تیمور (کلیاتِ اردو: ص ۴۴۷)

ooo

چنگیز خان

ظلم و جور، جبر و تشدد اور انسانی ہولنا کی کا ایک بڑا استعارہ چنگیز خان ہے۔ جہاں بھی وحشت و بربریت اور انسانی تشدد کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں ہلاکو خان اور چنگیز خان کے مظالم کی مثال دی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چنگیز خان بہادری اور دلیری کی بہت بڑی مثال ہے۔ چنگیز خان نے فتوحات کا ایک باب رقم کیا۔ حصولِ منزل کے لیے اس نے راستے کی ہر دیوار گرا دی۔ لہو سے گزر کر اس نے سرسبز و شاداب خطے حاصل کیے۔ اگر ہم تاریخ کے جھروکوں سے چنگیز خان کی چنگیزی اور حالات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ چنگیز خان ایک عظیم فاتح اور منگول قوم کا بانی جس نے معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کیا۔ اس کا شمار عظیم فوجی سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ چنگیز خان کا اصل نام تموجن تھا۔ چنگیز خان نے بربری طرز عمل کی بجائے شاندار تنظیم سازی اور حکمت عملی کے ذریعہ فتوحات حاصل کیں۔ چنگیز خان دریائے اونون کے کنارے ۱۱۶۷ء میں وسطی منگولیا کے ایک بااثر گھرانے میں پیدا ہوا۔ روایت کے مطابق چنگیز خان کا نام ایک تاتار دشمن (جس کا اس کا باپ مداح تھا) کے احترام میں تموجن رکھا گھا۔ تموجن کی عمر نو برس ہوئی تو ایک مخالف گروہ نے اس کے باپ کو قتل کر دیا اور اسے وطن بدر کر دیا۔ وہ سخت موسمی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جوان ہوا اسے قیدی بھی بنایا گیا آزاد ہو کر وہ ایک طاقت ور اور غضب ناک جنگ جو کے طور پر واپس اپنے قبیلے میں آیا اور ایک طاقت ور پڑوسی کی بیٹی سے شادی کرنے کے ذریعہ متعدد قبیلوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا آغاز کر دیا۔ جب مخالف مرکیت قبیلے نے تموجن کے کیمپ پر حملہ کیا تو کافی بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور وہ اس کی بیوی کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ تموجن نے فوج جمع کی اور ایک سال بعد دوبارہ ان پر حملہ آور ہوا

اور انہیں عبرت ناک شکست دے کر اپنی بیوی کو بازیاب کرانے میں کامیاب ہوا۔ ۲۵ سال کی عمر میں تموجن تمام منگول قبائل کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوا اور ایک منظم فیڈریشن بنانے میں کامراں ہوا۔ یوں اسے چنگیز خان کا لقب ملا۔ چنگیز خان کا مطلب ''عالمگیر آقا''، ''راست باز آقا'' اور ''انمول آقا'' بھی بتایا جاتا ہے۔ وہ دیگر قبائل کو بھی اپنی فوج کا حصہ بناتا جس کی تعداد ۲،۵۰،۰۰۰ تک جا پہنچی وہ جب کسی علاقہ پر حملہ آور ہوتا تو گھوڑ سوار نیزہ بردار آگے اور تیر انداز پیچھے ہوتے۔ گھوڑ سواروں کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر کے دشمن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ فوج کی یہ حکمتِ عملی زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہوتی رہی خاص طور پر جب شمالی چین میں اس کا سامنا فصیل بند شہروں سے ہوا تو اس نے کئی منجنیقیں اور محاصرے کی مشینیں بھی شامل کر لیں۔ چنگیز خان کی دہشت اور خوف سے کئی ممالک لرزہ براندم رہتے۔ اس کی فوج شاذ و نادر ہی قیدی رکھتی عموماً شہروں پر قبضے کے بعد سپاہیوں کے ساتھ ساتھ شہریوں کو بھی تہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔ منگول دہشت کا اس قدر چرچا ہوا کہ بڑے بڑے دشمن خان کے ''بربری جتھوں'' کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ کھڑے ہوتے۔ ۱۲۰۶ میں اس نے چین پر حملہ کیا اور دو سال کے اندر اندر ''دیوار عظیم'' مسمار کر ڈالی۔ منظم حملوں کے ذریعے خان نے ۱۲۱۵ء تک سارے چین کو شکست دے دی اور ۱۲۱۸ء میں جزیرہ نما کوریا کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ اس کے بعد چنگیز خان نے اپنی فوج کو مغرب میں ترکوں کے خلاف موڑا اور جلد ہی موجودہ عراق، ایران اور مغربی ترکستان پر مشتمل خطے کو قبضے میں لے لیا۔ تب خان نے شمالی ہندوستان کے علاقہ پر حملہ کیا اور فتح پائی۔ جنوب اور مغرب کے بیشتر علاقے قبضہ میں آ جانے کے بعد ۱۲۲۲ء میں چنگیز خان نے روس پر حملہ کیا اور خلیج فارس سے آرکٹک سمندر تک کے خطے پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اگرچہ چنگیز خان ظلم و جور کا استعارہ بن چکا تھا تاہم شکست خوردہ ملک کے زندہ بچ جانے والے لوگوں کو نظر انداز نہ کیا اس نے عموماً مقامی حکام کو ذمہ داری سونپ کر پائیدار حکومتیں قائم کیں اور سب کے لیے وافر مقدار میں خوراک کا بندوبست کیا اور ان کے تحفظ کا بھی بندوبست کیا۔ اس نے تمام مذاہب کو آزادی دی وہ جنگ میں جس قدر ظالم تھا امن میں اس قدر خیال رکھنے والا تھا۔ چنگیز خان نے مغرب میں پولینڈ سے مشرق میں کوریا اور جنوب میں ویتنام سے شمال میں روسی آرکٹک سمندر تک تھی کاہلی اور سستی اور بڑھتی ہوئی عمر کے پیشِ نظر وہ اپنی طاقت کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکا۔ چین میں ایک شورش کو دبانے کی مہم کے دوران واپس منگولیا

جانے کی کوشش کی مگر سفر میں ۱۲۲۷ء میں وفات پا گیا۔اس کی وفات کے بعد خان کی سلطنت ۱۵۰ برس قائم رہی۔اس کے بیٹوں اور پوتوں نے قابل قدر قیادت کی۔منگولیا میں آج بھی چنگیز خان ایک قومی ہیرو کے طور پر مشہور ہے اس کے ۸۰۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر ساری قوم نے شاندار جشن منایا۔ایشیاء کے اندر اور باہر اس کا نام عالمگیر غلبے اور عسکری طاقت کا مترادف ہے۔اس کی وفات تک اس کی حکومت ایک طرف والگا سے بحرالکاہل تک اور دوسری طرف سائبیریا سے خلیج فارس تک پھیل چکی تھی۔

چنگیزی و تیموری ، مشتے ز غبارِ من
ہنگامۂ افرنگی ، یک جستہ شرارِ من (کلیات فارسی،ص۲۶۰)

دو صد بغداد را چنگیزی او
چو گور تیرہ بختاں کرد و بگذشت ! (کلیات فارسی،ص۹۹۰)

از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوے ہنگامۂ چنگیزے (کلیات فارسی،ص۳۳۱)

برونِ او ہمہ بزم و درون او ہمہ رزم
زبان او ز مسیح و دلش ز چنگیز است (کلیات فارسی،ص۳۶۸)

آنکس کہ بسر دارد سوداے جہانگیری
تسکین جنونش کن با نشتر چنگیزی (کلیات فارسی،ص۴۰۰)

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمارِ حرم ! باز بہ تعمیر جہاں خیز (کلیات فارسی،ص۴۷۵)

گذشت از پیشِ آں دانائے تبریز
قیامت ہا کہ رست از کشت چنگیز (کلیات فارسی،ص۵۳۸)

حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد
باتو غیر از فکرِ چنگیزی نداد (کلیات فارسی، ص ۶۴۱)

دو صد بغداد در چنگیزیٔ او
چوگور تیرہ بختاں کردو بگذشت (کلیات فارسی، ص ۹۹۰)

اُردو

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز! (کلیات اردو، ص ۳۱۸)

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی! (کلیات اردو، ص ۳۳۲)

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک! (کلیات اردو، ص ۴۹۱)

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز! (کلیات اردو، ص ۵۱۶)

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام!
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر! (کلیات اردو، ص ۶۵۰)

ooo

خاقان

چینی بادشاہوں کو خاقان کہا جاتا تھا۔ان سے لے کر ترکوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا۔یہ ترکی لفظ قاغان کا مقرب ہے۔خاقانی ایک شاعری بھی ہوا ہے۔اقبال نے اسے بادشاہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

صدرہ بفلک برشد ، صدرہ بہ زمیں درشد
خاقانی و فغفوری ، جمشیدی و دارائی

(کلیات فارسی، ص ۳۳۸)

وہ صاحبِ تحفۃ العراقین ارباب نظر کا قرۃ العین
ہے پردہ شگاف اس کا ادراک پردے ہیں تمام چاک در چاک!
خاموش ہے عالمِ معانی کہتا نہیں حرفِ لن ترانی
پوچھا اس سے یہ خاکداں ہے کیا چیز ہنگامۂ ایں و آں ہے کیا چیز
وہ محرمِ عالم مکافات اک بات میں کہہ گیا ہے سو بات

خود بوئے چنیں جہاں تواں برد
کابلیس بماند و بو البشر مرد!

(کلیات اردو، ص ۵۸۲)

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

(کلیات اردو، ص ۶۵۵)

دارا

ایران کا مشہور بادشاہ ۵۲۱ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۸۵ ق م فوت ہوا۔ دارا سوم (۳۳۰ ق م تا ۳۳۶) پر سکندرِ اعظم نے حملہ کر دیا اور شکست کھا کر شمال کی طرف بھاگ گیا۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کلیات فارسی کے ۲۵۔ ۹۸۔ ۱۲۸۔ ۳۳۸۔ ۴۷۲۔ ۴۷۵۔ ۵۲۲۔ ۷۸۴ صفحات پر دارا کا تذکرہ کیا ہے۔

در خصوماتِ جہاں گرد د حکم
تابعِ فرمانِ او دارا و جم (کلیات فارسی، ص ۲۵)

تخم الحادے کہ ابر پرو رید
باز اندر فطرت دارا دمید (کلیات فارسی، ص ۹۸)

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری نہ من — جگر گرمیٔ صحرا نہ تو داری و نہ من
دل .و دیں در گر وزھرہ و شان عجمی — آتشِ شوقِ سلیمی نہ تو داری و نہ من
(کلیات فارسی، ص ۳۳۸)

تختِ جم و دارا سرِ راہے نفروشند
ایں کوہ گراں است بکاہے نفروشند (کلیات فارسی، ص ۴۷۲)

دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی (کلیات فارسی، ص ۴۷۵)

چوں پر کاہ کہ در رھگذر باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قبا دو خسرو (کلیاتِ فارسی، ص۵۲۲۔۷۸۴)

اُردو

عاشقِ عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں (کلیاتِ اردو، ص۶۵)

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعوٰی کیا جو پورس و دارا نے خام تھا (کلیاتِ اردو، ص۲۴۱)

پہلے خود دارا تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر (کلیاتِ اردو، ص۲۷۹)

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرا گدا دارا و جم! (کلیاتِ اردو، ص۳۲۵)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہیٰ (کلیاتِ اردو، ص۳۴۹)

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (کلیاتِ اردو، ص۶۵۷)

ooo

رستم

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شاعری میں خودی کے بعد حرکت و عمل ایک اہم موضوع ہے۔ جہاں انھوں نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو سراہا ہے وہاں جرأت مند افراد کا ذکر بھی کیا ہے۔ شہیدوں، غازیوں اور بہادروں کی صف میں صحت مندانہ سرگرمیوں میں شامل مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کا تذکرہ اقبال کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ اقبال شعر و سخن کے ساتھ ساتھ اکھاڑے کا رخ بھی کیا کرتے تھے۔ پہلوانی کا شوق بھی ان کی شخصیت کی بہادری کا استعارہ ہے۔ اقبال نے اپنے ذوقِ پہلوانی کے تناظر میں عالمی شہرت یافتہ پہلوان رُستم کا ذکر بھی کیا ہے۔

فردوسی کے شاہنامہ کا ایک معروف کردار۔ شاہنامہ میں اس کی قوت و طاقت کے عجیب و غریب افسانے تحریر کیے گئے ہیں۔ رستم کا ایک بیٹا سہراب تھا بڑا شاہ زور اور طاقتور، مگر رستم ہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ رستم واقعی کوئی حقیقی پہلوان تھا تاہم اس نام کے اور کئی پہلوان ایران میں ہوئے ہیں۔ حاکم سیستان سام کا پوتا اور زال کا بیٹا تھا۔ ماں کا نام رودابہ تھا جو کابل کے بادشاہ مہراب کی بیٹی تھی۔ اس کی طاقت اور شجاعت کے کارنامے ایران اور توران کی لڑائیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے تورانی بادشاہ افراسیاب کو بار بار شکست دی اور کیانی خاندان کے بانی کیقباد کو ایران کے تخت پر بٹھایا، پھر جب دیو سپید کے کیکاؤس کو شکست دی تو رستم اس کی مدد کو پہنچا۔ راہ میں اس نے سات مہمیں سر کیں، جو ''ہفت خوانِ رستم'' کے نام سے مشہور ہیں اپنے مشہور گھوڑے رخش پر سوار ہو کر اس کے ارژنگ دیو اور دیو سپید کو قتل اور کیکاؤس کو فتح یاب کیا۔

افراسیاب سے جنگ میں اس کا بہادر بیٹا سہراب اسی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ آخر عمر میں

گشتاسپ کے بیٹے اسفندیار کو مقابلے میں شکست دی اور جان سے مارا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک گڑھے میں گر کر ہلاک ہوا جو اس کے بھائی نے اس کے لیے کھدوایا تھا۔ رستم کے کارناموں کی داستان فردوسی کے شاہنامے میں تفصیل سے درج ہے۔ علامہ محمد اقبال نے بھی رستم کی بہادرو شجاعت کو زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

با وطن پیوست و از خود در گذشت
دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت

(کلیات فارسی، ص ۷۶۲)

ooo

رضا شاہ پہلوی

رضا شاہ پہلوی، ایرانی تاریخ میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے ایران کو مغربی اندازِ تہذیب سے چلانے کی کوشش کی۔ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا اصل نام رضا خاں تھا۔ ان کے والد فوج میں بحیثیت سپاہی خدمات انجام دیتے رہے۔ رضا شاہ پہلوی معمولی تعلیم کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے اور جلد ہی اعلیٰ عہدے پر پہنچ گئے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۲۳ء میں وزیر اعظم کا عہدہ خود سنبھال لیا۔ انھوں نے ہی فارس کو ایران کا نام دیا۔ ۱۹۲۵ء میں خاندان قاچار کے آخری بادشاہ احمد شاہ کو معزول کر کے خود بادشاہ بن گئے اور رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کیا۔ فوج اور ملکی نظم و نسق میں اصطلاحات کیں، بیروانی ممالک کی مراعات منسوخ کر دیں اور ایران کو خارجی اثر و رسوخ سے پاک کر دیا۔ ان کے عہد میں ٹرانس ایرانیں ریلوے کا اجرا ہوا اور تہران یونیورسٹی قائم ہوئی۔

بیرونی ممالک بہت جلد ایرانیوں میں مقبول ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں رضا شاہ روس اور برطانیہ کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔ روس اور برطانیہ نے ایران پر فوج کشی کر کے رضا شاہ کو گرفتار کر لیا اور بعد میں جلا وطن کر دیا اور وہ جنوبی افریقہ چلے گئے اور وہیں انھوں نے ۶ / جولائی ۱۹۴۴ کو وفات پائی۔

آنچہ بر تقدیر مشرق قادر است
عزم و حزم پہلوی و نادر است
(کلیات فارسی، ص ۷۶۸)

ooo

زلیخا

شاعری اور جمالیات کا گہرا تعلق ہے۔ شاعر کی آنکھ حُسن مقیّد کرنے میں کمال رکھتی ہے۔ آڑے ترچھے نقوش شاعر کے ذہن پر متصور ہو جاتے ہیں۔ دیگر شعرا کرام کی طرح علامہ اقبال کے ہاں حُسن کا تذکرہ موجود ہے۔ تلاشِ حُسن کے لیے اقبال کے قلم نے محبوب کے خدوخال تراشنے کے بجائے فطری حُسن کو ترجیح دی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

حُسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

حُسنِ یوسفؑ کا ذکر آتے ہی زلیخا کا تصور صفحہ قرطاس پر بکھرنے لگتا ہے۔ بقول شاعر:

ایک یوسف کا خسارہ ہے بہت اہلِ خرد
اب نہ منسوب کرو حسن کو بازار کے ساتھ

علامہ اقبال بھی یوسف اور زلیخا کا تذکرہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔

عزیزِ مصر فوطیفار نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دس مثقال سونے اور بہت سے دیبا وحریر اور دوسرے قیمتی کپڑوں کے عوض ایک تاجر سے خرید لیا۔ عزیزِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا جب جوان ہوئے تو عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا جمال اور رعنائی کے پیکر مجسّم حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر دیوانہ وار فدا ہونے لگی اور انھیں فحش و ناپاکی میں مبتلا ہونے پر ابھارتی رہی۔ ہر کوشش میں ناکامی کے بعد اس عورت نے ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے غلط فعل کے لیے اصرار کرنے لگی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی کرنا اور عزیز مصر کی امانت میں خیانت کرنا ناممکن ہے مگر عزیز مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ زبردستی کرنے لگی تو حضرت یوسف علیہ السلام باہر کی طرف بھاگے۔ دروازہ کسی طرح کھل گیا اور عزیز مصر سامنے کھڑے تھے انھوں نے سارا ماجرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کی بیوی نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر سنائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والے تھے۔ عزیز مصر نے جب قاضی سے اس کا فیصلہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو زلیخا جھوٹی ہے اور اگر کُرتا آگے سے پھٹا ہے تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام جھوٹے ہوں گے۔ جب دیکھا گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ زلیخا جھوٹی نکلی۔ عزیز مصر نے رسوائی سے بچنے کے لیے اس قصہ کو یہیں دفن کر دیا لیکن یہ بات کسی نہ کسی پر لوگوں میں پھیل گئی۔

قرآن مجید کی سورہ یوسف میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب زنانِ مصر نے زلیخا کو طعنہ دیا کہ وہ ایک غلام کے عشق میں مبتلا ہوگئی ہے جو اس کے شایان شان نہیں تھا تو اس نے زنان مصر کو بلا کر ان کے ہاتھ میں پھل اور چھریاں دے دیں۔ عین اس وقت جب وہ پھل کاٹ رہی تھیں۔ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر آ گئیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن کو دیکھ کر عورتیں مبہوت رہ گئیں اور انھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ زلیخا ایک بار پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف مائل ہوئی انھیں بدکاری کے لیے اکسایا اور کہا اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ عزیزِ مصر نے تمام نشانیوں کے باوجود اپنی بیوی کو بچانے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈال دیا۔

ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او
زلیخایش دلِ نالاں ندارد (کلیات فارسی، ص۳۰۱)

دگر از یوسفِ گم گشتہ سخن نتواں گفت
تپشِ خونِ زلیخا نہ تو داری و نہ من (کلیات فارسی، ص۳۳۹)

یوسفی راز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسون زلیخائی رفت (کلیات فارسی، ص۳۶۱)

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تراز خونِ زلیخا کر دیں (کلیات اردو، ص۱۳۲)

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا (کلیات اردو، ص۱۸۰)

ooo

سکندر

سکندراعظم: ۳۵۶ قبل مسیح مقدونیہ میں پیدا ہوااوراپنے باپ فیلقوس کی وفات کے بعد نوجوانی میں ہی مقدونیہ کا بادشاہ بن گیا۔اس کے بعد اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مصر پر قبضہ کر کے بحیرۂ روم کے کنارے پر سکندریہ کا شہر آباد کیا۔اس کے بعد شام اور بابل فتح کر کے وہ ایران کی طرف بڑھااورایران کے شہنشاہ دارا کو شکست دے کرایران کے دارالحکومت کو جلا دیا۔اس کے بعد اس نے مشرقی ایشیاء کے بہت سے حصے پر قبضہ کرلیااور پھر ہندوستان میں داخل ہوا مگراس کی فوجوں نے دریائے بیاس سے آگے جانے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ پنجاب سے واپس لوٹ گیااور عراق میں ۳۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔سکندر نے مشرقی روایات کے مطابق کئی شادیاں کیں۔

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
وز سکندر بے نیازم کر دہ اند (کلیات فارسی:ص۸۲)

آنکہ فرمانش جہاں را ناگزیز
بردش اسکندر رو دارا فقیر (کلیاتِ فارسی:ص۱۲۸)

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت
شریکِ سوز و ساز بحر و برشو (کلیات فارسی:ص۲۰۶)

سکندر راز عیش من خبر نیست
نو اے دلکشے از ملک جم بہ (کلیات فارسی:ص۲۲۵)

ترا از نغمہ در آتش نشاندم
سکندر فطرتم ، آئینہ سازم (کلیات فارسی:ص۲۳۶)

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراجِ شہر و گنج کان و یم رفت (کلیات فارسی:ص۲۴۰)

زاری و قیصری گذشت
دورِ سکندری گذشت (کلیات فارسی:ص۲۶۹)

آں سخت کوش چیست کہ گیروز سنگ آب
محتاجِ خضر مثل سکندر نمی شود (کلیات فارسی:ص۳۰۵)

مسنج قدرِ سرود از نواے بے اثرم
زبرق نغمہ تواں حاصل سکندر سوخت (کلیات فارسی:ص۳۲۵)

شہپرش باموے آتش دیدہ بستن می تواں
اے سکندر!سلطنت نازک تراز جام جم است (کلیات فارسی:ص۳۳۰)

بچشم اہل نظر از سکندر افزون است
گداگرے کہ مآل سکندری داند (کلیات فارسی:ص۳۴۵)

نئے اسکندری و نغمہ و ارائی رفت
کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست (کلیات فارسی:ص۳۶۱)

یادِ ایاے کہ بودم درخمستان فرنگ
جامِ او روشن تراز آئینۂ اسکندر راست (کلیات فارسی:ص۳۷۸)

باسکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل ، زندگی مشکل تر است (کلیات فارسی: ص ۳۸۸)

چوں پر کاہ کہ در رہگذر باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو (کلیات فارسی: ص ۵۲۲)

دبدبہ قلندری ، طنطنہ سکندری
آں ہمہ جذبہ کلیم ، ایں ہمہ سحر سامری (کلیات فارسی: ص ۶۱۶)

ضربِ قلندری بیا ، رسدِ سکندری شکن
رسمِ کلیمؑ تازہ کن ، رونقِ ساحری شکن (کلیات فارسی: ص ۶۱۶)

چوں پر کاہ کہ در رہگذر باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو (کلیات فارسی: ص ۷۸۴)

سکندر

عاشقِ عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں (کلیات اردو: ص ۶۵)

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں (کلیات اردو: ص ۶۹)

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا (کلیات اردو: ص ۱۳۰)

جولانگہ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا (کلیات اردو: ص ۲۴۱)

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش! (کلیاتِ اردو: ص ۲۵۷)

پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر (کلیاتِ اردو: ص ۲۷۹)

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے (کلیاتِ اردو: ص ۳۴۰)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی! (کلیاتِ اردو: ص ۳۴۹)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی (کلیاتِ اردو: ص ۴۳۸)

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز! (کلیاتِ اردو: ص ۴۴۲)

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں (کلیاتِ اردو: ص ۴۸۲)

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک (کلیاتِ اردو: ص ۴۹۱)

سکندر! حیف تو اس کی جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی (کلیاتِ اردو: ص ۶۱۷)

کڑکا سکندر بجلی کی مانند
تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ! (کلیات اردو: ص ۶۲۸)

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں (کلیات اردو: ص ۶۸۵)

کنار دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ (کلیات اردو: ص ۶۸۶)

ooo

گوتم بدھ

انسانیت کو درس محبت اور بھائی چارے کا پیغام دینے والوں میں گوتم بدھ کی تعلیمات قابل ستائش ہیں۔

مسلک کوئی بھی اختیار کرے
آدمی آدمی سے پیار کرے

گوتم بدھ نے انسانیت سے پیار کیا انھوں نے جہاں دھرتی سے محبت کا درس دیا وہاں دکھی انسانیت کو سینے سے لگایا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے بھی خدا خودی اور کائنات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا پرچار کیا۔ برعظیم پاک و ہند میں اسلام، عیسائی، ہندو، سکھ مذاہب کے ساتھ بدھ مت کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔ بدھ مت کی بنیاد فراہم کرنے والے شہزادہ سدھارتھ گوتم بدھ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آج بھی اس کے کروڑوں پیرو لنکا، برما، سیام، کمبوڈیا، جاپان اور چین میں موجود ہیں اور وہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں کپل وستو (نیپال) کے راجا شدھودھن کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ یہ بچہ بچپن ہی سے سوچتا رہتا کہ انسانوں میں اونچ نیچ کا فرق کیوں ہے؟ اس دنیا میں اتنے دکھ اور تکلیفیں کیوں ہیں؟ اور سکھ کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے؟ باپ نے اٹھارہ برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی۔ لیکن سدھارتھ برابر بے چین رہا۔ آخر ایک رات بیوی بچے اور شاہی محل کی آسائشوں کو چھوڑ کر نکل گیا اور جنگلوں میں جا کر سخت ریاضتیں کرنے لگا۔ ایک دن شہر ''گیا'' کے قریب ایک بڑ کے درخت تلے بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ اس پر سچائی منکشف ہوئی اور اس

نے تہیہ کرلیا کہ عالمگیر انسانی محبّت کا پیغام دنیا والوں کو پہنچائے گا۔

اب سدھارتھ، گوتم بدھ کہلانے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ پرانا ویدک دھرم ذات پات کے بندھنوں کی وجہ سے ناقابل برداشت ہو چکا ہے تو اس نے اس مذہب کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے کہا شودر اور برہمن میں کوئی فرق نہیں۔ سب انسان ہیں اور ان کے حقوق برابر ہیں۔ مذہب میں کسی ریت، رسم اور قربانی کی ضرورت نہیں۔ دیوی دیوتاؤں کو ماننا جہالت ہے۔ صرف خواہشات پر قابو پانے سے نجات ہو سکتی ہے۔ صحیح علم حاصل کرو نیک نیتی، راست گفتاری راست بازی، جائز ذریعہ معاش اور فکر و مراقبہ کی پاکیزگی اختیار کرو اور ان اصولوں پر عمل کر کے اپنے آپ کو تمام زنجیروں سے آزاد کرلو۔

مہاتما بدھ نے اپنے ان اصولوں کی تعلیم عام کرنے کے لیے نگر نگر کا دورہ کیا۔ برہمنوں کے ستائے ہوئے ہندوؤں نے جوق در جوق اس نئے دھرم کو قبول کرنا شروع کیا اور بدھ کے راسخ العقیدہ ''بھکشوؤں'' نے اس دھرم کی تبلیغ میں محنت اور جفاکشی سے کام لیا۔ یہ لوگ بھوکے پیاسے رہ کر بھی دھرم کا پرچار کرتے رہتے۔

مہاتما بدھ کی تبلیغ سے، دیکھتے ہی دیکھتے ہندو دھرم کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ اشوک اس برعظیم کا پہلا مہاراجا تھا جس نے بودھ مت قبول کر کے اسے ملک کے طول و عرض میں پھیلایا۔ غالباً ۴۸۳ قبل مسیح میں مہاتما بدھ کا انتقال ہوگیا۔

طاسین گوتم

توبہ آوردن زن رقاصۂ عشوہ فروش

گوتم

مئے دیرینہ و معشوق جواں چیزے نیست
پیش صاحب نظراں حور جناں چیزے نیست
ہرچہ از محکم و پایندہ شناسی ، گذرو
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

دانش مغر بیاں ، فلسفہ مشرقیاں
ہمہ بتخانہ و در طو تباں چیزے نیست
از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگدز
کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست
در طریقے کہ بنوک مژہ کا ویدم مَن
منزل و قافلہ و ریگ رواں چیزے نیست
بگذراز غیب کہ ایں وہم وگماں چیزے نیست
در جہاں بودن ورستن ز جہاں، چیزے ہست
آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تاجزائے عمل تست جناں ، چیزے ہست
راحتِ جاں طلبی؟ راحتِ جاں چیزے نیست
در غم ہم نفساں اشک رواں ، چیزے ہست
چشم مخمور و نگاہ غلط انداز و سرود
ہمہ خوب است ولے خوشتر ازاں چیزے ہست
حسنِ رخسار دے ہست و دے دیگر نیست
حسنِ کردار و خیالات خوشاں چیزے ہست

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
از تو درون سینہ ام برق تجلّی کہ من
بامہ و مہر دا دہ ام تلخی انتظار را
ذوقِ حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد
عشق فریب می دھد جانِ امید وار را
تابفراغ خاطرے نغمہ تازۂ زنم

باز بہ مرغزار دہ طائر مرغزار را
طبع بلند دادہ ٔ بند زپاے من کشاے
تابد پلاس تو دہم خلعت شہر یار را
تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگوست
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

(کلیات فارسی،۶۳۶۔۶۳۷)

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

(کلیات اردو ،ص۲۳۹)

نموہ برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

(کلیات اردو ،ص۲۳۹)

OOO

سلمیٰ/سلیمیٰ

سلمیٰ (سلیمیٰ): عرب میں محبوبہ کو سلمیٰ اور سلیمیٰ کہا جاتا ہے۔ عربوں میں سلمیٰ کا ذکر ایسے ہی آتا ہے جیسے شیریں، اور لیلیٰ اور پنجابی میں ہیر، سوہنی اور سسی کا۔

لغوی اعتبار سے غزل، نسیب اور تشبیب میں بہت ہی باریک سا فرق ہے۔ ان سب الفاظ کے معنی ہیں۔ حديث الفتيان والفتيات واللهو مع النساء ومغاز لتهن، یعنی جوان مردوں کا جوان عورتوں سے بات کرنا اور عورتوں سے کھیل کود ہنسی مذاق وغیرہ لیکن کچھ علمائے لغت نے نسیب اور تشبیب میں ایک لطیف فرق بیان کیا ہے۔

''نسیب وہ غزل ہے جس کے مضامین پاک صاف ہوں اور شاعر اپنی محبوب کا نام لیے بغیر اس سے اظہار عشق کرے اس کے مقابلے میں ''تشبیب بمعنی عورت (بیوی/محبوبہ) کا نام لے کر یا اس کے تذکرے سے ابتداء کلام کرنا ہے۔''

جہاں تک جاہلی دور کی شاعری کا تعلق ہے۔ اکثر شعرا عورت سے ہی اظہار تشبیب کرتے تھے اس کے بعد گریز کر کے اصل مطلب پر آتے تھے۔ عام طور پر یہ شعری محبوبہ شاعر کی اپنی بیوی ہوتی تھی کسی غیر عورت سے اظہار تشبیب جاہلی معاشرے میں معیوب بات سمجھی جاتی تھی سب سے پہلے اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا نام لے کر اظہار عشق کی ابتداء امراؤالقیس نے کی۔ بعد ازاں اس کی تقلید میں یہ سلسلہ جاری وساری رہا اور روایت کا درجہ حاصل کر گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ کعبؓ بن زہیر جب آپ ﷺ کی مدح میں آپ ﷺ کے سامنے قصیدہ کہتے ہیں تو وہ بھی ''بانت سعاد'' سے شروع ہوتا ہے یعنی شاعر اپنی محبوبہ سعاد کا نام لے کر عرض احوال کرتا ہے اور قصیدے کا ایک تہائی

حصہ شاعر کعبؓ کی محبوبہ سعاد کے بارے میں ہے اور ایک تہائی حصہ حضور اکرم ﷺ کی مدح میں ہے۔ ہر دور کے شعراء نے اپنی محبوباؤں کا ذکر شاعری میں کیا ہے خاص طور پر دیکھا جائے تو

کالی داس کی	شکنتلا
امراؤالقیس کی	عنیزہ، ام الحویرث، ام رباب
طرفہ بن العبد کی	خولہ، مالکیتہ
زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی	ام اوفیٰ
نابغہ ذبیانی کی	امیمہ

مخضرمین میں......

کعبؓ بن زہیر کی	سعاد
حسانؓ بن ثابت کی	زینت

اور متاخرین میں......

عدی بن رفاع کی	سعدیٰ
اختر شیرانی کی	سلمٰی
مصطفیٰ زیدی کی	شہناز
فرخ یار کی	صائمہ

اس کے بعد بھی کئی شعراء نے اپنی اپنی محبوباؤں کے تذکرے کر کے اس روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

زمانہ قدیم میں تشبیب اس غزل کو کہتے تھے جس میں شاعر اپنی بیوی یا محبوبہ کا نام لے کر اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ مذکورہ بالا شعراء نے بھی اپنی محبوباؤں کا نام لے کر شاعری کی ہے۔ عرب میں اکثر فرضی نام سے بھی محبوباؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں سلمٰی یا پھر سلیمیٰ کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔ زہیر کے تو نام کا حصہ بھی ابی سلمٰی تھا۔

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تادمد صبح حجاز از شام کرد (کلیات فارسی: ص۳۹)

کلام

خبر ز شہر سلیمیٰ بدہ حجازی را
شرارِ شوق فشاں در ضمیر تورانی (کلیاتِ فارسی: ص۳۰۶)

تو رہ شناس نہ، وز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست (کلیاتِ فارسی: ص۳۲۹)

دل و دیں در گروِ زہرہ و شان عجمی
آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من (کلیاتِ فارسی: ص۳۳۸)

ooo

لیلیٰ اور مجنوں

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا نظریۂ عشق ایک تشریح طلب موضوع ہے۔ عشق خودرو پودا ہے۔ جو محبّت کی زمین پر خلوص کے پانی سے پروان چڑھتا ہے۔ اقبال کا عشق لامحدود ہے۔ یہ عشق کبھی نارِ نمرود میں کود پڑتا ہے تو کبھی حصولِ منزل کے لیے صحرانوردی کرتا ہے۔ یہ عشق رواں دواں رہتا ہے اور عقل محو تماشائے لب بام رہ جاتی ہے۔ اقبال چوں کہ عشق کا ذکر بڑے ''عشق'' سے کرتے ہیں اس لیے لیلیٰ اور مجنوں کی داستانِ عشق اقبال کے ہاں تشبیہ واستعارہ کے علاوہ کہیں کہیں تلمیح کی صورت بھی رکھتی ہے۔

لیلیٰ: اسم مونث لغوی معنی شبرنگ، سیاہ فام، سانولی، قیس یعنی مجنوں کی معشوقہ کا نام جو عامر کی بیٹی نجد واقع عرب کے رہنے والے خلفائے بنی امیہ کے عہد میں موجود تھی۔ لیلیٰ عربی میں رات کو بھی کہتے ہیں لیکن مجنوں یا قیس کی محبوبہ کا نام بھی ہے جس کے عشق میں قیس مجنوں ہو گیا تھا تقریباً ہر شاعر نے اپنے کلام میں ان کی محبّت کا ذکر کیا ہے اقبال نے بھی اس کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔

مجنوں: اسم مذکر دیوانہ، باؤلا، پاگل، جنونی، پوراسودائی، قیس عامری، جو لیلائے عامرہ کا عاشق تھا۔ عشق کی دیوانگی کے سبب مجنوں نام پڑ گیا۔ عاشق، شیدا، فریفتہ، نہایت، دبلا پتلا اور کمزور آدمی ایک درخت جس کی شاخ جھکی ہوئی ہوتی ہے اور اسے بید مجنوں بھی کہتے ہیں۔

عشق و محبّت کی لازوال کہانی جس میں قیس جو مجنوں کے نام سے معروف ہوا، لیلیٰ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا اور جنگل جنگل پھرتا رہا۔ لیلیٰ کی شادی کسی بادشاہ سے ہو گئی تھی۔ لیکن لیلیٰ مجنوں کے عشق میں ایسی گرفتار تھی کہ اس نے اپنے خاوند کو نزدیک تک نہ آنے دیا اور کہا کہ میں مجنوں کی امانت ہوں۔

لیلیٰ

شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں راغبارِ خاطر صحرا کند! (کلیات اردو، ص ۷۸)

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیِٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے (کلیات اردو، ص ۸۹)

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں (کلیات اردو، ص ۱۰۳)

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے (کلیات اردو، ص ۱۰۷)

رہتی ہے قیس روزِ کو لیلیٰ شام کی ہوس
اختر صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے (کلیات اردو، ص ۱۲۴)

دیکھ! یثرب میں ہو ناقۂ لیلےٰ کا بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں (کلیات اردو، ص ۱۳۲)

ترا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی (کلیات اردو، ص ۱۵۴)

دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی (کلیات اردو، ص ۱۶۷)

طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ
اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش (کلیات اردو، ص ۱۷۵)

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا (کلیات اردو، ص۱۸۵)

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے (کلیات اردو، ص۱۸۷)

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی!
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو (کلیات اردو، ص۱۹۲)

نغمۂ امیر تیری بربطِ دل میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلا تیرے محمل میں نہیں (کلیات اردو، ص۱۹۵)

وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجاب رخِ لیلا نہ رہے (کلیات اردو، ص۲۰۵)

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلا دے (کلیات اردو، ص۲۱۲)

ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسنِ صحرائی (کلیات اردو، ص۲۴۴)

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلا بھی گئی (کلیات اردو، ص۲۷۷)

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر (کلیات اردو، ص۲۸۰)

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول! (کلیات اردو، ص۵۳۴)

مجنوں

شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں راغبارِ خاطر صحرا کند! (کلیاتِ اردو، ص ۷۸)

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے (کلیاتِ اردو، ص ۱۰۷)

ترا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی (کلیاتِ اردو، ص ۱۵۴)

دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشتِ و جبل میں رم آہو بھی وہی (کلیاتِ اردو، ص ۱۶۷)

طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ
اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش (کلیاتِ اردو، ص ۱۷۵)

عزت ہے محبّت کی قائم اے قیس حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلا بھی گئی (کلیاتِ اردو، ص ۲۷۷)

ooo

میر جعفر

بنگال کے فرمانروا نواب سراج الدین کا ایک غدار عہدیدار جو جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) میں انگریزوں کے ساتھ قبل از جنگ ہی سازش کر چکا تھا۔ سراج الدین کی شکست وشہادت کے بعد بنگال کا فرمانروا بنا دیا گیا۔ بنگال کے صوبے دار علی وردی خاں کا بہنوئی اور نواب سراج الدولہ کی فوج کا سپہ سالار۔ اس نے غداری کرتے ہوئے نواب سراج الدین کی شکست وشہادت سے کا ذمہ دار بنا۔

پلاسی کی لڑائی کے بعد ۱۷۵۷ میں انگریزوں کی وفاداری کے صلے میں اسے بنگال کا نواب بنا دیا۔ مگر اس کی حکومت برائے نام تھی۔ اصل میں ساری طاقت لارڈ کلایو کے ہاتھ میں تھی۔ میر جعفر کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ انگریز کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے۔ اس نے آزاد ہونے کے لیے چنسرا کے ولندیزیوں سے ساز باز کی مگر کلائیو نے انھیں ۱۷۵۹ء میں شکست دی۔ میر جعفر نے نواب بننے کے وقت انگریزوں کو بہت سے نذرانے دیئے تھے اور ابھی بہت سا روپیہ دینا اس کے ذمے تھا مگر خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے وعدہ پورا نہ کر سکا آخر ۱۷۶۱ء میں اسے معزول کر دیا گیا اور اس کے داماد میر قاسم کو نواب بنا دیا گیا۔ ۱۷۶۳ء میں میر جعفر میر قاسم کی معزولی پر دوبارہ نواب بنا، لیکن ۱۷۶۸ء میں انتقال کر گیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ، ننگِ دیں ، ننگِ وطن (کلیات فارسی، ص۷۳۰)

جعفر اندر ہر بدن ملت کُش است
ایں مسلمانے کہن ملت کُش است (کلیات فارسی، ص۷۳۳)

یک شرر بر صادق و جعفر نزد
برسرِ ما مشت خاکستر نزد (کلیات فارسی، ص۷۳۴)

حام

حضرت نوح علیہ السلام کا وہ نافرمان بیٹا ہے جس نے کشتی نوح میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب کہ علامہ طبری کے مطابق وہ حام کے بجائے کنعان تھا۔ طوفان نوح سے بچنے والوں میں ایک لڑکے کا نام حام بھی تھا۔ حام کو مصر، سوڈان، حبش اور تو بیبیہ ایسے علاقے ملے۔ ان کی نسل سیام فام کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نمرود بھی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز سام و حام و روم و شام نیست

(کلیات فارسی، ص ۶۵۶)

ooo

بوعبید

ایرانیوں اور مسلمانوں کی لڑائیوں میں دو مسلمان سرداروں کے نام پیش پیش ہیں ایک ابوعبیدہ الجراح اور دوسرے بوعبید ثقفی۔ بوعبید ثقفی نے ساحل فرات پر شہادت پائی۔ علامہ نے ابوعبیدہ کو ہی بوعبید لکھا ہے۔ جابان کی گرفتاری جنگ قادسیہ میں ہوئی اور اس وقت عربی لشکر کے سردار بوعبیدہ بن الجراح ہی تھے۔ جنگ یرموک میں بڑی بہادری اور شجاعت کا ثبوت دیا اس جنگ کے بعد رومیوں کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

بوعبیداں سید فوج حجاز
درو غا عزمش زلشکر بے نیاز (کلیات فارسی، ص۱۰۶)

عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دل مومن کرانش ناپدید (کلیات فارسی، ص۶۵۵)

نظم: حکایت بوعبید و جابان در معنی اخوت اسلامیہ

شد اسیر مسلمے اندر نبرد — قائدے از قائدان یزد جرد
آشکارا شد کہ جابان است او — میر سر بازان ایران است او
بوعبیداں سید فوج حجاز — درو غا عزمش زلشکر بے نیاز
گرچہ جاباں دشمن مابودہ است — مسلمے او را اماں بخشودہ است

(کلیات فارسی، ص۱۰۵۔۱۰۶)

ooo

بصیری

مصنّف قصیدۂ بُردہ شریف

امام بصیری قصیدہ بُردہ شریف کے تخلیق کار۔ بصیری ۱۲۱۲ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ انھیں فالج کا عارضہ ہوگیا تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انھیں جذام کا مرض لگ ہوگیا تھا۔ ایک رات خواب میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اپنی چادر بصیری پر ڈال دی۔ صبح جب بیدار ہوئے تو انھیں کسی قسم کا کوئی مرض نہ تھا۔ وہ تندرست وصحت مند تھے اس واقعہ کے بعد انھوں نے قصیدہ بُردہ لکھا بُرد عربی میں چادر کو کہتے ہیں۔ نکلسن کہتے ہیں کہ بصیری نے رات کو قصیدہ پڑھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو چادر عنایت کی۔ پیام مشرق میں اقبال نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کے لیے چادر طلب کی ہے۔

اے بصیری را ردا بخشندہ
بربط سلما مرا بخشندہ
(کلیات فارسی، ص ۱۶۷)

چوں بصیری از تومی خواہم کشود
تابمن باز آید آں روزے کہ بود
(کلیات فارسی، ص ۸۴۷)

OOO

خاتونِ عجم (طاہرہ)

قرۃ العین طاہرہ ایران کی ایک حسین و جمیل، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شعلہ بیان مقرر خاتون۔ قزوین میں ایک عالم و فاضل کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کی شادی اس کے چچا کے بیٹے سے ہوئی تین بچے ہوئے مگر جب باب نے اپنے نئے عقیدے کا اعلان کیا تو طاہرہ اس کی پیروکار بن گئی۔ قرۃ العین نے اپنے خاوند اور عزیزوں کی مرضی کے خلاف کربلا اور بغداد جا کر بابی عقیدہ کی تبلیغ شروع کر دی لیکن حکومت بغداد نے اسے اپنے وطن سے نکال دیا۔ واپسی میں ایران آتے ہوئے ہر جگہ بابی عقیدہ کی تبلیغ کی۔ اس کی سحر بیانی سے بے شمار لوگ بابی عقیدہ کے پیروکار بن گئے۔ طاہرہ کے خسر نے اسے روکنے کی کوشش کی جس پر ایک بابی نے اس کے خسر کو قتل کر دیا۔ مقدمہ چلا تو قرۃ العین طاہرہ بھی دربار میں آئی۔ نصیر الدین شاہ قاچار اس کے حُسن و جمال کر دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ شاہ نے اسے کہا کہ اگر تو یہ عقیدہ چھوڑ دے تو تمہیں اپنی ملکہ بنا لوں گا۔ مگر طاہرہ نے نہ صرف شادی سے انکار کر دیا بلکہ کہا کہ میں ہر کڑی سے کڑی سزا برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ قاچار نے اپنے ہاتھوں سے طاہرہ کو قتل کیا۔ اقبال نے اسے ''خاتونِ عجم'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ اس کا اصل نام زریں تاج تھا۔ قرۃ العین کے معنی آنکھوں کی ٹھنڈک کے ہیں۔

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شور ہا افگندہ در جانِ حرم (کلیات فارسی، ص ۷۰۴)

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو (کلیات فارسی، ص ۷۰۷)

○○○

سام

(۱) حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا نام۔

(۲) رستم کے دادا کا نام............

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
اوز سامؔ و حامؔ و رومؔ و شام نیست

(کلیاتِ فارسی: ص ۶۵۶)

ooo

سامری

سامری ایک ایسا شخص ہے جس نے بنی اسرائیل کے ایک بڑے گروہ کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہ اس کا نام نہیں بلکہ اسی نام سے کئی اور بھی سامری ہیں اور یہ کسی نسل یا پھر خاندان کے نام سے مقبول ہے۔ قرآن پاک میں جس سامری کا ذکر آیا ہے وہ بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے والا ہے۔ اسی نے سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ سامری کا قرآن پاک کی دو سورتوں میں ذکر آیا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۳۶ تا ۱۵۳ دوسری مرتبہ سورۃ طٰہٰ کی آیت ۸۷، ۹۰، ۹۶ میں سامری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سامری کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے بس وہاں سونے کے بجائے بچھڑے کو دھات سے بتایا گیا ہے اور وہ منہ سے آوازیں بھی نکالتا تھا۔

بنی اسرائیل نے سامری کے کہنے پر سنہرے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ہارون علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود لوگ نہ سمجھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کی گرفت کی تو وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے حیلے بہانے تراشنے لگا۔ بنی اسرائیل کو کہا گیا کہ اپنے زیورات لاؤ اور اس سے ایک سونے کا بچھڑا تیار کیا گیا جس کی بعد میں پرستش شروع کر دی گئی۔

توریت میں کہا گیا کہ جب موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کر دی تو لوگ ہارون کے پاس گئے اور کہا کہ ہمارے لیے معبود بنا کر ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انھیں زیور سونے کے جو تمہاری بیویوں او رتمہارے بیٹوں اور بیٹیوں نے پہن رکھے ہیں وہ میرے پاس لاؤ جس سے ایک سنہری بچھڑا بنایا جائے گا۔'' مگر قرآن مجید نے اس موقع پر اصل حقائق سے ہمیں آگاہ کیا اور ایک نبی پر لگائے گئے

الزامات کی تردید کردی۔ اور ایک نبی کو سچا ثابت کر دیا۔ بنی اسرائیل پر قرآن مجید کا ایک عظیم احسان ہے۔ لیکن وہ احسان مند ہونے کے بجائے اس کو باطل کرنے کے درپے ہو گئے۔ علامہ محمد اقبال نے اس واقعہ کو اپنے شعروں میں کئی طرح سے بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے وہاں علامہ اقبال نے حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور سامری کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ کلام اقبال میں سامری کا تین مقامات پر ذکر کیا ہے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری
(کلیات اردو، ص ۲۵۲)

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری
(کلیات اردو، ص ۲۶۱)

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
(کلیات اردو، ص ۵۳۳)

OOO

شیریں وفرہاد

ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کی بیوی، ملکہ کا نام ہے۔ شیریں ایران کے ایک عیسائی خاندان کی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ اسے خسرو اپنے حرم میں لے آیا ایک ادنیٰ گھرانے کی لڑکی کا زینت حرم بننا امراء وشرفاء کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ مگر یہی شیریں خسرو کے لیے منظورِ نظر اور راحت قلب و جاں بن چکی تھی۔ خسرو کی پہلی بیوی قیصر روم کی بیٹی مریم تھی اس کی وفات کے بعد شیریں شاہی محل کی وارث بن گئی۔ مریم کی موت کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ اسے شیریں نے زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ خسرو شیریں سے بے پناہ محبّت کرتا تھا۔ شیریں فرہاد کو بھی بہت چاہتی تھی۔ ان کی انمول محبّت کا جب خسرو کو پتہ چلا تو اس نے فرہاد سے کہا کہ وہ پہاڑ کھود کر نہر محل کے نیچے سے گزار دے تو شیریں کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔ فرہاد نے جوش جنوں میں پہاڑ کو کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے پہاڑ کو مکمل طور پر کاٹ کر نہر نکال دی جب نہر مکمل ہوگئی تو خسرو پرویز نے شیریں کی جھوٹی خبر پھیلا دی۔ جب یہ خبر فرہاد کو ملی تو اس نے تیشہ اپنے سر میں مار کر جان دے دی۔

فرہاد ایک معمار تھا اور ایران کے ساسانی بادشاہ خسرو پرویز کا نامراد رقیب بھی تھا۔ شعر وادب کے خزانے فرہاد کی تلمیح سے بھرپور ہیں۔ فرہاد کے حوالے سے کئی استعارے بھی اردو ادب کا حصہ بنے جن میں کوہ کنی، تیشہ، بے ستوں، جوئے شیر، شیریں، پرویز اور پرویزی شامل ہیں۔

فرہاد و شیریں کی انمول محبّت کو اردو اور فارسی شاعری کا حصہ بنایا گیا تو کئی یادگار نظمیں اور مثنویاں سامنے آئیں۔ فارسی اور اردو ادب کے سرمایہ بے پناہ اضافہ ہوا۔ نظامی کی مثنوی ''شیریں حسرو''، امیر خسرو کی مثنوی ''خسرو شیریں'' اس کی یادگاریں ہیں۔ شیریں کی ایک یادگار کھنڈرات کی

صورت میں ہنوز موجود ہیں جو قصرِ شیریں کے نام سے مشہور ہے یہ کھنڈرات طسفون سے ہمدان کو آنے والی سڑک پر واقع ہیں۔ روایت میں ہے کہ خسرو کے انتقال کے بعد اس کے تابوت کے پاس شیریں نے خودکشی کر لی تھی۔ فرہاد کو کوہ کن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال یہی عشق صادق قوم کے جوانوں میں بیدار کرنا چاہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔ انسان میں جذبہ صادق ہو تو بڑے سے بڑا پہاڑ بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ فرہاد کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ اس نے ایک ناممکن کام کو انجام دے کر بتایا ہے کہ عشق صادق ہو تو ہر کام ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے بھی شیریں و فرہاد کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ (کلیات اردو: ص ۲۰۹)

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد! (کلیات اردو: ص ۳۶۲)

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد ! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل (کلیات اردو، ص ۶۱)

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایہ غمِ فرہاد (کلیات اردو، ص ۳۶۲)

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز (کلیات فارسی، ص ۶۱۰)

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد (کلیات اردو، ص ۵۹۳)

گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنت فرہاد (کلیات اردو، ص ۶۸۸)

بگو از من بہ پرویزان ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ درد ست (کلیات فارسی،ص۱۰۱۵)

درعشق وہوس نا کی دانی کہ تفاوت چیست
آں تیشۂ فرہادے ، ایں حیلۂ پرویزے (کلیات فارسی،ص۳۳۱)

بہر زمانہ بہ اسلوب تازہ می گویند
حکایت غم فرہاد و عشرتِ پرویز (کلیات فارسی،ص۳۳۹)

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت (کلیات فارسی،ص۳۶۱)

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو با شد کوہکن ہست (کلیات فارسی،ص۳۸۰)

ooo

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم کا تخلیقی سرمایہ

(دسمبر ۲۰۱۸ء تک)

1۔ گہرے سمندر	2۔دسمبر 1984ء صفحات 168 قیمت 35 روپے
2۔ جہاں نما	1988ء، صفحات 208 ' قیمت 21 روپے
3۔ قرارداد پاکستان کوئز	فروری 1990ء صفحات 240 ' قیمت 35 روپے
4۔ نذرِ پاکستان	10 فروری 1990ء ' صفحات 136 ' قیمت 45 روپے
5۔ قرارداد پاکستان سے قیامِ پاکستان تک	15 فروری 1990ء ' صفحات 304 ' قیمت 45 روپے
6۔ کرچیاں (شعری مجموعہ)	20 فروری 1990ء صفحات 144 ' قیمت 50 روپے
7۔ لالۂ اُردو	1991ء ' صفحات 96 قیمت 30 روپے
8۔ اے وطن کے سجیلے جوانو	7۔اپریل 1991ء صفحات 120 ' قیمت 50 روپے
9۔ چھ ستمبر قوت ایمانی کا آئینہ دار	12 / اپریل 1991ء ' صفحات 112 ' قیمت 50 روپے
10۔ پرکھ	مئی 1991ء ' صفحات 176 ' قیمت 51 روپے
11۔ اقبال جو اقبال ہے	1992ء صفحات 128 ' قیمت 100 روپے
12۔ حیاتِ اقبال کا سفر	1992ء صفحات 208 ' قیمت 60 روپے
13۔ فقیرِ سرگودھا	6 مئی 1993ء صفحات 264 قیمت 200 روپے
14۔ بیت بازی اقبالیات	جنوری 1994ء صفحات 232 قیمت 60 روپے

15۔ نصف صدی کے خواب ادھورے یکم اگست 1997 'صفحات 152 قیمت 125 روپے

16۔ پاکستان گولڈن کوئز یکم اگست 1997ء صفحات 280 قیمت 90 روپے

17۔ کرچیاں (دوسرا ایڈیشن) 15 نومبر 1997ء صفحات 152 قیمت 143 روپے

18۔ علامہ اقبال بحیثیت اُدبی نقاد 10۔جنوری 1998ء صفحات 224 قیمت 180 روپے

19۔ پتھروں کے پیرہن (شعری مجموعہ) جنوری 1998ء صفحات 126 'قیمت 160 روپے

20۔ تصویرِ پاکستان 4 فروری 1998ء صفحات 192 'قیمت 150 روپے

21۔ نوائے انور 11 ستمبر 1999 'صفحات 192 'قیمت 100 روپے

22۔ آنکھوں کے اُس پار (شعری مجموعہ) اکتوبر۔1999ء صفحات 152 'قیمت 125

23۔ اُجالوں کا سفیر جنوری 2001ء صفحات 192 'قیمت 150 روپے

24۔ جمالِ گلِ حرا (نعتیہ شعری مجموعہ) اپریل 2003ء صفحات 152 قیمت 150 روپے

25۔ جنھیں ہم بھول بیٹھے ہیں: اپریل 2003ء صفحات 320 قیمت 250 روپے

26۔ اب اُنھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر 9 جولائی 2003 صفحات 240 قیمت 250 روپے

27۔ نوائے شوق یکم جنوری 2004ء، قیمت 250 روپے

28۔ میرے عہد کے عہد ساز 7 مارچ 2004ء، قیمت 250 روپے

29۔ گل دیدہ ور 6 ستمبر 2005ء، صفحات: 272، قیمت: 250 روپے

30۔ روشنی زندہ ہے 25 ستمبر 2008ء، قیمت 250 روپے

31۔ ''منور چہرے'' 14 اگست 2011ء، صفحات: 300، قیمت 224 روپے

32۔ ''آفتابِ ادب......ڈاکٹر وزیر آغا'' 14 ستمبر 2011ء بروز جمعتہ المبارک، صفحات: 288، 400 روپے

33۔ ''خزینۂ اقبال'' یکم جنوری 2013ء، صفحات 288، قیمت 400 روپے

34۔ ''اقبال کے گوہر شہوار'' 23 مارچ 2013ء صفحات 448، قیمت 600 روپے

35۔ ''ابراہیم جلیس ایک مطالعہ'' 2014ء، صفحات: 510، قیمت: 1300 روپے

36۔ ''طفیل پاکستان'' 22 مارچ 2013ء، صفحات 288، قیمت 490 روپے

37۔ ''اقبال اور سرگودھا'' 21 اپریل 2014ء، صفحات 496، قیمت 1000 روپے

38۔ ''قندیل اقبال'' 21 اپریل 2014 صفحات 480، قیمت 700 روپے

39۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس'' 7 ستمبر 2014ء، صفحات: 285، قیمت۔ 480 روپے

40۔ ''پاکستان سب کے لیے'' 14/ اگست 2014ء، صفحات: 288، قیمت: 480 روپے

41۔ ''خورشید اقبال'' 25 ستمبر 2014ء، صفحات: 1152، قیمت: 2400 روپے

42۔ ''شمع آ گہی'' یکم جنوری 2004ء، صفحات :192 قیمت: 150 روپے

43۔ ''سرگودھا میں وزیر آغا شناسی'' 2/ اکتوبر 2014ء، صفحات: 450، قیمت: 500 روپے

44۔ ''ڈاکٹر ایوب صابر بطور اقبال شناس'' 23 مارچ 2015ء، صفحات: 496، قیمت: 900

45۔ گل ہائے سلام 23 مئی 2015ء، صفحات 240، قیمت 500 روپے

46۔ متاعِ شاعری جولائی 2015ء، صفحات: 464، قیمت 1000 روپے

47۔ جہانِ نثر 26 جون 2015ء، صفحات: 272، قیمت: 500 روپے

48۔ مادر خوشاب 14 اگست 2015ء، صفحات 208، قیمت 450 روپے

49۔ تقاریر اقبال 06 ستمبر 2015ء، صفحات: 256، قیمت: 480 روپے

50۔ ''سیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں دفاعِ پاکستان''

24 دسمبر 2015ء، صفحات 872، قیمت: 2500 روپے

51۔ ''ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا شناسی'' 10 جنوری 2016ء، صفحات: 320 قیمت: 800 روپے

52۔ ''علامہ رشک ترابی شخصیت وفن'' 17 جنوری 2016ء، صفحات: 352 قیمت: 1000 روپے

53۔ ''گل دستۂ تقاریر'' 2 فروری 2016ء، صفحات: 400 قیمت: 600 روپے

54۔ ''ویران آنکھوں کے خواب'' 5 فروری 2016ء، صفحات: 288، قیمت: 600 روپے

55۔ ''ارمغانِ وطن (نظمیں)'' 5 فروری 2016ء، صفحات: 128، قیمت: 380 روپے

56۔ ''کردار سازی تقریریں'' 15 فروری 2016ء صفحات: 288، قیمت: 500 روپے

57 ''خوشی محمد ناظر فن اور شخصیت'' 10/اگست 2016ء، صفحات 288، قیمت: 600روپے

58۔ ''ڈاکٹر زاہد منیر عامر...... مفکر و اقبال شناس''

2/اکتوبر 2016ء، صفحات 800، قیمت: 4500روپے

59۔ ''انوار ادب۔ بیادِ ڈاکٹر انور سدید'' 26/اگست 2016ء، صفحات 512، قیمت: 1200روپے

60۔ ''آؤ بچو! سیر کریں ہم اپنے پاکستان کی'' 14/اگست 2016ء، صفحات 384، قیمت: 800روپے

61 ''ہمارے ایدھی صاحب''

14 اگست 2016ء، صفحات 466 رنگین صفحات 16، قیمت: 600روپے

62۔ ''۱۰۰ عظیم شاعر اور نثر نگار'' 2016ء، صفحات: 501، قیمت: 2500روپے

63 ''دانش صد رنگ'' 6 ستمبر 2016ء، صفحات 588، قیمت: 3500روپے

64۔ ''125 اہل قلم'' یکم جنوری 2017ء، صفحات: 672، قیمت: 1000روپے

65۔ ''تصانیف ابراہیم جلیس کا جائزہ'' 25 ستمبر 2016ء، صفحات: 240، قیمت: 600روپے

66۔ ''کندن چہرے'' 10 جنوری 2017ء، صفحات: 320، قیمت: 1250روپے

67۔ ''ذخیرۂ اقبالؒ'' 23 مارچ 2017ء، صفحات: 375، قیمت: 800روپے

68۔ ''کائنات اقبالؒ'' 23 مارچ 2017ء، صفحات: 240، قیمت: 480روپے

69۔ ''بیت بازی کلام اقبالؒ'' 23 مارچ 2017ء، صفحات: 232، قیمت: 380روپے

70۔ ''موضوعاتی کلام اقبالؒ'' 23 مارچ 2017ء، صفحات: 416، قیمت: 600روپے

71۔ ''دُرِ عقیدت'' 23 مارچ 2017ء، صفحات: 168، ہدیہ: 500روپے

72۔ ''ہلالِ استقلال'' مئی 2017ء، صفحات: 224، قیمت: 700روپے

73۔ ''بہارِ اقبالؒ'' 26 جون 2017ء، صفحات: 336، قیمت: 1000روپے

74۔ ''ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس''

26 جون 2017ء، صفحات: 248 قیمت: 1000روپے

75۔ ''نویدِ اقبالؒ'' 10 اگست 2017ء، صفحات: 400، قیمت: 1000روپے

76۔ ''مضامینِ تبسم'' 10/اگست 2017ء، صفحات: 544، قیمت 1200روپے

77۔ ''زاہدِ پاکستان'' 13/اگست 2017ء، صفحات 416: ، قیمت 1500روپے

78۔ ''جاوداں چہرے'' 14/اگست 2017ء، صفحات: 380، قیمت: 1200روپے

79۔ ''اسلام اور پاکستان'' 14/اگست 2017ء، صفحات 272، قیمت 1200روپے

80۔ ''نوائے اُردو'' 25 ستمبر 2017ء، صفحات 336، قیمت 1050روپے

81۔ ''انوارِ پاکستان'' نومبر 2017ء، صفحات: 208، قیمت: 170روپے

82۔ ''ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت اقبال شناس'' 15فروری 2018ء، صفحات: 208، قیمت: 900روپے

83۔ ''اصنافِ ادب'' 23مارچ 2018ء، صفحات 200، قیمت 380روپے

84۔ ''ادبی اصطلاحات'' 23مارچ 2018ء، صفحات: 160، قیمت 300روپے

85۔ ''ردائے اُردو'' 23مارچ 2018ء، صفحات 256 ، قیمت 480روپے

86۔ ''تفاخرِ پاکستان'' 23مارچ 2018ء، صفحات 288، قیمت 600روپے

87۔ ''چند ہم عصر اقبال شناس'' 14/اپریل 2018ء، صفحات 984، قیمت 1500روپے

88۔ ''فکرِ اقبالؒ میں انسانی مسائل کا حل'' 26جون 2018ء، صفحات 240، قیمت 600روپے

89۔ ''ملّی واخلاقی مضامین'' نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد (انعام الحق جاوید)

جولائی 2018ء، صفحات: 216، قیمت: 190روپے

90۔ ''عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس'' 10/اگست 2018ء، صفحات: 336، قیمت: 1000روپے

91۔ ''اقبالیات بچوں کے لیے'' 24/اگست 2018ء، صفحات: 208، قیمت: 400روپے

92۔ ''گولڈ میڈلسٹ کارکنانِ تحریک پاکستان (سرگودھا)'' ملک مقبول احمد اکیڈمی، لاہور

14/اگست 2018ء، صفحات: 160، قیمت: 300روپے

93۔ ''مدبرِ پاکستان محمد علی جناح'' 11/ستمبر 2018ء، صفحات: 200، قیمت: 400روپے

94۔ ''فلسفۂ اقبالؒ اور نیا پاکستان'' 18/اکتوبر 2018ء، صفحات: 276، قیمت: 700روپے

95۔ ''فکرِ عمیق'' 3نومبر 2018ء، صفحات: 288، قیمت: 600روپے، مقبول اکیڈمی لاہور

96۔ ''کمالِ انسانیت، محمد مصطفیٰ ﷺ'' صفحات: 256، ہدیہ: 700 روپے، مثال پبلشرز، فیصل آباد

97۔ ''سلیمِ ادب'' صفحات: 224، قیمت: 600 روپے، مثال پبلشرز، فیصل آباد

98۔ ''کلامِ اقبال'' میں ممتاز شخصیات'' صفحات: 480، قیمت: 1200 روپے، مثال پبلشرز، فیصل آباد

99۔ ''تفاخرِ ادب'' (تفاخر محمود گوندل) صفحات: 460، قیمت: 800 روپے، ماورا پبلشرز، لاہور

100۔ ''شانِ اقبال'' صفحات: 224، قیمت: 600 روپے، مثال پبلشرز، فیصل آباد

☆-☆-☆



پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ولدیت : محمد ایوب مغل (۱۹۲۹ء۔۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء)

تاریخ پیدائش : ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء

پتہ رہائش : ۳۱۹ وائی علامہ اقبال کالونی سرگودھا

فون ۰۴۸-۳۷۱۱۷۱۷

میل : drharoonsgd@gmail.com

ریٹائرمنٹ : یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء (گریڈ ۲۰)

سابق صدر شعبہ اردو

گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودہا

ایم فل (اقبالیات: ۱۹۹۳ء)

پی ایچ ڈی (اردو: ۲۰۰۲ء)

کتب : ادبی: ۱۰۰

نصابی: ۲۷

ذمہ داریاں : صدر: بزم علم وفن سرگودھا

صدر: نظریہ پاکستان اکادمی سرگودھا

صدر: پاکستان ادب اکادمی سرگودھا

چیئرمین: پاکستان لٹریری کونسل

جنرل سیکرٹری: سرگودھا رائٹرز اکیڈمی

ڈپٹی چیف وارڈن: سول ڈیفنس سرگودھا

کمپیئر: ریڈیو پاکستان سرگودھا

خواب : شہادت

اشاعت : ۲۵ دسمبر ۲۰۱۸ء

Misaal
PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com